[illegible]ADESH MEIN URDU ADAB (1947-1990 AD)

A THESIS
SUBMITTED FOR THE DEGREE OF
DOCTOR OF PHILOSOPHY (PH.D)
IN URDU
FACULTY OF ARTS, UNIVERSITY OF DHAKA

BY
MRS. KANIZ-E- BUTOOL
ASSOCIATE PROFESSOR, DEPARTMENT OF
URDU AND PERSIAN, UNIVERSITY OF DHAKA,
DHAKA-1000, BANGLADESH.

UNDER THE SUPERVISION OF
DR. MD. ABU BAKER SIDDIQUE (PH.D. ALIGARH)
PROFESSOR, DEPARTMENT OF ARABIC,
UNIVERSITY OF DHAKA, BANGLADESH

AUGUST, 2002 AD.

RB
U
891.43954
KAB
DU
Ph.D.

بنگلادیش میں اُردو ادب (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء)

یہ تحقیقاتی مقالہ ڈاکٹر آف فلاسفی (پی ایچ۔ڈی) کی ڈگری کے لئے
ڈھاکا یونیورسٹی میں پیش کیا گیا۔

از

کنیزِ بتول
ایسوسیٹ پروفیسر
شعبۂ اُردو و فارسی، ڈھاکا یونیورسٹی۔ ڈھاکا

زیرِ نگرانی
ڈاکٹر محمد ابوبکر صدیق
ایم۔اے (ڈھاکا) پی ایچ۔ڈی علی گڑھ
پروفیسر شعبۂ عربی
ڈھاکا یونیورسٹی۔ ڈھاکا

400590

ڈھاکا
বিশ্ববিদ্যালয়
গ্রন্থাগার

بنگلادیش
اگست سنہ ۲۰۰۲ء

Prof. Dr. Md. Abu Baker Siddique
M.M., B.A. Hons, M.A. (Dhaka), Ph.D. (Aligarh)
Professor, Department of Arabic
University of Dhaka
Dhaka-1000, Bangladesh.

Ref ..... *Date* .....

TO WHOM IT MAY CONCERN

*This is to certify that Mrs. Kaniz-e-Butool, a Ph.D. Scholar of the Department of Urdu and Persian, University of Dhaka, has completed her Ph.D. Thesis entitled, "**Bangladesh Mein Urdu Adab (1947-1990 AD)**" under my supervision.*

The Thesis is an original work, which is entirely prepared by her. I have gone through the manuscript of the Thesis and recommended it for submission to the University of Dhaka for the award of the Degree of Doctor of Philosophy (Ph.D.) in urdu.

I wish her all success in life.

400590

A.B.Siddique 05.11.2002

(Prof. Dr. Md. Abu Baker Siddique)
Professor & Supervisor
Department of Arabic
University of Dhaka, Bangladesh.

ঢাকা বিশ্ববিদ্যালয় গ্রন্থাগার

Mailing Address : 31/F, ISA Khan Road Residential Area, University of Dhaka, Dhaka-1000, Bangladesh
Phone : 9661920/4293, 9661900-59/4293 (Off); 9661104 (Res); **Fax:** 88028615583, **E-mail:**duregstr@bangla.net, **Web:**//www.univdhaka.edu

Dhaka University Institutional Repository

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر
اعتراف ----------	
مقدمہ ----------	1
باب اوّل : بنگلادیش میں اُردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا کا پس منظر ۱۹۴۷ء تک بنگلادیش کا محل وقوع بنگلادیش میں اردو زبان و ادب کا آغاز	4
باب دوم : بنگلادیش میں اُردو ادب ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء شعراء و ادباء کے حالاتِ زندگی و ادبی کارنامے (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء)	26
باب سوم : بنگلادیش میں اردو ادب ۱۹۷۲ء تا ۱۹۹۰ء شعراء و ادباء کے حالاتِ زندگی و ادبی کارنامے (۱۹۷۲ء تا ۱۹۹۰ء)	205
باب چہارم : بنگلادیش میں اُردو صحافت ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء	334
باب پنجم : بنگلادیش کے اردو ادب پر تبصرہ شاعری نثر	347
منابع و مآخذ کتابیات	376
رسائل / اخبارات	383

Dhaka University Institutional Repository

اعتراف

سب سے پہلے میں بارگاہِ ربُّ العزت میں شکر گزار ہوں کہ جس کے فضل و کرم سے میں ادبی تحقیقات جیسے دشوار کام کرنے کے لائق ہوئی۔ میں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ اور ان کے آل اطہرؑ پر درود و سلام بھیجتی ہوں جو بارگاہ خداوند تعالیٰ تک ہماری رسائی کا اعلیٰ ترین وسیلہ ہیں۔

میرے تحقیقاتی مقالے کا موضوع ہے۔ "بنگلادیش میں اردو ادب" (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء) ظاہر ہے کہ یہ موضوع بنگلادیش کے ادب اردو کی تاریخ اور اس کے تنقیدی تجزیہ پر حاوی ہے۔

ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں لکچرر کی تقرری ملنے کے بعد میری یہ دلی خواہش ہوئی کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند کے لئے ایک ایسا تحقیقی مقالہ ترتیب دوں جو بنگلادیش کے اردو ادب کی خدمات کے تفصیلی جائزے پر مشتمل ہونے کے علاوہ اپنے مخصوص انفرادی رجحانات کا بھی ترجمان ہو۔

میرا کام واقعی بڑا مشکل تھا۔ موضوع سے متعلق باتوں سے آگاہی کے لئے بنگلادیش، پاکستان، ہندوستان اور امریکہ وغیرہ میں جو حضرات بنگلادیش کے دبستان اردو سے منسلک ہیں انہیں خطوط لکھے زیادہ تر لوگوں نے بھرپور تعاون کیا اور میری ہمت افزائی کی۔ بعض حضرات نے سرد مہری دکھائی۔ حتیٰ کہ خط کا جواب تک نہ دیا۔ لیکن میں اس سے دل برداشتہ نہ ہوئی بلکہ اللہ پر بھروسہ کرکے اپنے عزم مصمم پر اٹل رہی۔

اس مقالہ کے مواد کی فراہمی میں برادران خُرد نورِ چشم سیّد تقی محمد، نورِ چشم سیّد اسد عباس اور عزیزم انوار الکبیر خان نے میرا ہاتھ بٹایا اور میری دعاؤں کے مستحق بنے۔

اس سلسلے میں محترمہ خالدہ فہمی کی شکر گزار ہوں جن کی کرم فرمائی سے "فہمی لائبریری" کی نایاب اور قدیم کتابوں اور رسائل کے مطالعہ کا مجھے موقع ملا۔ میں سعید احمد انیس کی ممنون ہوں جنہوں نے میرے مطالعے کے لئے اپنے مرحوم والد منیر الدین یوسف کی لائبریری سے کتابیں فراہم کیں۔ میں ڈھاکا یونیورسٹی کی جنرل لائبریری کے کارکنوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری کتاب بینی کے لئے ہر ممکن مدد دی۔

اس کے علاوہ جنہوں نے مجھے اپنی ذاتی لائبریری سے کتابیں فراہم کیں، مفید مشورے دیئے ان میں جو حضرات بقید حیات

Dhaka University Institutional Repository

ہیں ان کی ممنون ہوں اور جو مرحوم ہو چکے ہیں ان کے لئے دعائے مغفرت چاہتی ہوں

اس مقالے کی تکمیل میں جن حضرات سے پر خلوص تعاون حاصل رہا ان کے نام یہ ہیں۔

جناب شعیب عظیم، جناب عطاء الرحمٰن جمیل، ڈاکٹر عبدالواحد (سکریٹری اقبال اکیڈمی بنگلہ دیش) ڈاکٹر ظفر احمد بھوئیاں، (شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی) نوشاد نوری (مرحوم) جمال مشرقی (مرحوم) پروفیسر نظیر صدیقی (مرحوم) بیگم شائستہ اکرام اللہ (مرحومہ) شہزاد منظر (مرحوم) پروفیسر حنیف فوق (کراچی یونیورسٹی) پروفیسر محمد اسلم اعوان (گجرانوالہ کالج پاکستان) فاطمہ حسن، سلیم احمد (صحافی پاکستان)

اس معاملے میں اساتذۂ گرامی ایمریٹس پروفیسر سراج الحق، پروفیسر محمد عبداللہ، پروفیسر کلثوم ابوالبشر، پروفیسر ام سلمیٰ کے نیک مشورات نے میرے کام کی رفتار کو تیز اور میرے پائے استقلال کو مستحکم کیا۔

ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر ڈاکٹر ابو بکر صدیق کی شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی درسی و دفتری مصروفیات کے باوجود میری رہنمائی کی۔ ان کی نگرانی میں یہ مقالہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔

بڑی ناانصافی ہوگی اگر خوشنویس جناب قاسم انیس کی خدمات کا ذکر نہ کیا جائے۔ جنہوں نے بڑی دلجوئی سے مقالہ کی کتابت کی۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے شریک حیات ڈاکٹر محمد عبدالفتاح خان کے تعاون کا اعتراف نہ کروں جنہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود میرے کام کو سراہا اور ہر طرح میری حوصلہ افزائی کی۔

آخر میں، میں اپنے والد مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی خواہاں ہوں اور والدہ محترمہ سے دعاؤں کی ملتجی ہوں۔ جنہوں نے بچپن سے مجھے راہ راست دکھایا اور میرے تعلیمی ذوق کو بڑھایا۔

کنیز بتول

۵ اگست ۲۰۰۲ء

Dhaka University Institutional Repository

مقدمہ

تاریخ، ادب اور تحقیق کا رشتہ آپس میں بڑا گہرا اور مربوط ہے۔ ایک کے بغیر دوسرے کی بنیاد نہیں ٹھہرتی۔ زمانے کی ہوا و حوادث کے ماتحت تاریخ پہلے جنم لیتی ہے پھر اُسی تاریخ سے رشتہ جوڑ کر ادب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے مورخین و ادبا ہی تاریخ و ادب کو الفاظ کے جامے میں محفوظ کرتے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں جب کوئی مورخ یا ادیب اپنے عہد و ماحول کو دیکھتا، سمجھتا اور اس کی ترجمانی کرتا ہے تو شعوری اور لاشعوری طور پر کچھ حقیقتیں پسِ پردہ رہ جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد تحقیق اسکی بڑی حد تک اصلاح کرتی ہے۔ تاریخ و سیاست، ادب و فلسفہ، مذہبیات و اخلاقیات تحقیق کے سہارے ہی زندہ ہیں۔ اس اصول کے مدِ نظر اگر دیکھا جائے تو بنگلادیش کا اردو ادب تحقیق کا متقاضی ہے۔

ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں لکچرر (جنوری ۱۹۸۷ء) کی تقرری ملنے کے بعد میری یہ دلی خواہش ہوئی کہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے ایک ایسا تحقیقی مقالہ ترتیب دوں جو بنگلادیش کے اردو ادب کی خدمات کے تفصیلی جائزے اور اس کے سمت کی تصدیق پر مشتمل ہو۔ کیونکہ اس ضمن میں اقبال عظیم کی کتاب "مشرقی بنگال میں اردو" (۱۹۵۴ء) اور نوخاز اشدی کی کتاب "بنگال میں اردو" (۱۹۵۵) اس خطے میں اردو ادب کے ایک سرسری جائزے پر مبنی ہیں۔ میرے خیال میں یہ دونوں کتابیں ریسرچ کے اصول و ضوابط پر نہیں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر یوسف حسن کی کتاب "بنگال میں اردو (آغاز سے ۱۹۴۷ء تک) یعنی قیام پاکستان تک کے اردو پر محیط ہے۔ البتہ مسعود شہریار نے اپنی کتاب "مشرقی پاکستان میں اردو ادب کا وسیع تر جائزہ" میں آغاز سے تقریباً ۱۹۶۵ء تک کے بنگلادیشی اردو ادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں بنگلا ادب اور اردو ادب کے مابین جو لغوی اور تصوراتی مشابہتیں ہیں اور ان میں جو نئے رجحانات گھر کر چکے ہیں انہیں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسعود شہریار کی کوشش بھی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۵ء تک محدود ہے۔ بدیں حالات میں نے اپنے ریسرچ کے لئے یہی موضوع اختیار کیا۔

تاریخ سے آگاہی ہوتی ہے کہ اکثر ممالک میں انقلابات بھی آئے ہیں اور کایا پلٹ بھی ہوئی ہے ہمارا بنگلادیش بھی ان حالات سے بیگانہ نہیں۔ ۱۹۴۷ء سے زمانہ حال تک دو حکومتیں بدلیں، دو تاریخی واقعات پیش آئے۔ انگریزوں کے ظلم و استبداد کے پنجے سے آزادی ملی۔ قیام پاکستان (مغربی و مشرقی پاکستان) عمل میں آیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء

Dhaka University Institutional Repository

کی کے قلیل عرصے میں سابق مشرقی پاکستان کے مقامی وغیر مقامی عوام اپنے آپ کو صحیح طور پر سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ یک بیک کایا پلٹ ہو گئی۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو سابق مشرقی پاکستان کا نام عالمی جغرافیہ کے نقشے سے مٹ گیا اور بنگلہ دیش کا وجود نمودار ہوا تو قوم کی پہچان اس سرزمین کی پہچان سے وابستہ ہو گئی۔ ان دو تاریخی واقعات نے یہاں کے ادب و ثقافت کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ اس میں نئے نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے دوران متعدد اردو تخلیقات کو بنگلا اور بنگالی تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ بنگالی زبان کے ارباب قلم کو اہل زباں میں اور اردو مشاہیر ادب کو بنگالی داں میں متعارف کرانے کے پیش نظر ادبی تخلیقات تحریر کی گئیں۔ اس کا نصب العین یہ تھا کہ بنگلا و اردو دونوں زبان و تہذیب میں اتحاد برقرار رہے یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی اس کی تفصیل یہاں لازمی نہیں۔ تاہم یہ بتانا مقصود ہے کہ اس سے ارادی اور غیر ارادی طور پر اردو شعر و ادب میں بنگلادیش کے مقامی رنگ و ثقافت کی عکاسی سرائیت کر گئی۔ ۱۹۷۱ء کے بعد بنگلہ دیشی ماحول نے اس رنگ کو جلا بخشی اور رفتہ رفتہ بنگلادیش کا اردو ادب دہلی اور لکھنؤ جیسے اردو کے بڑے مراکز سے دور رہ کر اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ برقرار رہا۔

بہر حال میرا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ "بنگلادیش میں اردو ادب (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء) ایک ایسا اہم موضوع ہے جس کے پیش نظر زبان و ادب کی رفتار و سمت کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ اس کے ذریعہ موضوع سے متعلقہ دور تک بنگلادیش کے مصنفین کے شعری و ادبی خدمات کی تفصیلات، ادبی ذوق کی جان کاری نیز ادبی کاموں کے معیار کا صحیح علم ہو سکتا ہے۔

میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ مقالے میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء تک کے تمام معیاری شعراء و ادبا، شامل ہو جائیں لیکن تخلیق کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ ممکن ہے بعض اہم اکابر شعر و ادب کا ذکر نہ آسکا ہو۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ۱۹۷۱ء کے نامساعد حالات میں بیشتر ادبی نگارشات ضائع ہو گئیں۔ لاکھ کوشش کے باوجود ان کی بازیابی نہ ہو سکی تاہم مجھے یہ امید ہے کہ آنے والے محققین کے لئے یہ مقالہ مفید ثابت ہوگا۔ یہ کوشش تاریخی بھی ہے اور ادبی بھی۔

یہ مقالہ حسب ذیل پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اوّل : بنگلادیش میں اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء کا پس منظر ۱۹۴۷ء تک

باب دوم : بنگلادیش میں اردو ادب ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء

باب سوم : بنگلہ دیش میں اردو ادب ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

Dhaka University Institutional Repository

باب چہارم : بنگلادیش میں اردو صحافت ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

باب پنجم : بنگلادیش کے اردو ادب پر تبصرہ ۔

باب اوّل میں بنگلادیش کے محل وقوع کے تعارف کے علاوہ یہاں مسلم فاتحین و مبلغین اسلام کی زبان (عربی و فارسی) کے ساتھ یہاں کی مقامی زبان کی آمیزش اور اس کے نتائج میں "پوتھی ادب" کی نمود علاوہ ازیں ماخذ کے لحاظ سے اردو اور بنگلا زبان کے باہمی رشتوں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب دوم، ۱۹۴۷ء کے بعد سے ۱۹۷۱ء تک کے اہم شعراء و ادباء کی فرداً فرداً تفصیلی حالات کے علاوہ چند فعال ادبی انجمنوں کے تذکرے پر مشتمل ہے ۔

باب سوم میں ۱۹۷۱ء کے بعد یہاں کے کہنہ مشق شعراء و ادباء کے علاوہ قیام بنگلادیش کے بعد ابھرنے والے اہل قلم کے حالات اور انجمنوں کی ادبی سرگرمیوں کے جائزے لئے گئے ہیں ۔

باب چہارم، ۱۹۴۷ء سے حال تک شائع شدہ اردو رسائل و اخبارات کا جائزہ اور اس کے معیار کی نشاندہی پر مشتمل ہے۔

باب پنجم، ۱۹۴۷ء سے حال تک اہم شعراء و ادباء کی نگارشات کے تناظر میں ان کے شعری و ادبی معیار اور رجحانات کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ثانیاً موضوعات کے لحاظ سے ہمارا اردو ادب بنگلا ادب سے کہاں تک ہم دوش ہے اس کی توضیح کو ضروری سمجھا گیا ہے ۔

اس مقالے میں ان شعراء و ادباء کے نام بھی شامل ہیں جن کی شعری و ادبی تصانیف شائع نہیں ہوئیں ۔ ان اہل قلم کا انتخاب ان ادب پاروں کے معیار پر ہوا ہے جو مختلف مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے آئے ہیں ۔

کینز بتول

۵ اگست ۲۰۰۲ء

Dhaka University Institutional Repository

باب اوّل

بنگلادیش میں اُردو زبان وادب کے آغاز وارتقا کا پس منظر ۱۹۴۷ء تک

بنگلادیش کا محل وقوع : بنگلادیش[1] ۵۵۵۹۸ مربع میل رقبے کا ایک مثلث نما دریائی علاقہ ہے۔ اس کے جنوب میں خلیج بنگال اور شمال مشرق ومغرب میں ہندوستان اور سیلانگ کے علاقے ہیں۔ انتہائی جنوبی حصے میں چاٹگام کے پہاڑی علاقوں کی سرحدیں مایمار سے جاملتی ہیں۔ چاٹگام کے پہاڑی علاقوں کے سوا بنگلادیش کی باقی سرزمین زرخیز ہے۔ جسے دریائے گنگا، پدما، برہمپتر، میگھنا اور اس کی شاخیں سیراب کرتی ہیں۔

مختصر لفظوں میں بنگلادیش کے میدانی علاقوں میں دریاؤں کا جال بچھا ہوا ہے جو جہاز اور کشتی رانی کے لئے نہایت موزوں ہے۔ قدیم زمانے سے یہاں کشتیوں کے ذریعہ آمدورفت کا سلسلہ جاری ہے۔ چاٹگام، چالنا بنگلادیش کی کارآمد بندرگاہیں ہیں ڈھاکا، چاٹگام، راجشاہی اور سلہٹ بڑے بڑے شہر ہیں۔

---

[1] بقول انیس الحق چودھری "بنگلا" کا ماخذ عربی ہے۔ انہوں نے اپنے قول کی وضاحت کے لئے تفصیلی تاریخ اور ناقدانہ بحث سے کام لیا ہے۔ وہ اپنی کتاب "بانگلارمول (ORIGIN OF BANGLA) میں لکھتے ہیں کہ بھارت (بنگلا، پاک وہند) میں عرب سے صرف مسلمان ہی آکر آباد نہیں ہوئے بلکہ بت پرست بھی آئے اور ان بت پرستوں کی آمد حضرت عیسیٰ کی ولادت سے صدیوں پہلے شروع ہوئی جن کے نمونے آثار قدیمہ میں دستیاب ہوئے ہیں۔ قدیم عرب کے بت پرستوں کے مذہبی رسم ورواج اور بنگالی ہندوؤں کے مذہبی رسم ورواج اور بتوں کی شباہت میں مماثلت ملتی ہے۔ انیس الحق لفظ "بنگال" کی ساخت وبنیاد کی تحقیق کرتے ہوئے اپنا مضمون "بانگلارمول عربی" (بنگلا کا ماخذ عربی میں) لکھتے ہیں۔

بنگلادیش کی قدیم جغرافیائی ومقامی حالات کے مطالعے سے یہ آگاہی ہوتی ہے کہ دریائے گنگا کا دوآبہ غیر آباد اور جنگل سے بھرپور تھا۔ دریائے گنگا کے اس غیر آباد اور جنگلی علاقے کو عربی زبان میں بادیۃ الکنکا العالیۃ سے موسوم کیا گیا۔ جس کا مختصر بنکالیہ ہے۔ یہی بنکالیہ لفظ بنگالا میں تبدیل ہو گیا۔ بعد میں بنگالا سے بنگال رائج ہوا[1] مثلاً

عربی	معنی
بادیۃ	غیر آباد جنگلی علاقہ
کنکا	دریائے گنگا
عالیۃ	جوار کی بلندی/لہروں کا بہنا

ان لفظوں کو ترتیب دیں تو اس طرح لکھا جائے گا بادیۃ الکنکا العالیۃ، اور اس کا مختصر "بنکالیۃ" ہے جو بعد میں بنگالا اور بنگال سے موسوم ہوا[2]۔

بہ حوالۂ انیس الحق۔ "بانگلارمول" آدھونک پریس بنگلا بازار ڈھاکا۔ ۱۹۹۵ء ص ۷۶ تا ۷۸

[2] ایضاً ص ۷۷۔ ۷۸

Dhaka University Institutional Repository

بنگلادیش میں اُردو زبان وادب کا آغاز :

بنگلادیش میں بدھ مذہب کے پیرو پال خاندان کے زوال کے بعد ہندو "سین" خاندان تقریباً ۹۸۳ تا ۱۲۰۳ء سلطنت پر قابض رہا۔ ۱۲۰۱-۰۳ء کے دوران اختیارالدین محمد بختیار خلجی نے مغربی اور جنوبی علاقے کے ایک بڑے حصے پر فتحیابی حاصل کی۔ ان کی حکومت کا علاقہ لکھنوتی سے تندیا[1] تک پھیلا ہوا تھا۔ بنگلادیش میں مسلم ثقافت کی داغ بیل ۱۲۰۱-۰۳ء اسی زمانے سے پڑنے لگی[2]

اختیارالدین خلجی[3] کی فتح (۱۲۰۳ء) سے لے کر سراج الدولہ[4] (۱۷۵۷ء) کی حکومت کے زوال تک تقریباً ۵۵۰ سال تک بنگال پر مسلم حکمراں قابض رہے۔ اس دور میں تھوڑی مدت کے لئے راجہ گنیش (۱۴۱۴ء تا ۱۴۱۸ء) بنگال پر قابض رہا اور راجہ ٹوڈرمل (۱۵۱۰ء تا ۱۵۱۲ء) مان سنگ (۱۵۸۹ء تا ۱۵۹۶ء) مغل بادشاہ شہنشاہ اکبر کے جانشیں کی حیثیت سے یہاں حکمراں رہے[5]

اِن مسلم حکمرانوں کی دفتری زبان فارسی، مذہبی زبان عربی اور رابطے کی زبان کھڑی بولی[6] (اردو) تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی اور غیر مقامی کے آپس میں میل جول سے بے شمار عربی اور فارسی الفاظ بالواسطہ بنگلا زبان میں شامل ہونے لگے تو "دوبھاشی پوتھی ادب" کی بنیاد پڑی۔ بنگلادیش کی مقامی زبان میں آج بھی عربی و فارسی الفاظ رائج ہیں۔ مثلاً کیلے کے پتے کو "برگ" جائے نماز کو "مصلّی"

---

[1] ندیا یا نُدیا سین کی راجدھانی تھی۔ یہ علاقہ مغربی بنگال میں ہے (بحوالہ عابد دانا پوری "مشرقی پاکستان کی داستان" ماہنامہ "ساقی" کراچی مشرقی پاکستان نمبر ۱۹۶۳ء

[2] منشی رحمٰن علی طبش "تواریخ ڈھاکا" (آرہ۔ بہار ۱۹۱۰ء) ص ۲۵-۳۰

[3] اختیارالدین خلجی قطب الدین ایبک کا جنرل تھا (بحوالہ عابد دانا پوری۔ ماہنامہ "ساقی" کراچی مشرقی پاکستان نمبر ص ۱۱۵

[4] علی وردی خاں صوبہ دار بنگالہ (متوفی ۱۷۵۶ء) کے کوئی لڑکا نہ تھا صرف تین لڑکیاں تھیں۔ اس نے سب سے چھوٹی لڑکی کے شوہر زین الدین خاں مخاطب بہ احترام الدولہ ہیبت جنگ کو بہار کی حکومت پر مامور کیا۔ اور ان کے بیٹے مرزا محمد کو سراج الدولہ کا خطاب دیکر اپنی ریاست کا وارث قرار دیا سراج الدولہ ۱۰ اپریل ۱۷۵۲ء کو صوبہ بہار و بنگال کے منصب صوبہ داری پر جلوہ گر ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں شکست پاکر میر جعفر کے بیٹے میرن کے ہاتھوں قتل ہوا۔ بحوالہ (تاریخ ڈھاکا) ص ۸۷-۸۸۔

[5] عابد دانا پوری۔ ماہنامہ "ساقی" کراچی مشرقی پاکستان نمبر۔ ص ۱۱۵

[6] پروفیسر وکیل احمد "انیش شتو کیر بنگالی مسلمانیر جنتا چیتونار دھارا" حصۂ اوّل)
بنگلا اکاڈمی، ڈھاکا۔ اپریل ۱۹۸۳ء مقدمہ

گریرسین کے قول کے مطابق جدید ہند آریائی زبان کی اندرونی شاخ مغربی ہندی ہے اور اس کی پانچ شاخوں میں سے ایک شاخ کھڑی بولی ہے جس کا ماخذ شورسین اپ بھرنش اور مولد متھرا کے اردگرد کا علاقہ یعنی دہلی کے آس پاس کا علاقہ ہے۔ دراصل کھڑی بولی موجودہ اردو کا ماخذ ہے
بحوالہ مسعود حسین، مقدمہ تاریخ زبان اردو۔

Dhaka University Institutional Repository

جامہ کو "زامہ"، پیراہن کو "پیرون"، میٹھا کو "شکر" کہتے ہیں۔ ڈاکٹر شہید اللہ نے اپنی بنگلا ادب کی تاریخ میں سید حمزہ کی پوتھی"۔ "صحیح جیگونیر پوتھی" (صحیح زیتون کی پوتھی) سے بطور مثال چند اشعار پیش کئے ہیں۔ جن میں عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش زیادہ ہیں۔ اشعار حسب ذیل ہیں۔

سلام کریا کہے تمام سردار — تقصیر کرو معاف اما شبا کار
لڑیا تو مار شاتھے نا ہوئیو فتح — آخر ہوئیلو دائے جان باچائیتے
ایکھن تو مار پناہ لیا چھی آشیا — آما شبا کار ترے راکھو نوازیا
بی بی بولے جودی شبے باچائتے جان — کلمہ پڑھیا تبے ہو مسلمان
اللہ کے یقین جانو ہوئیا مومن — خوشی تے قبول کرو محمدی دین [1]

ترجمہ :

تمام سرداروں نے سلام کرکے کہا — ہم سب لوگوں کی تقصیر معاف کیجئے
آپ کے ساتھ ہم جنگ کرکے فتحیاب نہ ہونگے — آخر ہمیں تدبیروں سے جان بچانی پڑی
اب ہم نے آکر آپ کی پناہ حاصل کی ہے — اس لئے ہم سب کو آپ نواز کر رکھئے
بی بی نے کہا اگر تم سب جان بچانی چاہتے ہو — تو سب کلمہ پڑھ کے مسلمان ہو جاؤ
اللہ پر یقین رکھو اور مومن ہو جاؤ — اور خوشی سے محمدی دین قبول کرو [2]

اس نظم میں ایسے بہت سارے الفاظ مستعمل ہوئے ہیں جو مسلمانوں کے مذہبی خیالات اور معتقدات سے اس طرح زبان زد ہو چکے ہیں کہ ان کی بیگانیت ختم ہو گئی ہے۔ اس وجہ سے ان کے بجائے بنگلا زبان کے الفاظ استعمال نہ کرنے میں کوئی خامی پیدا نہیں ہوتی۔

حاصل کلام یہ کہ بدھ حکمرانوں کے بعد ہندو، پھر مسلمان اپنے اپنے مذہبی جذبات، احساسات، ثقافت اور رسم و رواج کو قائم رکھتے ہوئے بنگلادیش میں حکمرانی کرتے رہے۔ لہذا نتیجہ کے طور پر یہاں ایک خاص ثقافتی پس منظر تیار ہوا جسے ہماری اردو زبان و ادب کا پیش خیمہ کہا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں بنگال میں مسلم فاتحین کے آنے سے قبل ہی چاٹگام کے ساحلی علاقوں میں بحری راستے سے عرب اور ایران کے سوداگروں کی آمد و رفت تجارت کی غرض سے شروع ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں پروفیسر وکیل احمد اپنی کتاب

---

[1] ڈاکٹر شہید اللہ، بنگلا ادب کی تاریخ (ترجمہ، بنجود۔ ص ۲۴۸

[2] ڈاکٹر شہید اللہ " ص ۲۴۹

Dhaka University Institutional Repository

"انیش شتوکے بانگلای مسلمانیر جنتا چتونار دھارا" میں رقمطراز ہیں :

"پہاڑپور کے کھنڈر میں قدیم زمانے کا ایک سکہ ہارون الرشید کا نام کندہ کیا ہوا دستیاب ہوا ہے۔ مؤرخوں کی رائے میں یہ سکہ عربوں کی سوداگری کا ثبوت ہے۔ ان سوداگروں کے ہمراہ تبلیغ کے لئے عرب و فارس سے اولیاء و مشائخ بھی آتے رہے۔ ان بزرگانِ دین کی تعمیر کی ہوئی خانقاہیں اور درگاہیں انکی یادگاریں ہیں"[1]

سید شمیم احمد اپنے مضمون "بنگال میں صوفیائے کرام کی سرگرمیاں" میں لکھتے ہیں۔

بنگال اور مشرقی پاکستان میں جن بزرگوں نے تبلیغ کی ان میں حضرت جلال الدین سہروردی تبریزی ۱۲۴۴ء شاہ جلال سلہٹی ۱۳۴۷ء حضرت شرف الدین توامہ ۱۳۸۶ء حضرت عثمان اخی سراجی ۱۳۵۷ء حضرت راجہ یابانی ۱۳۵۴ء پیر بدر عالم زاہدی، حضرت علاء الحق پنڈوی ۱۳۹۸ء حضرت نور قطب عالم پنڈوی ۱۴۱۶ء اور حضرت علی بغدادی (میرپور۔ ڈھاکا) وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ یہ بزرگان سہروردیہ، قادریہ، زاہدیہ اور دوسرے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں دہلی کے بعد مشرقی ہندوستان میں جونپور، بہار شریف، گور، پنڈوہ، سونارگاؤں اور چاٹگام اسلامی تہذیب و ثقافت کے بڑے بڑے مراکز تھے۔ صوفیائے کرام اور مبلغینِ اسلام کی جماعتیں حجاز، عراق، تبریز اور خراسان سے لاہور اور ملتان ہوتی ہوئی دہلی پہنچتیں یا پھر وہاں سے ہندوستان کے مختلف علاقوں کی طرف پھیل جاتیں۔ سلاطین کی فوج کشی سے ممالک تو فتح ہو جاتے تھے مگر وہاں کے عوام کے دل و دماغ پر غلبہ پانے نیز مسلمان امراء، سلاطین کے اخلاق و کردار میں سدھار اور توازن پیدا کرنے کے لئے بزرگان دین کی تلقین و ہدایت کا سہارا لینا پڑتا تھا[2]

مذکورہ بیان سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مبلغین اسلام دہلی ہوتے ہوئے بنگال میں آئے تو دہلی کی زبان و ثقافت بھی ان کے ساتھ آئیں۔ اس زمانے میں اردو دکن اور دہلی کے عوام میں مقبول ہو چکی تھی۔ ان بزرگانِ دین کی ساعت سے بنگال کے مقامی لوگوں کے دل و دماغ پر اس زبان و ادب کا گہرا اثر پڑنے لگا۔ کیونکہ مقامی باشندوں کے لئے ان بزرگوں سے رابطہ کی واحد صورت اس وقت ہندوستان میں رائج بولی ہندوستانی (موجودہ اردو) تھی۔ لہذا غیر ارادی طور پر عوام کا ذہن اردو سے مانوس ہونے لگا۔

پروفیسر سراج الاسلام اپنے مضمون 1763-1800 SOCIAL LIFE IN DHAKA

---

[1] پروفیسر وکیل احمد ص ۲۔

[2] سید شمیم احمد "ساقی" کراچی۔ مشرقی پاکستان نمبر۔ ص ۳۵۵۔ ۳ ماہر لسانیات گریرسین کے رائے کے مطابق (بقیہ اگلے صفحہ پر)

Dhaka University Institutional Repository

میں ڈھاکا کی معاشرتی زندگی (۱۷۶۳ء - ۱۸۰۰ء) کی عکاسی کرتے ہوئے زبان و ثقافت کے بارے میں لکھتے ہیں :

"So far no serious study has been made on the language and culture of the city. Like all other Mughal administrative cities, social life of Dhaka city was dominated by the aristocratic culture. Persian and Arabic were cultivated by the rulers and the literate. For generality in the administration Hindustani was the language."[1]

تاریخی نکتہ نگاہ سے مغلیہ دور میں بنگال کے تین بڑے شہروں (ڈھاکا، کلکتہ اور مرشد آباد) میں ڈھاکا سب سے قدیم تاریخی شہر تھا۔ مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانے میں بنگال کے صوبیدار اسلام خاں نے اپنا پایۂ تخت راج محل سے ڈھاکہ میں منتقل کر لیا اور اس شہر کو جہانگیر کے نام سے موسوم کیا۔ اس زمانے سے ڈھاکا کو تعلیم و ثقافت کی مرکزی حیثیت مل گئی۔ ۱۷۰۴ء[2] میں اورنگ زیب کے زمانے میں مرشد قلی خاں اپنا دفتر ڈھاکے سے مرشد آباد لے گئے۔ لیکن اس تبدیلی سے ڈھاکے کی رونق اور ادبی چرچوں میں کوئی خاص فرق نہ ہوا۔ لوگ ذوق و شوق سے اپنے اپنے ڈگر پر ادبی چرچا کرتے رہے۔ ڈھاکے میں نائب ناظم اور ان کے مصاحبین و ملازمین مستقل طور پر بود و باش کرنے لگے۔ نائب ناظمین اور ان کے عاملوں کی گھریلو زبان اردو اور دفتری زبان فارسی تھی۔ شرفاء نائب ناظمین کی پیروی کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھاکے میں اردو رفتہ رفتہ خاص و عام کی پیاری بن گئی۔ اور اس کا اثر دور دراز علاقوں تک پھیل گیا۔

وفا راشدی صوبۂ بنگال میں اردو زبان کی ابتدا لکھتے ہوئے یہ واقعہ بیان کرتے ہیں :

بقیہ سے جدید ہند آریائی زبان کی اندرونی شاخ "مغربی ہندی" ہے جو شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لیکر جنوب میں وندیا چل اور بندیلکھنڈ تک بولی جاتی ہے۔ مغربی ہندی کی پانچ شاخوں میں ایک شاخ "کھڑی بولی" یا ہندوستانی ہے جسے شورسین اپ بھرنش نے جنم دیا۔ ہندوستانی شورسین دیس (دہلی اور اس کے اردگرد کا علاقہ) کی زبان تھی۔ اس کو ادبی حیثیت سے بڑا فروغ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مقامات میں مسلمانوں کی تہذیب کا گہرا اثر رہا۔ مسعود حسین، مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ دہلی ۱۹۹۵ء گیارہویں اشاعت ص ۶۵-۶۷

[1] Sirajul Islam, Prof., *Dhaka: Past Present Future*, Dhaka: Asiatic Society of Bangladesh, 1989, p. 83.

[2] تواریخ ڈھاکا، ص ۷۳

Dhaka University Institutional Repository

"صوبہ بنگال کے لفٹننٹ گورنر سر جے بی گرانٹ جب اپنی میعاد گورنری پوری کرنے کے بعد ہندوستان چھوڑ رہے تھے تو باشندگان کلکتہ کے زیر اہتمام ۱۶ر اپریل ۱۸۶۲ء کو ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کا صدر راجہ راؤ کانت دیو بہادر تھے۔ راجہ کالی کرشن بہادر جیسے اردو کے مشہور شاعر و ادیب بھی شریک تھے۔ گورنر کی خاص ہدایت تھی کہ تقریریں اردو میں ہوں۔ چنانچہ اس روز کی تمام تقریریں بنگالی یا انگریزی کی بجائے اردو زبان میں کی گئیں۔ عوام کی طرف سے جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ بھی اردو میں تھا۔[1]

کہا جاتا ہے انیسویں صدی کے اواخر میں مشرقی بنگال میں چائے کے باغات میں کام کرنے والے مزدور زیادہ تر بہار اور اڑیسہ سے آتے تھے۔ ان کی مادری زبان ہندوستانی یعنی اردو ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ EASTERN BENGAL) E.B.R RAILWAY) کے ملازمین بھی بہار اور اڑیسہ سے تقرر کئے جاتے تھے۔ ان مزدوروں اور ملازمین کے توسط سے مشرقی بنگال کے مختلف علاقوں میں یہ زبان پھیلتی رہی۔

تقسیم ہندوستان سے پہلے بنگال کی قدیم درسگاہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ نے بھی بنگال میں اردو کو رواج دینے میں بڑی مدد کی۔ اس مدرسے میں ہر سال ایک معقول تعداد میں طلباء مشرقی بنگال کے مختلف اضلاع سے درس حاصل کرنے کے لئے جاتے تھے۔ یہ طلباء جب مدرسے سے سند لے کر نکلتے تو زبانِ اردو سے بھی خوب واقف ہو جاتے تھے وہ پند و نصائح وعظ و خطاب میں بنگلا کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی اظہار خیال کا ذریعہ بنا لیتے تھے۔ مسجدوں میں خطبے، وعظ، مذہبی تقریریں خانقاہوں میں محفل سماع، ربیع الاوّل کے علاوہ دوسرے مہینوں میں بھی بنگلادیش کے گھر گھر جو میلاد شریف منعقد ہوتی تھیں وہ اردو ہی میں منعقد ہوتی تھیں۔ اگر کوئی عالم اردو میں تقریر نہ کر سکتے تو خیال کیا جاتا کہ ان کی علمیت میں کمی ہے۔ قیام بنگلادیش کے بعد سے ابتک بنگلا کے پہلو بہ پہلو اردو میں میلاد خوانی اور مذہبی تقریریں ہوتی ہیں۔ کیونکہ عام علماء اپنی تقریروں کا مواد زیادہ تر اردو کتابوں سے لیتے ہیں۔ ان کی تقریریں اردو آمیز ہوتی ہیں۔ خاص کر ڈھاکے میں اب تک اردو میں میلاد خوانی پسند کی جاتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کے بعد شمالی ہندوستان، بہار و مشرقی بنگال سے متعدد اردو ادیب و شاعر سابق مشرقی پاکستان آئے اور ان کے دم سے اردو شعر و ادب کی محفل کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ ادبی انجمنیں قائم ہوئیں، ادبی رسائل شائع ہوئے۔ مشاعرے اور ادبی نشستیں منعقد ہوتی رہیں۔ لیکن ۱۹۷۱ء کے بعد یکایک کایہ پلٹ ہو گئی۔ بنگلادیش کی مٹی جو

---

[1] وفا راشدی، بنگال میں اردو۔

Dhaka University Institutional Repository

تقریباً دو سو سال سے اردو کے لئے ساز گار تھی، وہ بنجر بن گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو، بنگلا کے لسانی تنازعات کے بل بوتے پر بنگلادیش کی بنیاد قائم ہوئی۔ لیکن ان نامساعد حالات کے باوجود شمع اردو آج بھی یہاں ٹمٹما رہی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اردو میں پھلنے پھولنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس کے علاوہ اردو اپنی ذات میں ہمہ گیر بھی ہے اور صلح و کل کا ضامن بھی۔ یہ ہے بنگال میں ترویج اردو کے حالات جو زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ یہاں تک آ پہنچے۔ اب اردو زبان کی پیدائش کے متعلق چند اہم خیالات کا اظہار لازمی سمجھتی ہوں۔

اردو زبان کی تاریخ اور اس کے ماخذ کے متعلق متعدد گرانقدر کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ احتشام حسین کی کتاب "اردو زبان کا خاکہ" ڈاکٹر محی الدین زور کی کتاب "ہندوستانی لسانیات" مسعود حسین کی کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو"، ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب "اردو زبان کا ارتقاء" وغیرہ اس ضمن کی مفید کتابیں ہیں۔ اردو کے مولد پر روشنی ڈالتے ہوئے محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں اردو زبان کا رشتہ پنجاب سے نصیر الدین ہاشمی نے اردو کا رشتہ دکن سے (دکن میں اردو) سید سلیمان ندوی نے "سندھ میں اردو" لکھ کر اردو کا رشتہ سندھ سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ حامد حسین قادری، رام بابو سکسینہ اور ڈاکٹر اعجاز حسین نے اردو ادب کی تاریخ لکھتے ہوئے دیباچوں میں اردو زبان کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی بحث میں جانا میرے لئے مناسب نہیں۔ زیر نظر تحقیقی مقالے کا عنوان ہے "بنگلادیش میں اردو ادب" اس ضمن میں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ماہر لسانیات کے مطابق اردو، بنگلا زبان ماخذ و مولد کے لحاظ سے کہاں تک اپنا رشتہ جوڑتی ہے۔ مسعود حسین گریرسن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> گریرسن کی تقسیم زبان کے مطابق شمالی ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں دو گروہوں میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی۔ اندرونی زبانیں ٹھیک اس علاقے میں بولی جاتی ہیں جس کا مرکز صوبہ دیش تھا۔ اور بیرونی گروہ مغربی پنجاب سے شروع ہو کر اڑیسہ، وسطی ہندوستان، بہار، بنگال اور آسام تک پھیلی ہوئی ہے۔"[1]

مختلف ماہر لسانیات کے قول کے مطابق اردو کا تعلق ہند آریائی زبان کی اندرونی شاخ "مغربی ہندی" سے ہے۔ جس کا احاطہ سرہند سے لے کر جنوب میں راس کماری تک ہے۔ بنگلا زبان کا ماخذ ہند آریائی کی مشرقی شاخ سے

---

[1] مسعود حسین۔ مقدمہ تاریخ زبان اُردو۔ ایم۔ کے آفسٹ پرنٹرس دہلی۔

Dhaka University Institutional Repository

ہے جو مگدھی علاقے میں کسی وقت رائج تھی [۱]

ماہر لسانیات کا قطعی فیصلہ ہے کہ جدید مگدھی اور اردو شورسینی پراکرت کی شائستہ صورت ہے۔ پراکرت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یعنی یہ براہ راست سنسکرت سے ماخوذ نہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماخذ کے لحاظ سے اردو، بنگلا زبان پراکرت کی جدید شکل ہے۔ اردو کی پیدائش گاہ شورسینی آپ بھرنش کا علاقہ ہے (دہلی اور اس کے آس پاس علاقہ) اردو اور بنگلا مگدھی آپ بھرنش کے مشرقی علاقے (اڑیا۔ آسام۔ بنگال) کی پیداوار ہے [۲]

اردو ترکی لفظ ہے اور اس کے معنی لشکر کے ہیں وسطی ہند آریائی زبان (مغربی ہندی) کی ایک شاخ "کھڑی بولی" اس کا ماخذ ہے۔ مسلم فاتحین کی زبان عربی و فارسی اور ہندوستان کی مقامی زبان کی آمیزش سے اس کی پیدائش (۱۲۰۰ء - ۱۴۰۰ء) تقریباً دو سو سال میں ہوئی۔ ماہر لسانیات نے مختلف ادوار میں اسے ہندی یا ہندوی، کھڑی بولی، ریختہ اور ہندوستانی وغیرہ کے نام سے موسوم کیا۔ اس جدید پراکرت میں مختلف بولیوں کی آمیزش ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ عوام میں مقبول ہونے لگی اور باہمی معاملات کی زبان کا درجہ حاصل کیا۔ اردو زبان کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسن لکھتے ہیں:

"شاہ جہاں نے دہلی کا لال قلعہ بنایا جو قلعہ معلّٰی کہلایا وہاں کا بازار اردوئے معلّٰی کے نام سے مشہور ہوا۔ مشہور ہوا۔ غرض جب اردو بازار میں بولی جانے والی مخلوط زبان قلعہ معلّٰی پہنچی تو اردوے معلّٰی کہلائی۔ اردو زبان کے بیشتر مؤرخ اس امر پر متفق ہیں کہ دہلی کے اردو بازار کی بنا پر اس مخلوط زبان کا نام اردوئے معلّٰی ہوا [۳] ۔ مصحفی (م ۱۸۲۴) پہلے شخص ہیں جنہوں نے زبان کے معنی میں "اردو" کا لفظ استعمال کیا [۴]

جس طرح دریا سے شاخیں پھوٹ کر دور دراز علاقوں تک پھیل جاتی ہیں یہی حال زبان کا بھی ہوتا ہے اردو زبان بھی اسی قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ دہلی سے نکل کر دکن، اودھ، گجرات، بہار اور بنگال تک پھیل گئی۔ مجموعی طور پر آج بھی یہ ایک وسیع علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ تاریخی نقطہ نظر سے اردو کا آغاز مغربی بنگال سے پہلے مشرقی بنگال میں ہوا کیونکہ محمد بن قاسم کے حملہ سے پہلے عرب تجار اور مبلغین اسلام کے ذریعہ عربی فارسی الفاظ کی میل

---

[۱] محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات۔ لکھنو ۱۹۶۰ء ص ۶۴-۶۵

[۲] ایضاً

[۳] یوسف حسن ص ۹۵

Dhaka University Institutional Repository

جول سے اس کی پیدائش ہوئی۔ ازاں جملہ یہ برصغیر کے وسیع علاقے تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو کی وسعت کے بارے میں "پنجاب میں اردو" کے مؤلف محمود شیرانی کا خیال بہت حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اردو کا آخری لیکن سب سے زبردست مرکز دہلی ہے۔ جو ولی اورنگ آبادی کے اثرات میں قائم ہوتا ہے اور کچھ عرصے بعد وہاں سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے کلکتہ پہنچ کر عام ہوتا ہے"[1]

تاریخی نقطہ نظر سے اردو کا آغاز مغربی بنگال سے پہلے ہی مشرقی بنگال میں ہوا۔ کیونکہ محمد بن قاسم کے سندھ پر حملہ (۷۱۱ء - ۱۱۷ء) سے پہلے عرب تجار اور مبلغین اسلام کے ذریعہ عربی فارسی زبانیں سواحل بنگال (چاٹگام) تک پہنچ چکی تھیں۔ اس کا تفصیلی تذکرہ اس باب کی ابتدا میں ہو چکا ہے۔ ان دونوں زبانوں کے بے شمار الفاظ نے یہاں کے مقامی زبانوں کے داخل ہو کر "دوبھاشی" یوتھی" زبان جنم دیا لیکن شعر و ادب کی محفل غالباً صوبے دار اسلام خاں (۱۶۰۸ء) کے وقت سے جمنے لگی۔ جب اسلام خاں نے بنگال کا پایۂ تخت راج محل سے ڈھاکا میں منتقل کیا۔ اس کے بعد مرشد آباد (۱۷۱۴ء) اور کلکتہ (۱۷۷۳ء) ادبی و ثقافتی مرکز بنے۔

علی وردی خاں (۱۷۴۰ء - ۱۷۵۶ء) کے دور میں محمد فصیح دردمند متوفی ۱۷۴۷ء کے نام سے ایک اردو شاعر مرشد آباد میں گزرے

نواب سراج الدولہ (۱۷۵۷ء) کی سرپرستی میں اٹھارہویں صدی کے اوائل میں مرشد آباد میں فارسی و اردو شعر و ادب کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ قدرت اللہ قدرت، فرحت اللہ فرحت وغیرہ ان کے درباری شاعر تھے[2] اٹھارہویں صدی کے اواخر میں مرشد آباد کے شعراء و ادباء میں میر انشاء اللہ خاں انشا (۱۸۱۷ء) خاص شہرت کے مالک تھے۔ دریائے لطافت اور "رانی کیتکی" ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ مرشد آباد کے شعراء میں مرزا محمد علی تنہا آخری عمر میں جہانگیر نگر (ڈھاکا) میں نواب نصرت جنگ بہادر (۱۷۵۹ء - ۱۸۱۲ء) کی سرکار سے منسلک ہو گئے تھے[3]

متعدد محققین کی رائے کے مطابق بنگال میں اردو ادب کی نشوونما میں دو تاریخی واقعات کا بھی گہرا اثر رہا۔ ۱۷۹۹ء میں میسور کی جنگ میں انگریزوں کے ہاتھوں ٹیپو سلطان کی شکست، دوسرے ۱۸۵۶ء میں نواب واجد علی شاہ کی معزولی۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ان کے خاندان کو انگریزوں نے ٹالی گنج کلکتہ میں لاکر نظر بند کر رکھا[4] یہ خاندان شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔

---

[1] محمود شیرانی، پنجاب میں اردو ص ۱۲

[2] اسلام خاں کے وقت کا کوئی اردو شعری نمونہ دستیاب نہیں

[3] یوسف حسن۔ بنگال میں اردو۔ کھلنا۔ 1999ء ص ۱۲۶

[4] ایضاً

ایضاً

انیش شاہ کے بانگلا مسلمانیر چیتو نادھارا۔ حصہ دوم ص ۱۳۵

Dhaka University Institutional Repository

سلطان کے عزیزوں میں بشیر الدین توفیق (م ۱۸۴۴) شہزادہ جلال الدین وغیرہ فارسی و اردو شاعری سے شغف رکھتے تھے[1]

۱۸۵۶ء میں نواب واجد علی شاہ کی مٹیا برج آمد سے کلکتے میں شعر و ادب کی محفل کو بڑی تقویت پہنچی[2] شاہ اردو شاعری کے علاوہ ہندی راگ راگنی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے[3] واجد علی شاہ مٹیا برج میں اکیلے نہیں آئے تھے بلکہ ان کے ساتھ شعراء کی ایک اچھی خاصی جماعت بھی تھی۔ ان شعراء کو "سبعہ سیارہ" کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس محفل میں برق، درخشاں، صمات، بہار اور اختر پیا (واجد علی شاہ کی دو بیبیاں نواب بادشاہ محل اور نواب محبوب عالم صاحبہ بھی تھیں۔[4]

ان واقعات کے علاوہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کا وظیفے کے سلسلے میں کلکتے میں آمد (۱۸۲۸ء) اور وہاں تقریباً ڈیڑھ سال قیام کے دوران شعری و ادبی نشستوں میں شرکت نے بھی مغربی و مشرقی بنگال کے شعراء و ادباء کو گہرے طور پر متاثر کیا تھا۔ ان محفلوں میں مشرقی بنگال کے مشہور شاعر عبد الغفور نساخ کا بھی آمد و رفت رہا۔

اس کے علاوہ انیسویں صدی کے اوائل میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا قیام (۱۸۰۰ء) بھی اردو نثر کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کالج سیاسی مقصد کے پیش نظر وجود میں آیا لیکن بالواسطہ اردو کے لئے بھی مزید فائدہ مند ثابت ہوا[5] فورٹ ولیم کالج کی اردو ادبی خدمات سے متعلق بے شمار مقالوں کے علاوہ کئی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ لہذا میرے لئے کالج کی ادبی تفصیلات میں جانا غیر ضروری ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کالج کی ان شخصیتوں کے نام گنوادی جائیں جن کا تعلق پیدائشی طور پر سرزمین بنگال سے تھا۔ اس سلسلے میں تاریخی چرن متراؔ اور غلام حیدر عزتؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر جاوید نہال تاریخی چرن متراؔ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "تاریخی چرن متراؔ بنگال کے سپوت ہیں جن کو ہندوستانی زبان سے زبردست شغف تھا۔ ضلع ہوگلی کے ایک گاؤں میں ۱۷۷۲ء میں ان کا جنم ہوا تھا مگر ان کا خاندان کلکتے میں آباد ہو گیا تھا۔ تاریخی چرن متراؔ کا خاندان مغلوں کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے فارسی، عربی اور اردو کا دلدادہ تھا اور انہیں خود فارسی، عربی و اردو زبان میں استعداد کامل تھی۔ تاریخی چرن متراؔ کئی برس تک بنگلا اور ہندوستانی کے منشی رہے۔ میر منشی شیر علی افسوس کے انتقال کے بعد وہ جانشین ہوئے اور جب تک کالج سے وابستہ رہے وہ اسی عہدے پر فائز رہے[6]

---

[1] پروفیسر محمد عبد اللہ، پشیم بنگے فارسی ساہیتو۔ ڈھاکا۔ فروری ۱۹۹۹ء ص ۳۵۔

[2] ڈاکٹر زہرا، واجد علی شاہ کا دور مٹیا برج۔ لکھنؤ نظامی پریس ص ۲۲ [3] ایضاً

[4] سبعہ سیارہ سے مراد سات گردش کرنے والے سیارے [5] مسعود شہریار، مشرقی پاکستان میں اردو ادب کا وسیع تر جائزہ، لاہور علمیہ پریس ص ۲۵-۲۶

[5] ساک لکھنوی، بنگال میں اردو نثر کی تاریخ آغاز تا حال۔ کلکتہ، مغربی بنگال اردو اکاڈمی ص ۲۸-۴۵

[6] جاوید نہال، بنگال کا اردو ادب انیسویں صدی میں۔ ص ۱۷۴

Dhaka University Institutional Repository

بہ قول جاوید نہال تاریخی چرن نے سنسکرتی کتاب "پرش پریچھا" کا ترجمہ ہندوستانی زبان میں کیا جو اصل میں "پرش پریکھا" (امتحان انسان) ہے۔ یہ ہندوؤں کی اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ تاریخی چرن کا ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۵ء کے درمیان بنارس (کاشی) میں غالباً انتقال ہوا۔[1]

شانتی رنجن بھٹاچاریہ اپنے مضمون "بنگال میں اردو نثری ادب ابتدا سے انیسویں صدی کے اختتام تک" میں لکھتے ہیں:

"سرزمین بنگالہ کی دوسری شخصیت غلام حیدر عزت کا اصل وطن چاٹگام مشرقی بنگال تھا جہاں سے آکر وہ ہگلی میں بس گئے تھے۔ آپ فورٹ ولیم کالج کے سررشتہ دار تھے۔ اور آپ کی نثری تصنیف "حسن و عشق" ہے جو ۱۲۱۸ھ کی ہے۔ اسے عزت نے جان گلکرائسٹ کی فرمائش پر فارسی سے اردو میں کیا تھا۔ یعنی یہ محض فارسی کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اردو کے مزاج کے مطابق عزت قصہ کو اردو کا روپ دیا ہے"[2]

فورٹ ولیم کالج کی کارکردگیوں کا ایک اہم اور خوشگوار اثر یہ ہوا کہ بنگالی شرفاء و رؤسا میں اردو زبان سے نہ صرف دلچسپی پیدا ہوئی بلکہ مسلم ثقافت نے بھی ان کے دلوں کو موہ لیا اور بہت سے ہندو بنگالیوں نے بھی اردو زبان میں گراں قدر کتابیں لکھیں اور شاعری بھی کی۔ اس سلسلے میں شیب چندر کرمکار، راجہ کرشنا دیب (۱۷۸۰ء - ۱۸۲۳ء) راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۴ء - ۱۸۳۴ء) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں[3]

بہ قول جاوید نہال:

"شیب چندر کرمکار پروفیسر تھے اور سائنس ان کا محبوب مضمون تھا۔ بنگلا زبان کے ساتھ انہیں اردو زبان بھی عزیز تھی۔ انہوں نے اردو زبان کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔[4]

کرشنا دیب کے بارے میں جاوید نہال لکھتے ہیں:

"راجہ کرشنا دیب کا آبائی وطن مرشد آباد تھا۔ کلکتے میں رہتے تھے اردو شعر و شاعری سے شغف حاصل تھا۔

---

[1] جاوید نہال۔ بنگال کا اردو ادب انیسویں صدی میں ص ۱۷۵

[2] شانتی رنجن بھٹاچاریہ، سہاہی روح ادب کلکتہ جولائی ستمبر ۱۹۹۴ء۔ مغربی بنگال اردو اکاڈمی ص ۲۹

[3] جاوید نہال ص ۲۸۲ - ص ۲۹۰

Dhaka University Institutional Repository

اس کے علاوہ انہوں نے اردو اور فارسی کے شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی اور بنگالیوں میں اردو کو مقبول و مروّج کرنے میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔ اسی دور میں پنڈت ہری دت کی زیر ادارت اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" اپریل ۱۸۲۳ء میں کلکتہ سے شائع ہوا۔[1] ۱۸۲۲ء میں راجہ رام موہن رائے (م۔ ۱۸۳۴ء) کی ادارت میں مراۃ الاخبار کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔[2] اس زمانے میں طباعت اردو کے سلسلے میں بنگال میں سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ فورٹ ولیم کالج میں چھاپہ خانہ وجود میں آیا اور ۱۸۰۳ء سے کلکتے میں اردو کتابوں کا چھپنا شروع ہو گیا۔[3] فورٹ ولیم کالج کی ادبی سرگرمیوں کا اثر صرف مغربی بنگال تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ مشرقی بنگال، بہار و شمالی ہند تک پھیل گیا اور شعراء میں شاعری کے پہلو بہ پہلو نثری تخلیقات پیش کرنے کا بھی شوق پیدا ہوا۔

ڈھاکے میں اردو شعر و شاعری کا آغاز حسین قلی خاں کے زمانے میں ہو چکا تھا۔[4] مرزا علی نقی خاں امینی جہانگیر نگر (ڈھاکا) کے بیٹے مرزا محمد عسکری عیشؔ اردو کے شاعر تھے۔ مرشد آباد میں سکونت اختیار کی تھی اور وہیں انتقال فرمایا۔[5] نمونۂ کلام یہ ہے۔

وہ اگر آوے سرِ بام کہیں — میں بھی کر لوں اسے سلام کہیں
گیا ہے یہ قطرہ مئے ساقی — ایک باری تو بھر کے جام کہیں
یہ غزل عیشؔ ہے تصدقِ سوز — مجھ سے ہوتی ہے انصرام کہیں

مرشد آباد کے شاعر مرزا محمد علی تنہاؔ آخری عمر میں جہانگیر نگر (ڈھاکا) آکر نواب نصرت جنگ بہادرؒ (۱۷۵۹ء۔ ۱۸۲۲ء) کی سرکار سے منسلک ہو گئے تھے ان کا انتقال ڈھاکا میں ہوا۔[6] نواب نصرت جنگ کے مقبرے کے قاری شیخ محمد حسین عاجیؔ فارسی و اردو کے خوش گو شاعر تھے۔[7]

---

[1] سالک لکھنوی، بنگال میں اردو نثر کی تاریخ ص ۳۹ [2] جاوید نہال، ص ۲۹۴
[3] بنگال میں اردو نثر کی تاریخ ص ۴۴
[4] حسین قلی خاں کی جانب سے مرزا علی نقی خاں امینی جہانگیر نگر مقرر کئے گئے تھے۔ بحوالہ اقبال عظیم ص ۴۷
[5] حسین قلی خاں، علی وردی خاں (م ۱۷۵۶) کے دور میں نائب ناظم ڈھاکا تھے۔ بحوالہ عیشؔ ص
[5] اقبال عظیم ص ۴۷
[6] ایضاً ص ۴۸
[7] ڈاکٹر یوسف حسن، ص ۱۷۸ [8] مشرقی بنگال میں اردو، ص ۱۵۳

[*] بقول منشی رحمٰن علی طیشؔ علی وردی خاں کے زمانے میں جب سراج الدولہ کی سازش سے مرزا محمد صادق (زمیندار ڈھاکا) کے ہاتھوں حسین الدین خاں قتل (نائب ناظم ڈھاکا) ہوا تو سرکار نظامت مرشد آباد کی طرف سے اس عہدے پر نواب جسارت خاں کا تقرر ہوا۔ انہوں نے بیس سال تک نائب ناظم کی حیثیت سے

Dhaka University Institutional Repository

نواب نصرت جنگ کے جانشیں نواب شمس الدولہ (۱۷۷۰ء - ۱۸۲۳ء) کو علم و ادب سے گہرا شغف تھا[1] ان کی سرپرستی میں ڈھاکے میں دبستان اردو شاعری کی براہ راست بنیاد پڑی۔ طپش دہلوی شمس الدولہ کے درباری شاعر تھے[2] انہیں ڈھاکہ میں تقریباً بارہ سال رہنے کا موقع ملا۔ کہا جاتا ہے کہ طپش کی صدارت میں یہاں محفل مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ بہار و مغربی بنگال کے شعراء ان محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ بنیادی طور پر طپش ایک اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے نواب شمس الدولہ کی فرمائش پر "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" لکھی۔ یہ کتاب اردو قواعد سے متعلق ہے جو فارسی میں لکھی گئی۔ لیکن تائید میں اردو اشعار نقل کئے گئے ہیں۔

نواب شمس الدولہ کو جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے قید کر کے کلکتہ روانہ کیا تو مرزا طپش دہلوی بھی ان کے ہمراہ گئے اور

بقیہ صـ ذمہ داری سنبھالی۔ جب میر محمد قاسم نے انگریزوں سے سرکشی کی اور شکست کھا کر اودھ میں پناہ گزیں ہوئے تو جسارت خاں حالات کو سمجھتے ہوئے میر قاسم کی ہمراہی چھوڑ کر پٹنہ چلے گئے۔ انگریزوں نے ان کی گذشتہ حسن خدمات سے متاثر ہو کر انہیں پٹنہ سے بلوایا اور دوبارہ ڈھاکے میں نائب ناظم کے عہدے پر انہیں بحال رکھا۔ نواب جسارت خاں کا کوئی لڑکا نہیں تھا انہوں نے رحلت سے قبل اپنے نواسے نواب حشمت جنگ کو اپنا جانشیں نامزد کیا۔ نواب حشمت جنگ سات سال مسند نشیں رہ کر ۱۷۹۶ء میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد گورنر جنرل کی منظوری سے حشمت جنگ کے بھائی نواب نصرت جنگ جانشیں ہوئے۔ نواب نصرت جنگ بڑے زیرک اور دانشمند نواب گزرے۔ سرکار کمپنی میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ان کے حسن سلوک سے امراء و فقراء خوش تھے۔ وہ علم و ادب سے بڑی انسیت رکھتے تھے۔ ان کی عربی و فارسی تحریریں خوشخط ہوتی تھیں۔ بحوالہ تواریخ ڈھاکا ص ۱۵۷-۱۵۸

نواب نصرت جنگ کی فارسی تصنیف تاریخ نصرت جنگی، مختصر رسالا ہونے کے باوجود تاریخی حیثیت سے کارآمد ہے۔ اس میں بنگال کی تاریخ مغلیہ کے علاوہ مصنف کے خاندانی حالات بھی آگئے ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اسے بعد میں شائع کیا۔ بحوالہ ثلاثہ غسالہ ص ۱۲۹

نواب نصرت جنگ کی بھی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ ان کے انتقال (۱۸۲۳ء) کے بعد ان کے چھوٹے بھائی شمس الدولہ نے گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگ اور کونسل کے ممبروں کی خدمت میں اپنے بھائی کی جانشینی کے لئے درخواست پیش کی جو مسترد کر دی گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نواب شمس الدولہ انگریزوں کے جابرانہ قبضے سے بنگال کو نکالنے کی سازش میں گرفتار کئے گئے تھے۔ ان کی درخواست پر انگریزوں نے رہائی تو دیدی لیکن انہیں مرتے دم تک اندیشہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ اور ان کی کارروائی پر کڑی نگاہ رکھنے لگے۔ اس واقعہ کے بعد ہی سے ڈھاکا میں نائب ناظم کا منصب ختم کر کے تمام جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور نواب شمس الدولہ کو صرف چار ہزار روپیہ مشاہرہ (پنشن) کمپنی سرکار سے ملنے لگا۔ تاہم ان کے جاہ و حشم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ انہیں علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ عربی، فارسی و اردو کے علاوہ انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں نظر بند رہتے ہوئے انگریزی زبان بھی سیکھ لی تھی۔

بحوالہ پروفیسر عبداللہ، ڈھاکا کوئیک جون مسلم شودھی ڈھاکا ص ۱۲-۱۳

---

[1] ڈھاکا کوئیک جون مسلم شودھی، ڈھاکا ص ۱۵

[2] مشرقی بنگال میں اردو ص ۲۶

Dhaka University Institutional Repository

ان کی اسیری کا ساتھ دیا[1] کالج کے منتظمین کی نظر ان پر پڑی تو ان کی ادبی ذہانت سے وہ بہت محظوظ ہوئے اور نواب شمس الدولہ کی رہائی کے بعد طپش کو کالج کے تعلیمی اسٹاف میں شامل کر لیا گیا۔ طپش میر درد کے تلامذہ میں سے تھے[2]

ڈھاکے میں قیام کے دوران رفتہ رفتہ طپش کے تلامذہ کا ایک گروہ بنگلادیش میں بھی پیدا ہو گیا تھا۔ جن کے دم سے یہاں اردو شعر و شاعری کا سلسلہ فروغ پاتا رہا۔ مرزا غلام حسین آتش طپش دہلوی کے داماد اور شاگرد تھے۔ ان کا پیشہ وکالت تھا۔ ڈھاکہ کی عدالت دیوانی سے منسلک تھے[3] آتش آخری عمر میں طپش کے ساتھ کلکتہ چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا[4] لیکن ان کے تلامذہ کا ایک خاصا بڑا گروہ ڈھاکے میں رہ گیا تھا جس کا سلسلہ ڈھاکے میں اس طرح رواں دواں رہا۔ مرزا جان آشنا لکھنوی اور شیخ احمد جان عطش، آتش کے شاگرد تھے منشی رحمٰن علی طپش، مرزا جان اخگر وغیرہ عطش کے شاگرد تھے۔ طپش دہلوی خواجہ میر درد کے تلامذہ میں رہے۔ اس نسبت سے مذکورہ شعراء بھی درد کے خانوادۂ شاعری سے منسلک رہے۔ اقبال عظیم کی کتاب "مشرقی بنگال میں اردو" و فاراشدی کی کتاب "بنگال میں اردو" جاوید نہال کی کتاب "بنگال کا اردو ادب (انیسویں صدی میں) میں اس دور کے بیشتر شعراء و ادباء کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ زیر نظر مقالہ کے پس منظر کی بنا پر اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ذیل میں چند اہم اکابر شعر و ادب کے ادبی کارناموں کا خلاصہ پیش نظر ہے :

حافظ اکرام ضیغم (م ۱۸۶۹ء)

حافظ اکرام رامپوری اپنے وقت کے بڑے استاد شاعر گزرے۔ محققین کی رائے کے مطابق ڈھاکا میں ان کے قیام سے سابق مشرقی بنگال کے اردو و فارسی دبستانِ شاعری کو بڑا فائدہ پہنچا۔

بقول جاوید نہال :

طپش اور ضیغم کی شاعری کی مقبولیت کی وجہ سے بنگال میں شاعری عام ہوئی اور بہت سے شاعر ہوئے جن میں مخلص، نساخ اور شمس کو ہندوستان گیر شہرت نصیب ہوئی[5]

---

[1] سالک لکھنوی ص ۷۸

[2] " " ص ۷۹

[3] مشرقی بنگال میں اردو ص ۲۵

[4] " ص ۷۶

[5] جاوید نہال ص ۳۰۰

Dhaka University Institutional Repository

سخن شعراء میں نساخ نے ان کی ایک مشہور غزل درج کی ہے۔ جن کے چند اشعار یہ ہیں[1]:

جان تیرے غم ہی میں دی ابتو جو کچھ ہو سو ہو
شوخی یہ ہم نے کی ابتو جو کچھ ہو سو ہو
ساقی ہے مینا ہے گل کی بھی آئی ہے فصل
بادہ یہی تھوڑا سا پی ابتو جو کچھ ہو سو ہو
ملنے میں خوابوں کے ضیغم کوئی بچتا ہے جی
سر پہ یہ جو کھوں ہے لی ابتو جو کچھ ہو سو ہو

بہ قول اقبال عظیم : ان کے ہاں شعری لطافتیں کم اور عروض وفن کے تجربے زیادہ ہیں[2] ضیغم کے شاگردوں میں عبدالغفور نساخ (فریدپور) محمود آزاد (ڈھاکا) خواجہ احسن اللہ شاہین (ڈھاکا) حاجی سعید بخت مجموعہ دار[3] (سلہٹ) حاجی عبداللہ آشفتہ[4] (سلہٹ) مرزا فرجام علی بیخود[5] (سلہٹ) حکیم اشرف علی مست[6] (سلہٹ) حافظ رشید النبی (کلکتہ) وغیرہ خاص شہرت رکھتے تھے۔

۱۸۶۹ء/ ۱۲۸۶ھ میں ضیغم کی رحلت بڑی دردناک طریقے سے واقع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے کسی جانی دشمن نے معہ اہل وعیال کے انہیں قتل کر کے لاشوں کے ٹکڑوں کو تالاب میں ڈال دیا تھا

آقا احمد علی اصفہانی (۱۸۳۹ء - ۱۸۷۳ء)

آقا احمد علی اصفہانی اپنے وقت کے نامور شاعر و ادیب گزرے۔ ان کی پیدائش ڈھاکے میں ہوئی والد کا نام آقا شجاعت علی تھا۔ مرزا غالب کے "قاطع برہان" کے جواب میں انہوں نے "موئد برہان" لکھی تھی۔ ۱۸۶۷ء میں مرزا نے موئد برہان کا جواب "تیغ تیز" نام سے ایک دوسرے رسالے میں دیا تو آقا احمد علی نے "تیغ تیز" کا جواب "تیغ تیز تر" سے دیا۔ بہ قول اقبال عظیم اس سلسلے کی تمام کتابیں محققین کے لئے بے حد مفید ہیں۔ بنیادی طور پر آقا احمد علی فارسی شاعر تھے لیکن اردو سے بھی انہیں شغف تھا۔ چنانچہ اشتقاق ان کی مشہور تصنیف ہے جس میں فارسی مصادر اور ان کے مشتقات کا بیان اردو زبان میں ہے۔ آقا احمد علی کے

---

[1] عبدالغفور نساخ، سخن شعراء ص ۲۹۲
[2] اقبال عظیم ص ۳۷
[3] عبدالجلیل بسمل، سلہٹ میں اردو ص ۵۷
[4] ایضاً ص ۶۷
[5] ایضاً ص ۷۱ - [6] ایضاً ص ۴۶

Dhaka University Institutional Repository

شاگردوں کا احاطہ وسیع تھا۔ جن میں نواب محمود آزاد، نواب محمد آزاد، محمد اشرف، اور فدا سلہٹی وغیرہ خاص شہرت رکھتے ہیں۔ [1]

عبید اللہ عبیدی سہروردی (۱۸۳۴ء - ۱۸۸۵ء)

بنگال میں (انیسوی صدی) علم و ادب کی سرپرستی میں مولانا عبید اللہ عبیدی کا نام سرفہرست ہے۔ بنگال میں ان کا خاندان علم و ادب اور سیاست کے میدان میں بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ان کے بیٹوں میں سرحسان سہروردی کلکتہ یونیورسٹی کے اوّل مسلم وائس چانسلر تھے۔ بیٹی نجمتہ اختر بانو اور پوتی شائستہ اکرام اللہ کو علم و ادب میں غیر معمولی قابلیت تھی۔ ان خواتین کا ذکر آئندہ باب میں کیا جائے گا۔ مولانا نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبان میں شاعری کی۔ عبیدی کی تصنیفات ۵۲ کہی جاتی ہے۔ وہ سرسید احمد خاں کے حامیوں میں تھے [2] صبا، ضیغم، سید محمود آزاد اور نساخ ان کے ہمعصر شعراء گزرے۔ سرکار برطانیہ نے انہیں "بحر العلوم" کے خطاب سے نوازا۔ بنگال کے مشہور شاعر کیقباد اور خان بہادر عبد العزیز ان کے شاگرد تھے۔

خان بہادر عبد الغفور نساخ (۱۸۳۳ء - ۱۸۸۹ء)

عبد الغفور نساخ کی پیدائش فرید پور (بنگلادیش) میں ہوئی۔ اس صدی میں برصغیر کے ادباء شعراء میں عبد الغفور نساخ کا شمار سرفہرست کے شعراء و ادباء میں ہوتا ہے۔ وہ نواب عبد اللطیف کے چھوٹے بھائی تھے۔

سالک لکھنوی نساخ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے بہار، بنگال، آسام کے علاقوں میں ان کی تعیناتی ہوتی رہی وہ اپنی ذات میں خود ایک انجمن تھے۔ اس لئے جہاں گئے وہاں شعر و ادب کے پھول کھلائے اور سینکڑوں نے ان کی شاگردی قبول کی [2]

نساخ کی اٹھارہ کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ان میں ایک تذکرہ اور سوانح عمری کے علاوہ چار اُردو غزلوں کے دیوان ایک فارسی مجموعہ، رباعیات اور قطعات کے مجموعے بھی شامل ہیں [3]

نساخ کی تصنیفات و تالیفات میں تذکرۃ المعاصرین اور سخن شعراء، دبستان اردو و فارسی کے محققین و ناقدین کے لئے نہایت مفید ہے۔ سخن شعراء (۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء) ولی دکنی سے لے کر اپنے دور تک کے دو ہزار چار سو چھیالیس اردو شعراء اور شاعرات

---

[1] مشرقی بنگال اردو ص [2] محمد عبد اللہ، بانگلادیشے فارسی ساہیتو، ڈھاکا۔ ۱۹۸۳ء ص ۱۴۶

:: فرید پور کے نواب سید عبد اللطیف اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے بڑے انہماک سے کام کر رہے تھے انہوں نے سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی سے ایک سال قبل "اسلامک سوسائٹی" کی بنیاد رکھی۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق انعامی مضامین لکھوائے گئے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعلیم کی طرف توجہ دیں۔ نواب صاحب اس کارنامے سے بنگال کے سرسید بن گئے۔

[3] سالک لکھنوی ص ۱۴۲ - ۱۴۳ بحوالہ مشرقی پاکستان میں اردو ادب کا وسیع تر جائزہ۔ ص ۱۴۳

Dhaka University Institutional Repository

کا تذکرہ ہے۔

نساخ کے بیٹے شمس کلکتوی (م - ۱۹۰۵ء) بھی اپنے وقت کے استاد شاعر تھے۔ انہیں اپنے والد کے علاوہ داغ دہلوی سے شرف تلمذ تھا۔ بنگال میں شمس کلکتوی کے شاگردوں کی تعداد وسیع تھی۔ جن میں رضا علی وحشت کا نام سرفہرست ہے۔

منشی رحمٰن علی طیش (۱۸۲۳ء - ۱۹۰۵ء)

بنگلا دیش کے دبستان اردو میں منشی رحمٰن علی طیش کا تعارف معتبر مؤرخ، اچھے نثار اور شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش ۱۸۲۳ء کے لگ بھگ ڈھاکے میں ہوئی۔ گلزار نعت (اردو و فارسی نعتیہ قصائد کا مجموعہ) گلدستۂ خیال، اور دیوانِ طیش شعری مجموعوں کے علاوہ "تواریخ ڈھاکا"[1] ان کی معرکۃ الآرا کتاب ہے۔ جس نے انہیں شہرت بخشی۔ بنگلادیش سے متعلق سیاسی، سماجی و ادبی (فارسی و اردو) تحقیق کے لئے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ چاٹگام یونیورسٹی کے پروفیسر شریف الدین نے اس کتاب کا بنگلا ترجمہ کیا۔

نواب سید محمد آزاد (۱۸۴۶ء - ۱۹۱۶ء)

نواب سید محمد آزاد کا خاندان بنگلادیش کا ایک متمول اور سربرآوردہ خاندان تھا۔ بڑے بھائی سید محمود آزاد اپنے زمانے کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے تھے اور آزاد تخلص فرماتے تھے۔ محمود بنیادی طور پر فارسی شاعر تھے۔ لیکن فارسی کے پہلو بہ پہلو اردو میں بھی شاعری کرتے تھے۔ نواب سید محمد آزاد کا شمار منشی سجاد حسین کا اخبار "اودھ پنچ" (۱۸۷۷ء) کے نورتنوں میں ہوتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی پنڈت تربھون ناتھ ہجر، عبدالغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق ان کے ہم رکاب تھے۔ سالک لکھنوی لکھتے ہیں۔

"نواب سید محمد آزاد کا نام بنگال کی تاریخ نثر میں اس لئے بھی زندہ جاوید ہے اور رہے گا کہ وہ پہلے انشا پرواز تھے جنہوں نے ظرافت نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور اپنے جادو نگار قلم سے طنز و مزاح کے وہ دریا بہائے جن کی لہریں آج بھی رواں نظر آتی ہیں[2]

ان کی تصنیفات میں "خیالات آزاد"، اور "نوابی دربار" ان کی شہرت کا باعث ہیں۔ خیالات آزاد کے دیباچے میں عبدالغفور شہباز لکھتے ہیں:

"یہ اس شخص کے خیالات ہیں جس کا قلم آزاد رقم زمانِ دراز تک اخبار نویسی اور وقائع نگاری کی عمارت کا محکم اور مستوار ستون رہا ہے[3]

---

[1] مشرقی بنگال میں اردو ص ۱۷۷ [2] سالک لکھنوی ص ۱۵۴

[3] عبدالغفور شہباز، دیباچہ خیالات آزاد

Dhaka University Institutional Repository

نوابی دربار کے متعلق حکیم حبیب الرحمٰن یہ رائے پیش کرتے ہیں جو ایک حد تک مستند ہے۔

"نوابی دربار" نہایت پیاری اردو میں ظریفانہ ڈرامہ ہے جس میں رئیسوں کے مشاغل، مصاحبین کے ہتھکنڈے بیگمات کے تباہ کن رسمیں، غرضیکہ بہت سے مفاسد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زبان بہت دلچسپ اور بیحد شوخ ہے"۔[1]

پروفیسر مشتاق احمد کی رائے میں بھی یہ ایک ڈرامہ ہے[2]

احمد حسین وآفر

احمد حسین وآفر محسنیہ مدرسہ ڈھاکا میں انگریزی کے معلم تھے[3] انہیں اردو فارسی و انگریزی کے علاوہ بنگلا زبان میں بھی واقفیت تھی۔ وآفر کا بنیادی میدان شاعری تھا۔ نساخ سے اصلاح سخن کرتے تھے لیکن دبستان اردو میں ان کی شہرت "بیمار بلبل" (ناٹک) کی وجہ سے ہوئی۔ بہ قول حکیم حبیب الرحمٰن، یہ ناٹک مطبع محمدی ڈھاکا سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا[4] پروفیسر کلیم سہسرامی نے اس ڈرامے کو نئے سرے سے مرتب کرکے مغربی بنگال اردو اکاڈمی کلکتہ سے شائع کروایا اور اس پر ایک ناقدانہ دیباچہ لکھ کر اس ناٹک کے متعلق تمام غلط بیانات کے اصلاح کرنے کی سعی کی ہے۔ اقبال عظیم نے اپنی کتاب میں اس ناٹک کا نام "بہارِ بلبل" اور عشرت رحمانی نے اپنی کتاب "اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید" میں "بلبل بیمار" لکھا ہے۔ یہ دونوں بیانات غلط ہیں۔ اس سلسلے میں شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی رائے تحقیق کی رو سے مستند ہے۔ وہ اپنے مضمون "بنگال میں اردو کا نشری ادب ابتدا سے انیسویں صدی کے اختتام تک" میں رقمطراز ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ مولوی احمد حسین وآفر کے اس ڈرامے کا نام نہ تو "بہار بلبل" ہے اور نہ "بلبل بیمار" بلکہ اس کا درست نام "بیمار بلبل" ہے۔ رجسٹرار آف بکس حکومت بنگال کے ریکارڈ کے مطابق اسے پرنٹر پبلشر محمد جان نے محمدی پریس ڈھاکا سے شائع کیا۔ تاریخ اشاعت ۲۴ جولائی ۱۸۸۰ء ہے[5]

اردو ڈرامہ نگاری میں اس ناٹک کا درجہ متعین کرتے ہوئے عشرت رحمانی لکھتے ہیں:

---

[1] ثلاثۂ غسالہ ص ۱۱۲ [2] دیباچہ نوابی دربار۔ مرتب مشتاق احمد، کلکتہ ۱۹۷۴ء

[3] خودنوشت سوانح حیات نساخ، مرتب عبدالسبحان صاحب، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۸۶ ص ۱۵۸

[4] ثلاثۂ غسالہ ص ۷-۸

[5] شانتی رنجن بھٹاچاریہ، سہ ماہی روح ادب کلکتہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی۔ ص ۳۵

Dhaka University Institutional Repository

"یہ اردو کا پہلا نثری ڈرامہ اور اندر سبھا کے بعد اردو ڈرامہ نگاری میں پہلا موڑ ہے"[1]

"بہار بلبل" انسویں صدی کے نثری ادب میں ڈرامہ نگاری کی کامیاب کوشش ہے۔ اس کا پلاٹ رومانی ہے۔ اس میں پیری اور جوانی اور دولت و غربت کی کشمکش دکھائی گئی۔

حکیم حبیب الرحمٰن (۱۸۸۱ء - ۱۹۴۷ء)

بیسویں صدی کے آغاز میں بنگلادیش کے اردو نثری خدمات میں حکیم حبیب الرحمٰن کا نام سرفہرست ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ بنگلادیش کے دبستان اردو میں ان کا تعارف مورخ، نثر نگار اور صحافی کی حیثیت سے ہے۔ آسودگان ڈھاکا، ڈھاکا پچاس برس پہلے، ثلاثہ غسالہ ان کی مفید اردو تصنیفات ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے ڈھاکا سے "المشرق" کا اجراء کر کے مشرقی بنگال و آسام میں اردو صحافت کا آغاز کیا۔ یہ رسالہ ان کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ دوسرا رسالہ "جادو" جنوری ۱۹۲۳ء میں شائع کیا جو ۲½ سال تک ان کی ادارت میں، بعد میں خواجہ عادل کی ادارت میں ۱۹۳۰ء تک شائع ہوتا رہا[2]

حکیم حبیب الرحمٰن نے "انجمن اردو" کی بھی بنیاد رکھی تھی جو مشرقی بنگال و آسام کی پہلی اردو انجمن کہی جاتی ہے اس انجمن کے ماتحت ان کے دولتکدے پر یا حبیبیہ طبیہ کالج میں اردو مشاعرے کا اہتمام ہوا کرتا تھا[3]

آسودگان ڈھاکا (اکتوبر ۱۹۴۶ء) منظر پریس ڈھاکا میں چھپی۔ اس میں ڈھاکا کے بزرگان دین کے مزارات کے علاوہ امراء و شرفاء کے مقبروں کے تذکرے اور ان کے مختصر سوانحی خاکے پیش کئے گئے ہیں۔ تاریخی واقعات پیش کرنے میں حکیم صاحب سے کچھ چوک ہو گئی ہے۔ تاہم تاریخی نقطہ نگاہ سے یہ ان کا مفید کارنامہ ہے۔

ڈھاکا پچاس برس پہلے ۱۹۴۹ء کتاب منزل لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان کی ۱۶ ریڈیائی تقاریر پر مشتمل ہے۔ جو انسویں صدی میں ڈھاکے کی معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ۱۸۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بنیادی طور پر ڈھاکے کے نوابین، امراء و شرفاء کی تہذیب و ثقافت کی ترجمان ہے۔

ثلاثہ غسالہ حکیم صاحب کی تمام تصنیفات پر بھاری کہی جا سکتی ہے

---

[1] عشرت رحمانی، اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید، علی گڈھ ایڈیشن ۱۹۹۵ء ص ۲۷۶

[2] پروفیسر عبداللہ ڈھاکا کوئیک جون مسلم شودھی، ڈھاکا ص ۱۹۸

[3] مشرقی بنگال میں اردو ص ۹۹

Dhaka University Institutional Repository

اس میں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے شعراء و ادباء کے کتابوں کا تذکرہ ہے۔ برصغیر میں عربی، فارسی اور اردو کے محققین اور ناقدین کے لئے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ اس گرانقدر کتاب کو شعبۂ اردو و فارسی (ڈھاکا یونیورسٹی) کی پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابو البشر کے تعاون سے عارف نوشاہی نے مرتب کیا اور ۱۹۹۵ء میں پاکستان اردو اکاڈمی لاہور سے چھپوا کر منظر عام پر آنے کے قابل بنایا۔

خالد بنگالی (م - ۱۹۴۴ء)

خالد بنگالی کا مکمل نام محمود الرب صدیقی تھا۔ وہ اردو ادبی محفل میں خالد بنگالی کے نام سے مشہور ہیں۔ خالد کی پیدائش موضع بولائی ضلع کشور گنج میں ہوئی۔ والد مولانا عبدالحئی اختر اپنے وقت کے قابل بزرگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے عربی و فارسی کی ۵۰ کتابیں اپنی زندگی میں لکھی تھیں۔ خالد بنیادی طور پر شاعر تھے۔ اردو شعر گوئی کے علاوہ انہیں صحافت اور نثر نگاری کا بھی شوق تھا۔ خالد کا سب سے بڑا کارنامہ موضع بولائی ضلع کشور گنج سے ماہنامہ "اختر" کا اجراء ہے۔ اس رسالے کا صرف ایک شمارہ شائع ہوا۔ سلیم اللہ فہمی خالد بنگالی کے شاعرانہ ذوق کے بارے میں لکھتے ہیں:

"خالد ہفتہ وار محفل مشاعرہ منعقد کرتے تھے جس میں لوگ باہر سے طرحی غزلیں بھیجتے تھے۔ ان میں دہلی کے مشہور شاعر اور ادیب ظفر تاباں بھی تھے"[۲]

ان مشاہیر شعر و ادب کے علاوہ ڈھاکا کے نواب خواجگان خاندان نے بھی مشرقی پاکستان (بنگلادیش) میں اردو و فارسی شعر و ادب کے فروغ میں اہم خدمات انجام دیئے۔ ناسپاسی ہوگی اگر ان شعراء و ادباء کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ ؎ خواجگان کشمیریہ کی گھریلو زبان اردو تھی۔ لیکن شعر گوئی کا چرچا فارسی و اردو میں جاری تھا۔ اس خاندان میں قابلِ رشک فارسی و اردو شعراء پیدا ہوئے۔

---

[۱] مشرقی بنگال میں اردو ص ۹۸

[۲] سلیم اللہ فہمی مشرق، "خالد بنگالی" مشرق کوآپریٹو پبلیکیشنز لمیٹیڈ ڈھاکا ص ۱۲۷

؎ خواجگان کشمیریہ خاندان کے جد اعلیٰ خواجہ علیم اللہ (متوفی ۱۸۵۴ء) تجارت کے سلسلے میں اپنے والد حفیظ اللہ کے ہمراہ کشمیر سے ہجرت کر کے ڈھاکا آئے تھے۔ خاندانی پیشہ شال کی تجارت تھا۔ بقول منشی رحمٰن علی طیش حفیظ مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ علیم اللہ اپنے چچا احسن اللہ کے پاس رہ کر تجارت کرنے لگے۔ کافی مال دولت جمع کی اور زمینداریاں خریدیں۔ کیمبل کے بیان کے مطابق یہ حضرات انگریز کے بڑے خیر خواہ تھے۔ اسی خیر خواہی کے صلے میں انگریز حکومت نے خوش ہو کر ۱۸۵۸ء میں خواجہ علیم اللہ کے بیٹے خواجہ عبدالغنی میاں (۱۸۱۳ء - ۱۸۹۶ء) کو نواب بہادر کا لقب دیکر ڈھاکا کی نوابی کا عہدہ عطا کیا۔

بحوالہ

Dhaka University Institutional Repository

جن میں حیدر جان شائق (م - ۱۸۵۲ء) خواجہ اسد اللہ کوکب (م - ۱۸۵۹ء) خواجہ عبدالرحیم صبا (م - ۱۸۷۱ء) خواجہ عبدالغفار اختر (م -) نواب خواجہ احسن اللہ شاہین (۱۸۴۶ء - ۱۹۰۱ء) خواجہ محمد افضل (۱۸۴۶ء - ۱۹۴۰ء) وغیرہ کے نام تقسیم ہندوستان (۱۹۴۷ء) سے قبل بنگلادیش کے اردو اکابر ادب میں قابل یادگار ہیں - ان شعراء و ادباء میں خواجہ حیدر جان شائق اور خواجہ عبدالغفار اختر کو مرزا غالب سے شرف تلمذ حاصل تھا۔[۱]

خواجہ احسن اللہ شاہین :

خواجہ احسن اللہ شاہین نواب عبدالغنی کے بیٹے تھے۔ نواب عبدالغنی نے ان کی انگریزی تعلیم کے لئے انگلستانی اتالیق کا ایک ہزار روپیہ تقرر کیا اور عربی و فارسی تعلیم کے لئے ہندوستان کے مختلف مقام سے اعلیٰ معلم کو بڑی بڑی تنخواہوں پر مقرر کیا تھا[۱] یہی وجہ تھی کہ احسن اللہ کی علمی و ادبی معلومات اچھی تھی۔ وہ اردو و فارسی میں یکساں شعر کہتے تھے۔ راگ رنگ کی طرف بھی ان کا طبعی رجحان تھا۔ انہوں نے غزل کے علاوہ ہندی گیت اور ٹھمریاں بھی کہیں۔ شاعری کے علاوہ نثر نگاری کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے عبدالرحیم صبا کی فارسی کتاب (خاندان خواجگان کی تاریخ) کا ترجمہ "احسن القصص" کے نام سے کیا[۲]

خواجہ محمد افضل :

خواجہ محمد افضل اپنے وقت کے ممتاز شاعر گزرے۔ انہیں نواب محمود آزاد سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں ماہر تھے۔ ان کی تعلیم انڈر گریجویٹ کہی جاتی ہے۔ انہوں نے فارسی کے پہلو بہ پہلو اردو میں بھی شاعری کی تاریخ گوئی chronology ان کا خاص شغف تھا[۳]

شعبۂ اردو و فارسی، ڈھاکا یونیورسٹی

بنگلادیش میں اردو شعر و ادب کے فروغ میں شعبۂ اردو و فارسی، ڈھاکا یونیورسٹی کی خدمات ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ آرٹ فیکلٹی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ شعبۂ اردو و فارسی کی بھی بنیاد رکھی گئی :-

---

[۱] وقار راشدی، بنگال میں اردو ص ۷۶
[۲] مشرقی بنگال میں اردو ص ۶۵
[۳] " " " ص ۹۴
:- شعبۂ اردو و فارسی اس وقت شعبۂ عربی میں شامل تھا۔

Dhaka University Institutional Repository

اس شعبے کے اساتذہ اور ان کے علمی و ادبی خدمات وسیع ہیں۔ بنگلہ دیش میں اردو شعر و ادب کے آغاز و ارتقاء کے پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں صرف ان اہم اساتذہ کا ذکر کرنا لازمی سمجھتی ہوں جو تقسیم ہندوستان سے قبل شعبے سے وابستہ رہے

فدا علی خان

فدا علی خاں رامپوری شعبۂ اردو و فارسی کے پہلے صدر تھے۔ فدا علی کو اردو و فارسی و عربی کے علاوہ بنگلا زبان میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ انہوں نے بنکم چیٹرجی کا ناول "بشوبرکھا" کا ترجمہ "برسات کا روکھ" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب ڈھاکے سے شائع ہوئی[1]

جناب وجاہت حسین عندلیب شادانی :

عندلیب شادانی کا تقرر ۱۹۲۸ء میں ہوا۔ وہ اس شعبے میں اردو ادبی سرگرمیوں کے روح رواں تھے۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۶۹ء تک انہوں نے بے لوث علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔ جس کا تفصیلی جائزہ آئندہ باب میں پیش کیا جائے گا۔

۱۹۴۱ء سے پہلے شعبۂ اردو و فارسی کے اساتذہ میں سید مظفر الدین ندوی، فخر المحدثین محمد برہان الدین معید الاسلام بورہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کے ادبی کارنامے درس و تدریس اور چند مقالات تک محدود ہیں۔

اس حلقے میں معید الاسلام بورہ، جناب فدا علی خاں کے بعد شعبہ کے صدر بنے۔

"معید الاسلام بورہ ۱۹۴۴ء میں معالجہ کے لئے ہندوستان گئے۔ وہیں ان کا انتقال ۴ مئی ۱۹۴۴ء کو ہوا انہوں نے فارسی کتاب "بہارستان غیبی" کا ترجمہ مع تصحیحات کے انگریزی زبان میں کیا۔ اس کتاب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بنگلا اکیڈمی ڈھاکا نے بہارستان غیبی کا ترجمہ بنگالی زبان میں کیا

---

[1] ثلاثۂ غسالہ ص ۵

[2] ڈھاکا یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ۔ شمارہ ۴۴-۱۹۴۳ء ص ۱۰۰

Dhaka University Institutional Repository

باب دُوم

بنگلہ دیش میں اردو ادب ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء

۱۹۴۷ء میں ۱۴/۱۵ اگست کی شب کو وہ یادگار تاریخی واقعہ پیش آیا جس نے انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے برصغیر کو نجات بخشی۔ بھارت تقسیم ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان دو حکومتیں وجود میں آئیں۔ پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو کر ملا۔ ایک مغربی پاکستان دوسرا مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلادیش)

تقسیم ہندوستان کے بعد ہجرت کا سلسلہ بڑی زور و شور سے شروع ہوا۔ انگریز ہندوستان سے رخصت ہوئے لیکن ان کی شاطرانہ چال "نفاق ڈالو اور حکومت کرو" کا اثر باقی رہا۔ ہندو اور مسلمان دو قومیں آپس میں کٹ مر رہی تھیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی پاکستان ہجرت بڑے پیمانے پر اسی خلفشار کے نتائج پر ہوئی۔ تاریخ کے مطالعے سے آگاہی ہوتی ہے کہ ہندوستان سے پاکستان میں آمد تین قسطوں میں ہوئی۔ پہلی ہجرت قیام پاکستان کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں دوسری ۱۹۵۰ء اور تیسری ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے فوراً بعد منتقل آبادی میں مذہبی جوش و خروش کارفرما تھا۔ دو قومی نظریہ کے تحت پاکستان کا قیام آزاد اسلامی سلطنت کی حیثیت سے ہوا تھا۔ مسلمانوں نے اس کے وجود کو خندہ پیشانی سے تسلیم کیا اور اس کی برقراری کے لئے ہر ممکن قربانی پر آمادہ رہے۔ وہ اس امید کے سہارے ہجرت کر کے آئے پاکستان میں اسلامی قانون نافذ ہوگا اور شرع اسلامی کے مطابق زندگی بسر کرنے میں انہیں آزادی رہے گی۔ یہی جذبہ یہاں کے مقامی مسلمانوں کے دل میں بھی موجزن تھا۔ انہوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کا استقبال کرتے ہوئے بڑی اخوت و محبت کا ثبوت پیش کیا اس طرح مہاجرین کی کثیر جمعیت سابق مشرقی پاکستان میں آباد ہوئی۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۵ء کی ہجرت ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات سے مجبور ہو کر ہوئی تھی۔

۱۹۶۵ء میں سابق مشرقی پاکستان میں مہاجرین کے ورود کو واضح کرتے ہوئے شہزاد منظر رقمطراز ہیں:-

"۶۴-۱۹۶۵ء میں مشرقی پاکستان میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا۔ ہندوستان کے مشرقی صوبے بہار، مغربی بنگال

Dhaka University Institutional Repository

اور اڑیسہ میں بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات رونما ہونے کے باعث ہندوستان کے مسلمان مہاجرین کی بہت بڑی تعداد نے مشرقی پاکستان میں پناہ لی۔ ان کے لئے سرحدیں کھول دی گئیں۔ ان مہاجرین میں ادیب، شاعر اور صحافی بھی شامل تھے۔"[1]

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ تقسیم ہندوستان سے پہلے مشرقی بنگال (بنگلادیش) میں اقتصادی اور صنعتی میدان پر افسر سے مزدور تک مقامی ہندوؤں کا اجارہ تھا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد مقامی ہندو، ہندوستان چلے گئے۔ تو ان شعبوں کی خانہ پری مہاجرین مسلمانوں سے ہوئی۔ جن میں خاص کر ایسٹ پاکستان کے ریلوے کے شعبے کو ان لوگوں نے سنبھال لیا تھا۔ ڈھاکا کا سابق مشرقی پاکستان کا مرکز ہونے کی وجہ سے سکریٹریٹ کی صوبائی شاخ کی بنیاد ڈھاکے میں پڑی تو اس دفتر میں کثیر تعداد میں مہاجرین کو ملازمت ملنے لگی۔ صوبائی حکومت کے دیگر شعبوں یعنی تھانوں اور ڈاکخانوں کے دفاتر میں بھی مہاجرین کا مختلف عہدوں پر تقرر ہونے لگا۔ جب ذریعہ معاش کی اس بندھی تو جو ق در ذوق مہاجرین کا ورود مشرقی پاکستان کے مختلف علاقے میں ہوتا ہے۔

جب مہاجر ین شعراء و ادباء اس خطے میں داخل ہوئے تو یہاں مشاہیر شعر و ادب کی اچھی جمعیت تھی جن میں شرف الحسینی، مرزا فقیر محمد، خواجہ اسماعیل ذبیح، خواجہ محمد عادل، حافظ ظہور المبارکی، سلیم اللہ فہمی، حکیم محمد اسماعیل الہلالی (چاٹگام) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس ادبی محفل کے روح رواں عندلیب شادانی تھے۔ وارد ین اکابر شعر و ادب کی شمولیت نے مقامی اردو ادبی محفل کو بڑا فروغ بخشا۔ کیونکہ وارد گروہ میں بیشتر فن کار ادب جدید اور ترقی پسند کے حامیوں میں تھے جس کا مفید نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں حسن و عشق کے فرسودہ مضامین کے پہلو بہ پہلو سیاست، حب الوطنی، حقائق زندگی کی عکاسی ہونے لگی۔ نثر میں تنقید و تحقیق، انشائیہ اور افسانہ نگاری پر مزید توجہ دی گئی۔ ناول نگاری میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ تاہم فضل احمد فضلی کا ناول "خون جگر ہونے تک" اور "سحر ہونے تک" ناول کی شکل میں ایک مفید تاریخی و ادبی خدمت ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی متعدد درسی و علمی کتابیں بھی منظر عام پر آئیں۔

مستند محققین کی رائے کے مطابق اردو آغاز ہی سے بنگال میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی گئی جس کا تفصیلی تذکرہ باب اول میں ہو چکا ہے۔ لہٰذا اردو داں مہاجرین کی آمد اور مقامی حضرات کی اردو سے دلچسپی کے مخصوص ضلع کے اسکولوں میں اردو کی

---

[1] پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال ص ۲۰۴

Dhaka University Institutional Repository

تعلیم کا انتظام ہوا۔ کالجوں میں اردو و فارسی کی شعبے کھلے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں اردو طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ آفتاب احمد صدیقی، شوکت سبزواری، طاہر فاروقی، حنیف فوق، معز الدین، ظفر الہدیٰ جیسے ذی فہم اساتذہ نے شعبۂ اردو و فارسی میں درس و تدریس کی ذمہ داری سنبھالی تو ان کی رہنمائی میں نظیر صدیقی (مرحوم) کلیم سہسرامی، محمد عبداللہ (بنگالی نژاد) نور الدین (بنگالی نژاد، مرحوم) احمد زین الدین، اُم عمارہ، زین العابدین، خورشید احمد، فاطمہ حسن کلثوم ابو البشر جیسے طلبا و طالبات کو اکتساب علم کا موقع فراہم ہوا۔ یہ حضرات اب تک اردو شعر و ادب کی وسعت میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اردو ادب کے فروغ میں ان ادبی انجمنوں کا حوالہ دینا بھی ضروری سمجھتی ہوں۔ جنہوں نے انفرادی یا اجتماعی طور پر اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں اہم حصہ لیا، انجمنوں کے نام حسب ذیل ہیں:

بزم آصفی: رضا علی وحشت کلکتوی کی سرپرستی میں اس قدیم انجمن کی بنیاد کلکتے میں پڑی تھی بعد میں ڈھاکا منتقل ہوئی۔ اس انجمن نے کلاسیکی شاعری کو عروج بخشنے کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات پر بھی توجہ دی۔[1]

بزم شاکری: یہ انجمن شاکر کلکتوی سے منسوب تھی۔ اس انجمن نے بزم آصفی کی روایت کو برقرار رکھا۔ رضا علی وحشت کی سرپرستی میں مشاعروں اور ادبی نشستوں کے علاوہ دیگر ادبی سرگرمیوں پر نگاہ ڈالی گئی۔[2]

انجمن ادب: اس انجمن کے بانی صلاح الدین محمد تھے۔ یہ خالصتاً ترقی پسند انجمن تھی اس انجمن نے ادبی و شعری نشستوں کے علاوہ ادب میں افادی پہلو کے ساتھ اسے زندگی سے قریب تر کرنے میں نمایاں کام کیا۔ نوشاد نوری، سرور بارہ بنکوی، احمد الیاس، ام عمارہ، بانو اختر شہود، انور فرہاد، زین العابدین وغیرہ اس انجمن سے وابستہ تھے۔[3]

بزم اُردو مشرقی پاکستان: اس کے بانی غلام خواجہ تھے۔ اس انجمن نے بڑوں کے علاوہ بچوں کے لئے بھی ایک بزم قائم کی جس کا نام "بزم اطفال نو" تھا۔[4]

حلقۂ دانش: یہ انجمن ڈھاکا کی ادبی انجمنوں میں ایک نمایاں مقام رکھتی تھی۔ اس کے صدر عندلیب شادانی اور آصف بنارسی تھے۔ احسن احمد اشک، ڈاکٹر حنیف فوق، پروفیسر ارشد کاکوی وغیرہ اس کے دیگر عہدیداران میں شامل تھے۔ اس انجمن نے مشاعروں اور ادبی نشستوں کے اہتمام کے علاوہ شعر و ادب کی حفاظت قومی ورثے کی حیثیت سے کی

---

[1] [2] ایوب جوہر۔ بنگلادیش میں ادبی انجمنوں کا سفر" رسالہ مجلس (خاص نمبر) جنوری ۱۹۸۸ء ص ۴۸

[3] نوشاد نوری کا زبانی بیان۔ ۵ فروری ۱۹۹۸ء [4] ایوب جوہر۔ ادبی مجلس ص ۴۸

Dhaka University Institutional Repository

مرکز ادب : یہ انجمن بھی اپنے وقت کی معروف انجمن تھی۔ آصف بنارسی، پروفیسر اظہر قادری، نوشاد نوری، رفیع احمد فدائی اس کے عہدیداران تھے [1]

حلقہ ارباب ذوق : بہ قول نوشاد نوری یہ انجمن ادب میں صالح فکر و نظر کے حامی شعراء و ادباء سے وابستہ تھی۔ اس کے صدر ڈاکٹر غریب شادانی اور اہم ممبران و کارکنان میں پروفیسر اظہر قادری، ڈاکٹر حنیف فوق، نظیر صدیقی، ارشد کاکوی، نوشاد نوری، غلام محمد شامل تھے [2]

مذکورہ اہم انجمنوں کے علاوہ "انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان" "انجمن ترقی پسند مصنفین" "ادبی مرکز" "بزم فنون" "ادارہ لوح و قلم" وغیرہ سابق مشرقی پاکستان کی سرگرم ادبی انجمنیں تھیں جن کی سرپرستی میں مشاعروں ادبی نشستوں کے علاوہ دیگر ادبی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ [3]

چند ادبی انجمنوں کے بارے میں مسعود شہریار کا حسب ذیل بیان تحقیق کی نگاہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے۔

"تذرل اقبال اکاڈمی (ڈھاکا) انجمن ادب مشرقی پاکستان اور انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان کو خاص طور پر خراج تحسین پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان انجمنوں کی مساعی سے اس کشیدگی کو دور کرنے میں بطور خاص مدد ملی ہے جو بنگلا کو قومی زبان تسلیم کرانے کے سلسلے میں اردو بنگلا کے عنوان سے ایک نزاعی صورت حال میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ان انجمنوں نے اپنی ادبی نشستوں میں بنگلا زبان کے فنکاروں کو مدعو کر کے نمایاں کارنامہ انجام دیا [4]

ان ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام ادبی محفلوں میں اردو کے اہم شعراء و ادباء جوش ملیح آبادی، حمایت علی شاعر، اور بنگلا کے مشہور شاعر کوی جسیم الدین، بیگم صوفیہ کمال وغیرہ کی شرکت سامعین پر مفید تاثر قائم کرتی تھی۔

مجموعی طور پر قیام پاکستان کے بعد انقلاب بنگلادیش یعنی ۱۹۷۱ء تک یہاں اردو شعر و ادب کا ارتقا ہوتا رہا۔ اس دور کو بنگلادیش میں اردو شعر و ادب کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک اس سرزمین میں اردو کی محفل ادب سجانے والوں کی فہرست طویل ہے۔ زمانہ کی ستم ظریفی کے ہاتھوں کچھ چیزیں تلف ہو گئی ہیں۔ پھر بھی حتی الامکان اس دور کے شعراء و ادباء کے حالات و کارناموں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

---

[1] [2] [3] ادبی انجمنوں کے متعلق یہ تمام معلومات نوشاد نوری (مرحوم) اور جناب شعیب عظیم سے زبانی فراہم ہوئیں

[4] مسعود شہریار ص ۱۳۰

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر طاہر رضوی

(۱۹۰۵ء — ۱۹۴۷ء)

خاندانی نام: پروفیسر محمد طاہر رضوی۔ ادبی نام طاہر رضوی۔ ۱۹۰۵ء میں بمقام حسین آباد ضلع پلاموں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید محمد عسکری تھا۔ طاہر رضوی نے پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۱ء میں میٹرک، ۱۹۲۳ء میں پٹنہ کالج سے آئی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد پریسڈنسی کالج سے ۱۹۲۵ء فارسی آنرز کے ساتھ بی۔ اے اور فارسی ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔ اے کے امتحان سے فراغت کے بعد پریسڈنسی کالج کلکتہ میں لکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں ان کا تبادلہ اسلامیہ کالج میں ہو گیا۔

۱۹۴۷ء میں سابق مشرقی پاکستان آ گئے اور راجشاہی کالج (راجشاہی) میں شعبۂ عربی و فارسی کے صدر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اپنے اہل و عیال سے ملنے کلکتہ گئے تو اچانک ان پر دل کا دورہ پڑا اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ مرحوم کا قیام سابق مشرقی پاکستان میں چند ماہ رہا لیکن وہ اپنے شاگردوں اور احباب علم میں ایک اچھا تاثر چھوڑ گئے۔ خاص کر مغربی بنگال (کلکتہ) سے ہجرت کر کے آنے والوں میں شمس الحق شیدائی، سلیم اللہ فہمی، امیر الاسلام شرقی، ان کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔

کلیم سہسرامی، طاہر رضوی کے ادبی کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پروفیسر طاہر رضوی نے اردو میں بہت ساری نصابی کتابیں ترتیب و تدوین کی ہیں۔ لیکن ان کا اصل میدان فارسی زبان اور ایرانی مذاہب کا مطالعہ ہے۔ اردو زبان میں "خدمات ایران بہ اسلام" "یگانگت آیات قرآنی و گاتھا" اور "یکسانی عقائد و کیش زرتشتی" ان کے ایسے تحقیقی کارنامے ہیں جنہوں نے ایرانی اور زرتشتی محققین کو بھی چونکا دیا چنانچہ اسی بنا پر حکومت ایران نے انہیں جشن فردوسی کے موقع پر دعوت دی"[1]

ان کی تحقیقات کا اصل موضوع ایرانیان و اسلامیات تھا۔ ان کی انگریزی کتاب "پارسیز" اسی نوعیت کی کتاب

---

[1] کلیم سہسرامی۔ بیسویں صدی میں آزادی سے پہلے بنگال میں اردو نثر کا جائزہ" سہ ماہی کوہ ادب مغربی بنگال اردو اکادمی ۸ جولائی دستمبر ۱۹۹۴ء

Dhaka University Institutional Repository

ہے۔ جس کا فارسی ترجمہ مازندانی نے فارسی میں ایران لیگ بمبئی سے شائع کیا۔ اور اردو میں نیاز فتح پوری نے ترجمہ کے بعد نگار پریس سے شائع کروایا۔ ان کے علاوہ ان کے متعدد اردو تعلیمی کتابیں بھی جو اس وقت اسکول و مدرسہ کے نصاب میں شامل تھیں[1] ان کتابوں میں چند کے نام یہ ہیں۔

(۱) گلشن اردو (۲) خیابانِ ادب (۳) دبستانِ رضویہ (۴) انتخاب سبزواریہ

(۵) چمنستانِ ادب (۶) اردو کمپوزیشن

نمونۂ نثر: .... جب اوروں کی طرح امام حسین علیہ السلام پر جبر و زور ڈالا جانے لگا کہ یزید کے خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین ہونے کا اقرار کریں تب البتہ رسولؐ کے نواسہ نے کھلم کھلا حکومت وقت کی مخالفت فرمائی۔ امام حسین علیہ السلام اگر اس موقع پر یزید کی بیعت کر لیتے تو ان کی جان ہلاکت میں نہ پڑتی۔ مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ یزید جیسے فاسق و فاجر اور بے دین کی پیشوائی مستند ہو جاتی۔ یزید نے امام حسینؑ سے بیعت پر اصرار کر کے گویا رسولؐ عربی کے نواسہ کو حق کی موافقت میں آواز بلند کرنے کیلئے اسوقت ابھارا کہ بادشاہِ وقت کی طاقت سے مرعوب ہو کر سارے مسلمان خاموش بیٹھ چکے تھے۔ حسینؑ نے اپنی جان تو ضرور دی مگر اسلام کی لاج رکھ لی[2]

---

[1] طاہر رضوی کے متعلق ذاتی و علمی معلومات ان کا خاندانی "شجرہ" "تذکرۃ الاجداد فی احوال حسین آباد" سے اور مرحوم کی اہلیہ مرحومہ سیدہ صغریٰ سبزواری کی خود نوشت سوانح حیات (غیر مطبوعہ) سے فراہم کی گئی ہیں۔ صغریٰ سبزواری مغربی بنگال میں اردو اہل قلم خواتین میں شاعر، مضمون نگار، اور افسانہ نگار کی حیثیت سے معیاری درجہ رکھتی ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں جب وہ ڈھاکہ تشریف لائی تھیں تو راقم کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مرحومہ ۷ نومبر ۱۹۹۷ء کو نیویارک میں انتقال کر گئیں۔

[2] طاہر رضوی۔ "یا حسینؑ" ہفت روزہ "سرفراز" ڈھاکا۔ ۱۹۵۲ء/۱۳۷۲ھ شہادت نمبر ص ۳۵

Dhaka University Institutional Repository

راحت آرا بیگم

(۱۹۱۰ء - ۱۹۴۹ء)

دبستان اردو میں راحت آرا بیگم محتاج تعارف نہیں۔ وہ بیسویں صدی کے اوائل میں خواتین افسانہ نگاروں میں معیاری درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں کلکتے میں ہوئی[1]۔ والد شمس العلماء کمال الدین تقسیم بھارت سے پہلے مرکزی قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہنے کے علاوہ لکھنؤ میں شعبۂ اردو و فارسی (۱۹۲۲ء - ۱۹۲۴ء) کے بھی پروفیسر رہے عبدالغفور نساخ کے حقیقی بھائی اور بنگال کے مشہور و معروف شخصیت نواب عبداللطیف کی صاحبزادی عفت آرا بیگم ان کی والدہ تھیں۔ شوہر خان بہادر سراج الاسلام، چاٹگام کے معزز خاندان کے فرد تھے۔ راحت آرا بیگم اس علم و ادب کے ماحول میں پروان چڑھیں۔ ان کو بچپن ہی سے علم و ادب کا ذوق تھا۔ راحت آرا کی ابتدائی تعلیم سخاوت میموریل گرلز اسکول کلکتے میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ چلی گئیں اور وہاں بھی انہوں نے حصول علم کی کوشش جاری رکھی[2]۔

ان کا شمار بیسویں صدی کے اوائل ان مسلم خواتین میں ہوتا ہے جنہوں نے بنگال میں تعلیم نسواں کی علمبردار خاتون بیگم رقیہ سخاوت حسین (۱۸۸۰ء - ۱۹۳۲ء) کی آواز میں آواز ملائی۔ ان میں بیگم خجستہ اختر[3] سہروردی، رئیسی[4] بیگم، جمیلہ بیگم، عطیہ نصرت، صغریٰ سبزواری (۱۹۱۳ء - ۱۹۹۷ء) کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں ان خواتین میں بیگم خجستہ اختر اور رئیسی بیگم کو چھوڑ کر کل خواتین ماہنامہ "عصمت" دہلی (مدیر رازق الخیری) اور بنات کی مستقل افسانہ نگار تھیں۔

راحت آرا اپنے وقت کی معتبر افسانہ نگار تھیں۔ ان کی تحریر میں روایت اور جدیدیت کا امتزاج ہے۔ زبان صاف اور عام فہم ہے۔ راحت آرا کے افسانے تخلیقی ہیں۔ ان کا معاشرتی مشاہدہ اور نفسیاتی شعور اچھا تھا۔ ان کے افسانوں میں انہوں نے ان عورتوں کی خانگی پریشانیوں اور مصائب کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

---

[1] راحت آرا بیگم کی افسانہ نگاری اور منتخب افسانے۔ مرتب ڈاکٹر فہمیدہ بیگم دہلی - ۱۹۹۳ء ص ۵-۶

[2] راحت آرا بیگم اور ان کے منتخب افسانے (مرتب فہمیدہ بیگم دہلی ۱۹۹۳ء ص ۵-۶

[3] مولانا عبیداللہ عبیدی کی بیٹی۔ حسین شہید سہروردی (سابق وزیر اعظم پاکستان) کی والدہ تھیں۔ کوکب دری (میلاد نامہ) ان کی مشہور تصنیف ہے۔

[4] رئیسی بیگم شیر بنگلہ اے۔ کے فضل الحق (سابق گورنر مشرقی پاکستان) کی بیٹی اور راحت آرا کی بھانجی ہوتی تھیں۔

Dhaka University Institutional Repository

جو خود غرض اور بدمزاج شوہر کے دباؤ میں سسکتی رہتی ہیں۔ ان کی رومانی کہانیاں بڑی دلچسپ اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ ان میں عصمت چغتائی کی طرح ابتذال نہیں۔ ان کے خیال میں محبت ایک پاک جذبہ ہے جس میں امیر اور غریب کی کوئی تمیز نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے معاشرہ میں پرورش پانے والے گھٹیا خصائل، حرص و لالچ وغیرہ کی بھی مذمت کی ہے۔ راحت آرا کے افسانوں میں عصری واقعات کی بھی نشاندہی نمایاں ہو گئی ہے۔ مثلاً ان کا افسانہ "انقلاب" میں انہوں نے آزادی ہند کی جدوجہد کو موضوع فکر بنایا ہے۔ یہ ان کی مفید کوشش کہی جا سکتی ہے۔ افسانہ "غلطی" میں انہوں نے بدمزاج مردوں کی مذمت کی ہے۔ واقعات کا بیان دیتے ہوئے حقیقت سے کام لیا ہے۔ اس میں انہوں نے شریف متوسط خاندان کے گھریلو مسائل کی ترجمانی ہے جس کی وجہ مردوں کی ناحق ہٹ دھرمی اور بدمزاجی پر عائد ہے۔ راحت آرا مرد و عورت دونوں کو برابر حقوق ملنے کے قائل ہیں۔ اس دور میں عورتوں کے حقوق کے اعتراف میں اس طرح کی کہانی لکھنا یہ ان کی انصاف پسندی اور اچھی ذہانت کی پہچان ہے۔ راحت آرا نے افسانہ اس وقت لکھا جب مختصر افسانہ نگاری بچپن کا دور گزار رہی تھی۔ یعنی اردو ادب میں مختصر افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۵ء سے ہوا۔ اور راحت کے یہ افسانے ۱۹۳۷ء کے دہائی میں لکھے گئے۔ اس نقطہ نظر سے راحت آرا کے افسانے قابل اعتماد ہیں۔ ان کے افسانوں کا پلاٹ مقصدیت کے تحت ہوتا ہے۔ بیان میں تاثر کا ارتکاز ہے۔

راحت آرا کے افسانوں میں ایک خامی یہ رہ گئی ہے کہ انہوں نے دور دیس کے ماحول سے اپنے افسانوں کے کردار اور پلاٹ اخذ کئے ہیں اس سلسلے میں ان کی کہانی "جوئف بریملو" "بدو کی بیٹی" وغیرہ نمایاں ہیں۔ ان کے کسی کسی افسانے میں طوالت کی خامی نے داستان کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن واقعات کی حقیقت بیانی اور زبان کی دلنشینی نے ان خامیوں کو پس پردہ ڈال دیا ہے

راحت آرا نے افسانہ نگاری کے علاوہ شاعری، تراجم اور اصلاحی مضامین بھی لکھے۔ لیکن ان کا بنیادی میدان افسانہ نگاری ہے۔ راحت آرا کو اردو کے علاوہ بنگلا زبان پر بھی دستگاہ حاصل تھی۔ رابندر ناتھ ٹیگور سے انہیں گفتگو کرنے کا شرف حاصل رہا۔ وہ بنگالی ثقافت سے بخوبی واقف تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ترجموں میں اصل کی روح باقی ہے۔

انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی چند نظموں اور مشہور ڈرامہ "ڈاک گھر" کا براہ راست ۱۹۲۷ء میں بنگلا

Dhaka University Institutional Repository

سے اردو میں ترجمہ کیا۔ تراجم ڈراما ان کی بیٹی پروفیسر سلطانہ زماں بیگم کے تعاون سے ڈاکٹر فہمیدہ نے مرتب کر کے شائع کیا۔

راحت آرا کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:۔

انقلاب، (افسانوں کا مجموعہ) مطبوعہ تاج کمپنی لاہور۔

شب کی پکار۔ (افسانوں کا مجموعہ) 〃 〃 〃

بدّو کی بیٹی 〃 〃 〃 〃 〃

بانسری 〃 〃 〃 〃 〃

دلنواز کامریڈ پریس کلکتہ

پریمی (مرتب، حکیم محمد یوسف حسن) نیرنگ بک ڈپو۔ لاہور

راحت آرا بیگم اور ان کے منتخب افسانے (آٹھ افسانوں کا مجموعہ)

مرتب: فہمیدہ بیگم۔ الائیڈ ایجنسی دریا گنج دہلی ۱۹۹۳ء

ڈاک گھر (تراجم) 〃 : فہمیدہ بیگم 〃 〃 ۱۹۹۵ء

راحت آرا بیگم نے ۱۹۴۹ء میں چاٹگام میں اپنی رہائش گاہ میں انتقال کیا اور وہیں پیوند خاک ہوئیں۔[1]

---

[1] بحوالہ پروفیسر سلطانہ زماں بیگم، راحت آرا بیگم کی بیٹی۔ سابق صدر شعبۂ نفسیات ڈھاکا یونیورسٹی۔ ڈھاکے میں مقیم ہیں۔

Dhaka University Institutional Repository

حکیم ناطق لکھنوی

(۱۸۷۸ء — ۱۹۵۰)

نام ابوالعلا سعید احمد۔ تخلص ناطق لقب حکیم ہے۔ ۱۸۷۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ والد آتش کے شاگرد تھے[1] حضرت امیر مینائی اور علمائے فرنگی محل سے ناطق کی قرابت داری تھی۔

ناطق کا قیام بنگلہ دیش میں بہت ہی مختصر رہا۔ وہ جولائی ۱۹۵۰ء میں کلکتہ سے چاٹگام آئے اور ۲۲ ستمبر ۱۹۵۰ء کو انتقال کر گئے[2]۔ شاہ بدر صاحب کے مزار کے قریب بدر پٹی چاٹگام میں سپرد خاک گئے۔ بنگلہ دیش میں انکی سکونت چند دنوں کی رہی۔ لیکن ان کی یاد یہاں کے اربابِ قلم کے ساتھ پیوستہ ہے۔ ساحرِ بنگال جناب رضا علی وحشت کو ان سے بڑی انسیت تھی۔ ان کے شاگرد دلیل ناطقی (چاٹگام) اور صاحبزادے رشید احمد عرصے تک وہاں کے اردو ادبی سرگرمیوں سے منسلک رہے۔

حضرت ناطق کی سب سے مفید خدمت اردو غزل گوئی کے روایتی اسلوب کی تجدید ہے انہوں نے غزل کو تصنع و بناوٹ، مبالغہ آرائی، رعایت لفظی وغیرہ سے پاک کرنے کی سعی کی۔ اس معاملے میں چند احباب میسر آ گئے جو بعد میں "سعید سیالے" کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہ قول اشتیاق حسین مظہر، ناطق لکھنوی اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> میرے خیالات کا ماحصل یہ تھا کہ شعر کا معیار ایسا ہو کہ باپ بیٹی اور بہن بھائی کے روبرو غزل کے اشعار پڑھ سکیں۔ اس معاملے میں لکھنو کے علاوہ ہندوستان کے اکثر شاعروں نے نے مدد دی۔ مثلاً سائل دہلوی، وحشت کلکتوی، شفق عماد پوری، ریاض خیرآبادی کے علاوہ اور بہت سے شعرا نے اس مذاق کا خیر مقدم کیا۔ اور انہی مہذب اصول پر اساتذہ دقیانوسی خیالات، بے کیف مبالغے، اعضائے انسانی کے بکھان گریہ و مرگ کے مضامین کم ہونا شروع ہو گئے۔ رعایت لفظی کی بھرمار کم ہوئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہی خیالات اوروں کے دل میں آئے ہوں بلکہ تعجب نہیں کہ پہلے اس پر کاربند ہوں مگر جہاں تک یاد پڑتا ہے اس کی تحریک قبل از ایں دیکھنے میں نہیں آئی۔[3]

---

[1] اشتیاق حسین "ناطق لکھنوی" ماہنامہ ہم قلم کراچی اکتوبر۔ نومبر ۱۹۶۲ء ص ۱۶-۱۷۔

[2] بنگلہ دیش ڈسٹرکٹ گزیٹرز۔ چٹاگانگ۔ ص ۳۵۹ [3] ماہنامہ ہم قلم اکتوبر، نومبر ۱۹۶۲ء ص ۱۷۔

Dhaka University Institutional Repository

حکیم ناطق فطرتاً اعلیٰ طبع کے انسان تھے۔ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ان کے خیال کی گہرائی اور پاکیزگی ہے اور یہی خوبی انہیں اپنے دور کے شعراء میں ممتاز کرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کے حقائق کی عکاسی ہے جس طرح انسانی زندگی کے بہت سے گوشے ہیں اسی طرح ان کی شاعری میں بھی مختلف قسم کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی ملتی ہے۔ حکیم ناطق نے مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ مسدس "نظم اردو" ہے۔ ستاون بندوں میں اردو نظم و نثر کی پونے سات سو سال کی تاریخ منظوم ہے۔[1]

نمونۂ نظم یہ ہے۔

گفتگو ناطق یہ ہے آغازِ اردو کب ہوا
جستجو یہ ہے کہ ظاہر رازِ اردو کب ہوا
انجمن میں نغمہ آرا سازِ اردو کب ہوا
سازِ بزمِ ہند ہم آوازِ اردو کب ہوا
ایک ہی دھن سنتے سنتے ہو گئے ہیں کان سُن
دعوائے ایجادِ اردو کی لگی ہے سب کو دُھن

نمونۂ غزل:

بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہوں اور اپنے مرکز کو جا رہا ہوں
کہ دل کی ہستی تو مٹ چکی ہے اب اپنی ہستی مٹا رہا ہوں

کفن میں خود کو چھپا لیا کہ تجھ کو پردے کی ہو نہ زحمت
نقاب اپنے لئے بنا کر حجاب تیرا اٹھا رہا ہوں

حکیم ناطق کا دیوان ان کے انتقال کے بعد اقبال عظیم نے مرتب کر کے ان کے بیٹے رشید احمد کے تعاون سے چھپوایا۔

---

[1] وقار راشدی، "بنگال میں اردو" ص ۱۱۵

Dhaka University Institutional Repository

مہ جبیں خمار

(؟ - ۱۹۵۱ء)

نام مہ جبیں۔ تخلص خمار۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا رسالہ "الہلال" کے نائب مدیر مولانا قطب الدین مہ جبیں کے شوہر تھے۔ مہ جبیں کی ماں شمس النہار مخمور اپنے وقت کی اچھی شاعرہ گزریں۔ خمار نے اپنی ماں مخمور سے اصلاح سخن لیا۔ ۲۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو خمار اپنی دو بیٹیاں شہناز عذرا اور شیریں کرشمہ ناز کے ہمراہ کھلنا آئیں۔ وہاں انہوں نے کھلنا ریلوے اسکول میں تقریباً ڈھائی سال تدریسی فرائض بھی انجام دیں۔ ۱۲ اپریل ۱۹۵۱ء میں وہ اچانک انتقال کر گئیں[1]۔ انہیں کھلنا ریلوے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ خمار غزل گوئی کے روایتی اسکول سے منسلک تھیں[2]۔ انہیں اردو روزمرہ اور محاورہ زبان پر گرفت تھا۔

خمار کی غزلیں "ماہ نو" دہلی اور "عصمت" دہلی میں شائع ہوتی رہیں۔ انہوں نے شاعری کے علاوہ اصلاحی مضامین بھی لکھے۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ اور مضامین کا مجموعہ "صحیفۂ فطرت" کے نام سے شائع ہوا۔ بہ قول وفا راشدی "وحشت، جگر، جوش، سیماب، احسان دانش جیسے ماہران فن نے ان کے کلام کی داد دی[2]"۔ مہ جبیں خمار کی بیٹیاں شہناز عذرا اور شیریں کرشمہ ناز بنگلادیش کی قابل ذکر شاعرہ ہیں۔ ان کا تذکرہ اگلے صفحات میں کیا جائے گا۔

نمونۂ کلام یہ ہیں:

گاہ تعمیر تمنا، گہہ شکست مدعا ؎
اس دوراہے پر جو آتا ہے تو چکراتا ہے دل
کیا بتائیں شام تنہائی کی کیفیت خمار
دل کو سمجھاتا ہے غم اور غم کو سمجھاتا ہے دل

---

[1] مہ جبیں خمار کے متعلق مذکورہ معلومات ان کی بیٹی شیریں کرشمہ ناز سے فراہم کیا گیا۔ جو ڈھاکا میں مقیم ہیں۔

[2] وفا راشدی۔ مغربی بنگال میں اردو۔ ص ۲۶۰

Dhaka University Institutional Repository

وحشت کلکتوی

(۱۸۸۱ء - ۱۹۵۶ء)

نام سید رضا علی ۔ وحشت تخلص ۔ ۱۹۳۱ء میں سرکار برطانیہ کی طرف سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ لسان الملک، امام الشعراء، ساحر بنگال لقب تھا۔ وحشت ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام مولوی شمشاد علی تھا[1]

وحشت کی تعلیم مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شعبہ انگریزی میں ہوئی ۔ ۱۸۹۸ء میں یہیں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے یونیورسٹی کی کوئی سند حاصل نہیں کی۔ ان کے فطری رجحان نے مطالعہ کتب پر مائل کیا جس سے ان کے علمی معلومات وسیع ہوئے اور انہوں نے امتیازی قابلیت حاصل کی۔ اردو، فارسی اور انگریزی پر انہیں دستگاہ تھی

پہلے گورنمنٹ آف انڈیا امپریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ میں ان کا تقرر ہوا۔ جہاں اس دفتر کے شعبۂ فارسی میں چیف مولوی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جب اسلامیہ کالج کلکتہ قائم ہوا تو وہاں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں ایک سالانہ مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جس نے بڑی شہرت حاصل کی اور توسیع اردو میں کارفرما رہا۔ پنشن ہو جانے کے بعد کوئی چار سال تک لیڈی برابورن کالج کلکتہ میں اردو و فارسی کا درس دیتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں حالات سے مجبور ہو کر سابق مشرقی پاکستان آئے اور ڈھاکے میں سکونت اختیار کی[2] وحشت کو کلکتہ چھٹنے کا بڑا غم رہا۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں اس طرح کیا۔

زمینِ ڈھاکا نے کی قلب پر افسردگی طاری
ہوا خلوت نشیں میں اور شوق انجمن چھوٹا
وطن اور وہ بھی کلکتہ غضب تھا چھوٹنا اس کا
قیامت ہو گئی وحشت سے وحشت کا وطن چھوٹا

وحشت کی شاعری روایتی شاعری ہے۔ ان کے اشعار سے دہلویت ٹپکتی ہے جس کے موضوعات تمام تر

---

[1] وحشت "خود نوشت سوانح حیات" یادگار وحشت۔ مجلہ بتقریب وحشت صدی ۔ ۶ ربن اسٹریٹ کلکتہ ص ۱۸
[2] وحشت ۔ یادگار وحشت ص ۱۹

Dhaka University Institutional Repository

داخلی ہیں۔ وہی حسن وعشق اور نازِ حسن کے حسین افسانے، انقلاب زمانہ کی شکایتیں، اپنی مجبوریاں، متصوفانہ خیالات، وفلسفۂ غم وغیرہ۔ گرچہ اس دور میں حالی کی قومی شاعری اور حسرت کی سیاسی شاعری شہرت پا چکی تھی۔ لیکن وحشت کی قدامت پرستی نے ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں جدید رنگ کو اپنانے نہ دیا۔ وہ صرف "غالب دوراں" بننے کی کوشش میں لگے رہے اور ایک حد تک کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن غالب اپنے طرز کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ غالب کے طرز کی تقلید شعراء کرتے رہے لیکن ان کی جدت طرازی، تخیل کی بلندی اور ندرت بیان تک کوئی نہ پہنچ سکا۔

وحشت کے یہاں غالب کا انداز بیان، مومن کی ترکیبیں، شاعرانہ تعلی، میر کی سادگی و پرکاری سب ہی خصوصیات نمایاں ہیں۔ لیکن ان کا ایک انفرادی رنگ ہے۔ انہوں نے نیا طرز بھی ایجاد کیا۔ وہ اس کا اعتراف خود کرتے ہیں۔

ہماری طبع جب ہوتی ہے جدت آفریں وحشت
نیا انداز فنِ شعر میں ایجاد ہوتا ہے

وحشت غالب کے مقلد اور میر سے متاثر تھے۔ جس کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔

کلام میر پڑھ کر ہو اہوں نکتہ ور وحشت
تلمذ ہے اسی استاد کا بزم سخنداں میں

وحشت نے اپنی آخری عمر سابق مشرقی پاکستان میں گزاری۔ قیام مشرقی پاکستان کے دوران ان کی شاعری جدید اور ترقی پسند شاعری سے متاثر نظر آتی ہے۔ اس دور میں وہ اپنے قدیم روایتی طرز سے ہٹ کر جدید لہجے میں شاعری کرتے ہیں۔ اس زمانے میں ان کی شاعری میں حب الوطنی، سیاست وغیرہ کی جھلک نمایاں ہو گئی ہے یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اس دور میں حالی و آزاد کی چلائی ہوئی تحریک ان پر اثر کر گئی ۔ انہوں نے قومی نظمیں بھی لکھیں جو ان کی قومی دردمندی کی ترجمان ہیں۔ وحشت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں فکر وخیال کی ترقی پسندانہ خصوصیات نمایاں ہیں۔

ہے ایک مخصوص مقصد زندگی کا، یہ نہیں غافل
کہ اپنی عمر کو جس طرح تو چاہے، بسر کر دے

Dhaka University Institutional Repository

انسانی زندگی وحشت کے خیال میں کسی خاص مقصد سے منسلک ہے اسے رائیگاں کرنے کے وہ قائل نہیں۔ مذکورہ شعر اس خیال کی نشاندہی کرتی ہے۔ کام بگاڑتا انسان خود ہے اور مقدر کو موردِ قرار دیتا ہے۔ اس حقیقت کو وحشت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

جب اپنے ہاتھوں میں نے بگاڑے ہوں اپنے کام
پھر کیا محل رہا گلۂ روزگار کا

یہ شعر وحشت کی حب الوطنی کی غماز ہے۔

جو قدر کی وطن نے دل پہ ہے اپنے نقش
کیا یادگار لے کے چلے ہیں وطن سے دور

وحشت بلاشبہ روایتی شاعر تھے۔ لیکن ان کے آخری ایام کے اشعار انقلاب زمانہ سے متاثر نظر آتے ہیں وحشت کا دیوان اول ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تو مولانا الطاف حسین حالی نے اعتراف کیا کہ وحشت مقلدِ غالب ہیں۔ چند سطور بطور مثال ملاحظہ ہوں۔

"مرزا صاحب کے ان بلند اور اچھوتے خیالات کو جن میں وہ تمام معاصرین سے ممتاز تھے مستثنیٰ کر لیا جائے تو آپ کے اردو دیوان کو بلاشائبۂ تصنع ان کے کلام کا نمونہ قرار دینا ہرگز داخل مبالغہ نہیں ہو سکتا [1]

وحشت کا دوسرا دیوان "ترانۂ وحشت" کے عنوان سے ۱۹۵۲ء میں لاہور سے شائع ہوا اس میں ان کا پہلا دیوان بھی بطور ضمیمہ شامل ہے [2]

وحشت نے شاعری کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "مضامین وحشت" کے نام سے مغربی بنگال اردو اکاڈمی سے شائع ہوا۔ جسے جمال احمد صدیقی نے مرتب کیا۔

---

[1] مولانا حالی کے خط۔ "دلربا" ڈھاکا اگست ۱۹۵۳ء ص ۱۳

[2] وحشت۔ "ترانۂ وحشت" دیباچہ

Dhaka University Institutional Repository

محمد سلیمان واصف بنارسی

(۱۹۱۴ء - ۱۹۵۷ء)

محمد سلیمان نام اور واصف تخلص تھا۔ والد کا نام مولوی عبدالشکور۔ بنارس کے محلے چاہ مہمان میں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت بڑے بھائی آصف بنارسی کے ساتھ یکساں ہوئی تھی۔ واصف نے شاعری۔ مقالہ نگاری افسانہ، ناول وغیرہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کا بنیادی میدان افسانے، ناول اور مضامین ہیں۔

وفا راشدی ان کی نثری خدمات کے متعلق لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ ایک ناول "نخچیر محبت" لکھا۔ ۱۶۰ صفحے پر مشتمل لکھا۔ جو طبع ہو کر تین سال کے اندر نایاب ہو گیا ۔ عصر جدید کلکتہ میں اعزازی طور پر مضامین لکھتے رہے۔ "افکار پریشاں" کے تحت جتنے بھی مضامین شائع ہوئے واصف ہی طبع زاد تھے"۔[1]

ان کے مضامین ہفتہ وار "نقاش" کلکتہ "ماہ تمام" کلکتہ "عصر جدید" کلکتہ میں شائع ہوتے رہے۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۵۷ء کو ڈھاکے ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ اور عظیم پور قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔[2]

سابق مشرقی پاکستان آنے کے بعد انہوں نے "پاکستان جولیس سیزر" کے عنوان سے ایک ناول اور چند مزاحیہ مضامین بھی لکھے۔ ان کا ناول "نخچیر محبت" یا "حسن پاربتی" تقسیم ہند سے پہلے لکھا گیا۔ جو قارئین میں مقبول رہا۔

واصف کو شاعری کا بھی شوق تھا۔ علامہ وحشت کلکتوی کے عزیز شاگردوں میں واصف کا شمار ہوتا ہے۔ انکی شاعری میں روایت اور جدیدیت کا امتزاج ہے۔

نمونۂ کلام:۔

ہوا جی یک بیک بیزار سب کا پارسائی سے
یہ کیا شے لا کے تو نے بزم میں پیر مغاں رکھدی

آجاؤ کہ مل بیٹھ کے اک تصفیہ کر لیں
تم عہد جفا کا کرو، ہم عہد وفا کا

---

[1] وفا راشدی۔ بنگال میں اردو ص ۲۷۷

[2] بحوالہ شعیب عظیم صاحب

Dhaka University Institutional Repository

خواجہ محمد اسمٰعیل ذبیح

(۱۸۸۱ء ـ ۱۹۵۹ء)

مکمل نام محمد اسمٰعیل ۔ خاندانی لقب خواجہ اور ذبیح تخلص ہے ۔ ان کے جد عتیق اللہ کشمیر سے ہجرت کر کے مشرقی بنگال آئے تھے ۔ والد کا نام خواجہ سلیم اللہ تھا ۔ اسمٰعیل ذبیح کی پیدائش ۱۸۸۱ء میں ڈھاکے میں ہوئی ۔ بارہ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے ۔ نواب احسن اللہ نے اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور خاندانی اصول و ضوابط کے مطابق پرورش کی ۔ اسمٰعیل جس ماحول میں پروان چڑھے وہ اردو شعر و ادب کا آماجگاہ تھا ۔ اس ماحول نے اسمٰعیل کو اردو فارسی شاعری کی طرف مائل کیا تھا ۔ وہ پابندی سے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور شوقیہ شعر کہتے تھے ۔ خواجہ محمد اسمٰعیل کی اردو خدمات کے بارے میں اقبال عظیم لکھتے ہیں ۔

"خواجہ صاحب بنگال کی ان چند مغتنم ہستیوں سے ایک ہیں جو اس حصۂ ملک میں اردو کو زندہ رکھنے کے لئے دامے، درمے، قدمے، سخنے پیش رہے ۔ چنانچہ جس زمانے میں حکیم حبیب الرحمٰن صاحب انجمن اردو مشرقی بنگال کے معتمد اعلیٰ تھے، خواجہ محمد اسمٰعیل ذبیح نے بھی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۲ء نائب معتمد کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دی ہیں ۔ اس سلسلے میں یہاں کے وہ ماہانہ مشاعرے بھی فراموش نہیں کئے جا سکتے جو ۱۹۳۶ء تک اسی انجمن کے تحت پابندی کے ساتھ منعقد ہوتے رہے ۔ ان مشاعروں میں خواجہ بیدار بخت، ڈاکٹر عندلیب شادانی، مرزا فقیر محمد، اور کبھی کبھی وحشت کلکتوی شرکت فرماتے تھے ۔ اور ان کے گلدستے "دیدۂ حیرت" کے عنوان سے برابر شائع ہوتے رہے[1]"

خواجہ محمد اسمٰعیل ذبیح کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا ۔ ان کے اشعار ادبی رسائل میں بھی کم ملتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے ان کے احباب کے پاس چند کلام منتشر حالات میں تھے ۔ اب وہ بھی نایاب ہو چکے ہیں ۔ خواجہ محمد اسمٰعیل، خواجہ بیدار بخت بیدار سے مشورۂ سخن لیتے تھے ۔ خواجہ اسمٰعیل، داغ دہلوی اور حکیم مومن خاں دہلوی کے تابعین کا مقام مل سکتا ہے ۔ ان کے

---

[1] مشرقی بنگال میں اردو ص ۲۳۷

Dhaka University Institutional Repository

زیادہ تر اشعار مومن دہلوی کے رنگ میں ہیں۔

نمونۂ کلام۔

ایک نظارے کی حسرت خوب ہے
دور کی صاحب سلامت خوب ہے
میرے خط میں غیر کو لکھّا سلام
واہ یہ طرزِ کتابت خوب ہے
آئینہ ہر وقت ہے پیشِ نظر
سچ ہے منہ دیکھی محبت خوب ہے
یہ بھولی بھالی باتیں تمہاری غضب کی ہیں
دانا بکار خویش و وہ نادان تمہیں تو ہو
کیوں نام سن تیرا جھکا لی کسی نے آنکھ
تجھ کو اگر ذبیح کوئی جانتا نہیں

خواجہ محمد اسمٰعیل ذبیح نے ۷ جولائی ۱۹۵۹ء کو ڈھاکے میں انتقال کیا۔ ۷ جولائی ۱۹۵۹ء کو روزنامہ مورننگ نیوز (انگریزی اخبار) میں مرحوم کے متعلق تفصیلی بیانات شائع ہوئے۔ جن میں چند سطر حسب ذیل ہیں۔

Khwaja Ismail, a well-known Scholar, Public figure and Sportsman, died yesterday after a brief illness. He was well versed in Persian and Arabic. He was a talented poet.

Dhaka University Institutional Repository

سیّد شرف الدین شرفؔ الحسینی

۱۸۷۶ء - ۱۹۶۰ء

مکمل نام سید ابوالفتح شرف الدین شرفؔ تخلص۔ بہ معروف صوبا میاں۔ ان کے آبا و اجداد سادات الحسینی اور مدنی تھے۔ شرف الحسینی جد جہانگیر بادشاہ کے دور میں ڈھاکے میں آکر آباد ہوئے۔ سید شرف الحسینی کے والد سید فقیہہ الدین کو عربی، فارسی اور اردو زبان پر دستگاہ حاصل تھی۔ شرف الحسینی کی والدہ فاطمہ خانم نواب سید محمد آزاد کی سگی خالہ زاد بہن تھیں۔

شرف الحسینی کی پیدائش ۱۸۷۶ء میں ڈھاکے میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد شرفؔ کے ماموں نواب سید محمد آزاد (۱۸۵۰ء - ۱۹۱۶ء) انہیں پٹنہ لے گئے۔ اس زمانے میں عظیم آباد علم و ادب کا آماجگاہ تھا۔ یہاں انہیں شادؔ عظیم آبادی، نواب نصیر حسین خیالؔ، عبدالغفور شہبازؔ جیسے نامور شعراء و ادباء کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ شرف الحسینی کے ہمعصروں میں نواب سائلؔ دہلوی (۱۸۶۸ء - ۱۹۴۵ء) آرزوؔ لکھنوی (۱۹۵۱ء) صفیؔ لکھنوی (۱۹۵۰ء) بیخودؔ دہلوی وغیرہ سے ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ شروع میں وہ اپنی شاعری کی اصلاح نواب سید محمد آزاد سے لیتے تھے۔ آزاد کے انتقال کے بعد انہوں نے عبدالغفور شہبازؔ کی شاگردی اختیار کی۔ شرفؔ اکثر دہلی آگرہ لکھنؤ تشریف لے جاتے تھے انہیں میر انیسؔ کے جانشینوں سے کلام سننے کا شرف حاصل ہوا۔ ماہنامہ ساقی، مشرقی پاکستان نمبر میں وحید قیصر ندوی کا یہ قول صحیح نہیں کہ "شرفؔ صاحب کو میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کی زبان سے مرثیہ سننے کا موقع ملا۔ کیونکہ میر انیسؔ (۱۸۰۳ء/۱۸۷۴ء) شرف صاحب کی ولادت سے دو سال قبل ۱۸۷۴ء میں اور مرزا دبیرؔ ایک سال قبل ۱۸۷۵ء میں انتقال فرما چکے تھے۔

شرفؔ نے نوحہ، مرثیہ، سلام، نظم، غزل، قصیدہ، رباعی، سب ہی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ ان کی شاعری میں دہلوی اور لکھنوی اسکول کا امتزاج ہے۔ ان کی غزلیں دہلی کے داخلی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مرثیہ نگاری اور قصیدہ گوئی میں ان کے یہاں لکھنوی اسکول کی چھاپ ہے۔ غزل میں انہوں نے غالبؔ اور داغؔ دہلوی کی پیروی کرنے

۱؎ نواب سید محمد آزاد رسالہ اودھ پنچ (۱۸۷۷ء - ۱۹۱۲ء) کے مشہور نامہ نگار تھے۔ اقبال عظیم نے شرف الحسینی کو "نواب سید محمد آزاد کے سگے بھانجے" لکھا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ بحوالہ فاطمہ بیگم، ڈھاکے میں مقیم شرف الحسینی کی بیٹی۔ ۲؎ ساقی، مشرقی پاکستان نمبر ص ۹۸

Dhaka University Institutional Repository

کی سعی کی ہے۔ مرثیہ گوئی میں میر انیس کا تتبع کیا ہے۔ قصیدہ گوئی میں ان کا زور بیان اور عالمانہ رنگ مرزا محمد رفیع سودا کے طرز پر ہے۔ ڈھاکہ کے قصیدہ گو شاعروں میں ان کا درجہ برتر ہے۔ ڈھاکہ میں ان کے ہمعصر شعراء میں قصیدہ گوئی میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں۔ ان کی شاعری میں مجموعی طور پر روایات کا احترام، صحت زبان، پُر لطف انداز بیان کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ شرف کا زمانہ وہ ہے جب بنگال کی سیاسی زندگی میں ایک انقلاب برپا تھا۔ جس کے اثرات مرشد آباد، کلکتہ، ڈھاکا میں نمایاں تھے۔ ان سیاسی افراتفری نے بنگلادیش کو نذرل جیسا باغی شاعر عطا کیا۔ لیکن شرف ان انقلابی و سیاسی ماحول سے بے بہرہ رہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو غم جاناں اور کچھ مذہبی خیالات تک محدود رکھا۔

نثر میں ان کی ایک کتاب "شہادتِ علیؑ" کے عنوان سے شائع ہوئی جو مذہبی نوع کی کتابچہ ہے۔ نثر میں ان کا طرز تحریر رواں اور پُر لطف ہے۔ شرف کا بنیادی میدان شاعری ہے۔ نثر میں انہوں نے شوقیہ مضامین لکھے۔

شرف کی شعری تخلیقات حسب ذیل ہیں:

(۱) گلستانِ شرف۔ شعری مجموعہ ستارہ ہند لمیٹڈ کلکتہ۔ ۱۹۳۷ء۔ اس میں غزل، قصیدہ، مسدس، رباعی، سلام، مرثیہ وغیرہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔

(۲) نالۂ شرف۔ ستارہ ہند لمیٹڈ کلکتہ ۱۹۳۹ء

نالۂ شرف قصیدوں کا مجموعہ صرف ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۳) دلستان شرف۔ ۲۶۲ صفحات پر مشتمل شعری مجموعہ ۱۹۵۹ء میں ترتیب پا چکا ہے۔ یہ اب تک غیر مطبوعہ ہے اس پر مقدمہ شیر بنگلا ۔ کے فضل الحق نے لکھا ہے۔

شرف الحسینی کے یہ اشعار غالب کے رنگ میں ہیں۔

مدت ہوئی نثارِ دل و جاں کئے ہوئے
سمٹیں گے کب یہ بال پریشاں کئے ہوئے

رکھا نہ دل میں کچھ بھی تری یاد کے سوا
آباد گھر کو بیٹھا ہوں ویراں کئے ہوئے

Dhaka University Institutional Repository

انیس کے طرز میں شرف الحسینی کے مرثیے کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

غمِ شاہ کرتو بیاں کھینچتے ہیں
یہ رنج و ستم انس و جاں کھینچتے ہیں
بہ فیضِ انیس آج رزمِ سخن میں
شرف ہم بھی تیغِ زباں کھینچتے ہیں

شرف نے سودا کے طرز پر آئمہ و اہلِ بیتِ رسول ؐ اور رؤسا کی شان میں قصیدے لکھنے کی سعی کی ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ سودا قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ ان کی جودتِ طبع اور زورِ تخیل تک آج تک کوئی پہنچ نہ سکا۔ لیکن عالمانہ فکر کے شاعر شرف اپنے وقت کے یکتا ہیں۔ شرف کے قصیدے قابلِ ستائش ہیں۔ ان عظیم شعراء کا تتبع کرنے کے باوجود شرف الحسینی کا انفرادی رنگ برقرار ہے

بطور مثال قصیدے کے اشعار: کیا ہو مخلوق سے خلاق کا شکرِ نعمت
سارے عالم کے لئے جس کا نبی ہے رحمت
اور یوں آیتِ تطہیر میں ارشاد ہوا
پاک ہے میرا نبی ؐ اور نبی کی عترت
واسطہ حضرت آدم نے دیا جب ان کا
توبہ مقبول ہوئی جوش میں آئی رحمت

(غیر مطبوعہ دبستانِ شرف)

Dhaka University Institutional Repository

ارشد کاکوی

(۱۹۳۰ء - ۱۹۶۳ء)

مکمل نام سید رشید الرحمٰن۔ ارشد تخلص۔ ۱۹۳۰ء میں موضع کاکو، ضلع بہار میں پیدا ہوئے[1]۔ والد شاہ عطاء الرحمٰن کاکوی گورنمنٹ کالج مظفر پور میں شعبہ اردو و فارسی کے صدر تھے۔ شعر گوئی کا شغف حاصل تھا۔ عطاؔ تخلص کرتے تھے۔ ارشد کاکوی نے پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرس کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کے ناسازگار حالات سے مجبور ہو کر سابق مشرقی پاکستان آئے اور شعبہ اردو و فارسی سے ۱۹۵۱ء میں اردو میں ایم۔ اے کی سند حاصل کرنے کے بعد وکٹوریہ کالج کومیلا میں اردو لکچرر کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا[2]۔ بعد میں قائداعظم کالج ڈھاکا (موجودہ سہروردی کالج) اردو میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے

ارشد کو بنگلا دیش کے اردو ارباب قلم میں شاعر، مضمون نگار اور صحافی کی حیثیت سے تعارف حاصل ہے ان کے متعدد مضامین اور نظمیں "مہر نیمروز" کراچی۔ ماہنامہ "ندیم" گیا، ماہنامہ "ترقی" بنگور ماہنامہ "آجکل" دہلی۔ ماہنامہ "خاور" ڈھاکا روزنامہ "پاسبان" ڈھاکا میں شائع ہوتے رہے۔ ارشد کاکوی کا سب سے مقید کارنامہ ماہنامہ "ندیم ڈھاکہ" کی اشاعت ہے انہوں نے ۱۹۶۱ء میں اس ماہنامے کا اجرا کیا۔ اس کے صرف بارہ شمارے شائع ہوئے۔ برصغیر کے اردو قارئین میں اس کو بڑی مقبولیت حاصل رہی۔ یہ رسالہ اپنی افادیت کے اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ خاص کر "ندیم" کا نذر الاسلام نمبر ارشد کاکوی کی بلند نظری اور اعلیٰ ذوقی کا آئینہ دار ہے۔ یہ خصوصی رسالہ اردو و بنگلا دونوں ادب کے لئے مفید ہے۔

ارشد کاکوی "سنگ و سمن" کے عنوان سے اپنا مجموعہ کلام اور "آج کے نقاد" کے عنوان سے تنقیدی ادب سے متعلق ایک کتاب بھی ترتیب دے رہے تھے۔ لیکن شومئی قسمت سے یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔ صرف تیس[3] برس کی عمر میں خون کے کینسر جیسے لاعلاج مرض میں مبتلا ہو کر اپنے والد کے پاس علاج کی غرض سے پٹنہ گئے۔ ۱۸ فروری ۱۹۶۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ .....

---

[1] مشرقی بنگال میں اردو ص ۲۰۴ [2] بنگال میں اردو ص ۲۱۰

Dhaka University Institutional Repository

ان کے انتقال کے بعد ان کی ذاتی لائبریری ڈھاکا یونیورسٹی کی لائبریری کے سپرد کر دی گئی۔ ارشد کی لائبریری اے۔ آر۔ سی (A - R . C) کلکشن کے نام سے ڈھاکا یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ اردو قارئین و محققین کو کو اس ذخیرے سے بڑا استفادہ حاصل ہوتا رہتا ہے۔

ارشد کاکوی کے شعری و نثری تخلیقات برصغیر کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔

شاہد احمد دہلوی ماہنامہ "ساقی" کراچی مشرقی پاکستان نمبر میں ارشد کاکوی کی بے وقت موت پر اظہار غم کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے جن نوجوان ادیبوں نے واقعی کام کیا اور نام پیدا کیا۔ اس میں ارشد کاکوی کا نام سرفہرست تھا۔ وہ نظم اور نثر دونوں پر یکساں حاوی تھے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی جو مشرقی پاکستان میں اردو کے سینیارٹی میں ارشد کاکوی ان کے لائق اور چہیتے شاگرد تھے۔ خوش ذوق ادیبوں کی انہوں نے ایک انجمن بھی بنا رکھی تھی۔ ان کے دم سے ڈھاکہ کے اردو حلقوں میں خوب رونق رہتی تھی۔ مرحوم نے اپنا ایک اردو ماہنامہ ندیم بھی ڈھاکا سے شائع کیا جو کچھ عرصہ بعد ناقدری کے ہاتھوں بند ہو گیا تھا۔ دوبارہ جاری کرنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ بیمار رہنے لگے۔ ...."

ارشد کاکوی کی شاعری صاف ستھری اور معیاری ہے۔ وہ عندلیب شادانی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔

ان کے اشعار میں جابجا شادانی کا رنگ عیاں ہے

نمونۂ غزل :

ساز سراپا، سوز مجسم حسن کی دنیا عشق کا عالم
آؤ دلوں میں آگ لگا دیں سرد ہے محفل چھیڑ دیں سرگم

نوٹ: ارشد کاکوی کے انتقال کے بعد ان کے والد نے اردو رسالہ "سفینہ" کا ارشد کاکوی نمبر پٹنہ سے شائع کیا تھا۔ انہوں نے ارشد کاکوی کا شعری انتخاب بھی شائع کیا۔

[1] شاہد احمد دہلوی (مدیر ماہنامہ "ساقی" کراچی) ساقی مشرقی پاکستان نمبر ۱۹۶۳ء ص ۲۸۸

Dhaka University Institutional Repository

تاروں بھری یہ رات چرا لیں آؤ کہ ہم مہتاب چرا لیں
ناؤ ادھر یہ گیسو پُرخم، ایک ذرا یہ باہوں کے خم
آنکھوں میں کاجل مانگ میں افشاں روئے منور عارضِ تاباں
ابروِ شفق اور چاند ستارے عرشِ زمیں پر آج بہم
وصل کی شب اک طرفہ تماشا، عشق بھی شاداں حسن بھی فرحاں
ہائے مگر اک خوفِ سحر سے عشق بھی سوزاں حسن بھی پُرنم
ہجر کی تنہا چاندنی راتیں، جیسے بھری برسات کی راتیں
بادِ تمنّا برقِ تصور، یادوں کے بادل اشکوں کی چھم چھم
دل سے انہیں مجبور سمجھ کر دیکھئے کیسے روٹھے ہوئے ہیں
تاکہ وہ خود ہی آ کے منائیں، آپ کو ارشد ماں گئے ہم[1]

نمونہ نثر :

"نئی نئی باتیں سوچنا اور کہنا ہر فرد کے بس کی بات نہیں۔ غم اور خوشی نیز ان کے اثرات سے کوئی محروم نہیں۔ کم و بیش کا فرق ہے۔ یہ ضرور ہے کہ قدرت کی طرف سے کسی کو نسبتاً زیادہ ودیعت کیا گیا ہے کسی کو کم۔ تاثیر اور شدت محسوسات سے پیدا ہوتی ہے۔ جتنی لمبی ہو کر اٹھتی ہے اتنی ہی لمبی سانس جاتی ہے۔ بیان کے پہلو اسلوب کے گوشے اور طریقۂ اظہار کے زاویئے بدلتے ہیں اور یہی چیزیں "رنگ و بوئے دیگر است" پیدا کرتی ہیں۔ دل سے جو بات نکلتی ہے دل میں گھر کرتی ہے"[2]

---

[1] ادبی رسالہ "جوئبار" (سالنامہ) جون ۱۹۶۵ء ص ۶۵ (زیر اہتمام اردو انجمن شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی۔ ڈھاکا

[2] ماہنامہ "دلربا" ڈھاکا۔ ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۲۰

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر عبدالحق

(م ۔ ۱۹۶۴ء)

عبدالحق کا آبائی وطن کومیلا تھا[1]۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں عالیہ مدرسہ کلکتہ سے "ممتاز المحدثین" کی سند حاصل کی[2]۔ شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے ۱۹۵۱ء میں بی۔ اے آنرز اردو کا امتحان دیا اور اوّل درجے میں اوّل آئے۔ اسی یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں انہوں نے اردو ایم۔ اے کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد راجشاہی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا

۱۹۶۱ء میں انہوں نے "فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈھاکا یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ جنوری یا فروری ۱۹۶۴ء میں راجشاہی سے ڈھاکا آتے ہوئے ہیلی کاپٹر کے ہوائی حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔ مرحوم کا تحقیقی مقالہ (غیر مطبوعہ) جامعہ ڈھاکا کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ سادہ اور عام فہم زبان میں نہایت خوشخط مقالہ ہے۔ یہ مقالہ ایک مقدمہ، تین ادوار اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے دکن کے عادل شاہی دور (اٹھارہویں صدی) سے ۱۸۸۷ء تک اردو اصناف سخن پر فارسی کے اثرات کا سیر حاصل مدلّل جائزہ پیش کیا ہے۔ اصناف شاعری کی ہیئت، اسلوب، اور خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے فارسی اور اردو اشعار کا موازنہ ناقدانہ انداز میں کیا ہے۔ یہ مقالہ اردو و فارسی تشنگانِ ادب کے لئے نہایت مفید ہے۔ چند سطور بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

> "رباعی اہل فارس کی ایجاد ہے۔ شعرائے فارس نے اسے ترقی دی۔ فارسی میں کوئی نامور شاعر ایسا نہیں جس نے رباعی نہ کہی ہو۔ بلکہ عمر خیام، شیخ عبداللہ انصاری، ابوسعید ابوالخیر، باباطاہر، ہمدانی و سبحانی استرآبادی وغیرہ کی شہرت و مقبولیت کا باعث ہی ان کی رباعیاں ہیں۔ اس دور کے شعرا نے فارسی کی تقلید میں رباعیاں کہکر اردو کو اس صنف سے روشناس کرایا۔"

---

[1] پروفیسر عبداللہ کا زبانی بیان

[2] ایضاً

Dhaka University Institutional Repository

دلیل ناطقی

(۱۹۲۱ - ۱۹۶۶ء)

نام دلیل الرحمٰن۔ قلمی نام دلیل ناطقی اور تخلص دلیل تھا۔ پیدائش ۱۹۲۱ء میں کلکتے میں ہوئی۔[1] حکیم ناطق لکھنوی سے شرف تلمذ کا فخر حاصل رہا اور اس مناسبت سے نام کے ساتھ ناطقی لکھتے تھے۔ تقریباً ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک حکیم ناطق سے مشورہ سخن لیتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد چاٹگام آئے اور وہاں سکونت اختیار کی۔ سرکاری ادارے میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ ملازمت کی ذمہ داری سنبھالنے کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی مصروفیتوں سے بھی منسلک رہے۔ موصوف نے چاٹگام ہی میں انتقال کیا۔[2]

دلیل ناطقی سابق مشرقی پاکستان کے مقبول غزل گو شعراء میں تھے۔ فن غزل گوئی میں وہ عابد دانا پوری، رضا جعفری، اصغر گورکھپوری وغیرہ کے ہمنوا کہے جاتے ہیں۔ انہوں نے سابق مشرقی پاکستان میں اردو غزل کے جدید رجحان کو اپنانے کی کوشش کی۔ دلیل نے روایت سے رشتہ برقرار رکھ کر جدید روش کو قابل قبول سمجھا اور اس فن میں کبھی کبھی اپنے ہم عصر (اردو داں) شعراء کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔ ان کی غزلوں میں غنائیت کے علاوہ رنگ تغزل بھی نمایاں ہیں۔ طرز بیان صاف ستھرا اور دلنشیں ہے۔

نمونہ کلام :

تم نے دیکھی ہے فقط دور سے کلیوں کی ہنسی
ہم نے جلتے ہوئے پھولوں کا جگر دیکھا ہے

جلوہ گاہیں لاکھ تھیں اہلِ نظر کوئی نہ تھا
طالبِ دیدار سب تھے دیدور کوئی نہ تھا

مجھ کو ہر ہر گام پہ منزل نے خود آواز دی
وہ مسافر ہوں کہ جس کا راہبر کوئی نہ تھا

جانے پھر بھی کیوں غلط فہمی ہوئی ان کو دلیل
میں یہی تھا گویا میرا ہمنوا کوئی نہ تھا

دلیل کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ان کے اشعار ماہنامہ "ندیم" ڈھاکا ماہنامہ "قلم کار" ڈھاکا ماہنامہ "دلربا" ڈھاکا وغیرہ میں شائع ہوتے تھے

[1] مشرقی بنگال میں اردو۔ ص ۳۹۸ - [2] ڈھاکے میں مقیم ان کی شریک حیات کرشمہ ناز شیریں کا بیان

Dhaka University Institutional Repository

سعد مُنیر

(۱۹۶۷ء - م)

اصل نام سعد میر الدین۔ قلمی نام سعد منیر سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش کانپور میں ہوئی تھی[1]۔ کلکتے میں تعلیم حاصل کی۔ اردو و فارسی ایم۔ اے کے اعلیٰ اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سابق مشرقی پاکستان آئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ ان کا پہلا تقرر اردو لکچرر کی حیثیت سے سرکاری کالج سلہٹ میں ہوا۔ بعد میں چاٹگام سرکاری کالج میں تبادلہ ہو گیا۔ وہاں وہ ترقی کر کے پروفیسر کے عہدے تک پہنچے اور شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

سعد منیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ کہ انہیں اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں پر دستگاہ حاصل تھی۔ انہوں نے سابق مشرقی پاکستان میں اردو اور بنگلہ کی اہمیت کے پیش نظر ترجمہ نگاری کے شغف کو اپنایا اور اسے کامیابی کے ساتھ نباہنے کی کوشش کی۔

مسعود شہریار، سعد منیر کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مشرقی پاکستان میں جہاں اور لوگوں نے افسانہ نگاری اور شاعری کی صنف کو اپنایا۔ انہوں سیاسی، لسانی اور ادبی فضا کے پس منظر میں بنگلہ سے اردو میں ترجمہ کرنے کے کام ہی کو مناسب سمجھا[2]"

ان کے تراجم نثری شکل میں شائع ہوئے۔ افسانہ ان کا مخصوص موضوع اور شوکت عثمان[3] ان کے محبوب فنکار تھے۔ سعد نے شوکت عثمان کے علاوہ دوسرے بنگالی افسانہ نگاروں کے افسانوں کو بھی اردو کا جامہ پہنایا۔ وہ ایک باشعور مترجم تھے۔ ان کے تراجم مختلف ادبی رسائل مثلاً "ساقی" کراچی "مہرِ نیمروز" کراچی "ماہ نو" کراچی "کہکشاں" (چاٹگام سرکاری کالج) وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔

---

[1] روزنامہ پاسبان۔ ڈھاکا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۷ء

[2] مسعود شہریار ۔ ص ۳۳۶

[3] شوکت عثمان، بنگلہ دیش کے مشہور مختصر افسانہ نگار اور کہانی نویس تھے۔

Dhaka University Institutional Repository

سعید میر نے متعدد بنگلہ لوک کہانیوں کو بھی اردو میں منتقل کیا۔ "ساقی" کراچی "مشرقی پاکستان نمبر" میں لوک کہانیوں سے متعلق ان کے ایک مضمون اور آٹھ لوک کہانیوں کے تراجم شائع ہوئے۔ جنکے موضوعات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مشرقی پاکستان کی لوک کہانیاں (مضمون)

تراجم: (۲) کنجن مالا (۳) پاکستانی طوطے کی کہانی (۴) بھمل داس شیر ببر کا ماموں (۵) آئینہ (۶) کون بڑا (۷) نائی برہمن (۸) گیتی۔

سعید میر کا انتقال ۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ہوائی حادثہ میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً چالیس کی تھی۔ مرحوم طلباء کے قائد کی حیثیت سے سفر میں تھے۔ وہ اس وقت علاقائی تعاون برائے ترقی میں شامل ملکوں کو چاٹگام سے جانے والے طلباء کے وفد کی قیادت کر رہے تھے۔[1]

نمونہ نثر: ... مشرقی پاکستان کی زیادہ تر لوک کہانیاں بدھ مت کی ترقی اور زوال کے درمیان کے زمانے میں تخلیق ہوئیں۔ یہ زمانہ تیسری صدی سے دوسری صدی تک ہو سکتا ہے؟

ان کہانیوں میں ہیروئن کے حسن و جمال کے طویل بیانات نہیں ملتے۔ صرف ایک دو لفظ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو طویل بیانوں سے کہیں زیادہ تاثر پیدا کرتے ہیں۔ لوک کہانیوں میں عورتوں کی خاص خوبی ان کے دل کی لطیف و نازک احساسات میں مضمر ہوتی ہے۔ عورتوں کا اصلی جوہر شریفانہ صفتیں قرار پاتی ہیں۔ ان لوگ کہانیوں میں سوداگر کو معاشرہ میں بلند درجہ حاصل ہے اور وہ راجاؤں کے برابر ہوتا ہے۔[2]

---

[1] روزنامہ یاسبان ڈھاکا ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۷ء [2] "ساقی" کراچی۔ مشرقی پاکستان نمبر ص ۲۳۴

Dhaka University Institutional Repository

وحید قیصر ندوی

(۱۹۳۷ء - ۱۹۶۹ء)

مکمل نام: وحید قیصر ندوی اور قیصر تخلص تھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۳۷ء میں موضع گیا ضلع بہار کے ایک مولوی گھرانے میں ہوئی[1]۔ مولانا الطاف حسین حالی ان کے نانا کے چچازاد بھائی تھے۔ وحید قیصر ندوی نے ندوۃ العلماء سے فارسی اور عربی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سید سلیمان ندوی کی خواہش پر وہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک اعظم گڈھ میں (رفیق) کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے "معارف" کے لئے مضامین بھی لکھے۔ اور سید سلیمان ندوی کی عربی تصنیف "الجغرافیہ عندالعرب" کا اردو میں ترجمہ بھی کیا[2]

اردو ارباب قلم میں وحید قیصر ندوی کا تعارف مضمون نگار، شاعر، محقق اور صحافی کی حیثیت سے ہے۔

تقسیم ہندوستان کے بعد سابق مشرقی پاکستان آئے اور ڈھاکے میں سکونت اختیار کی۔ وہ ڈھاکے میں روزنامہ "جنگ" کراچی، کے نمائندہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ ریڈیو مشرقی پاکستان کے اردو پروگراموں سے بھی وابستہ رہے انہوں نے عربی، فارسی، اردو کے علاوہ بنگلا زبان میں واقفیت حاصل کرلی تھی یہی وجہ تھی کہ قیصر ندوی نے ادب و ثقافت اور بنگال کی تاریخ سے متعلق مفید تحقیقی مضامین پیش کئے۔ ان کے مضامین "عصر جدید" (کلکتہ) "ہمایوں" ماہنامہ "ساقی" کراچی ماہنامہ "ماہ نو" کراچی "ندیم" گیا۔ ماہنامہ "ندیم" ڈھاکا "دلربا" ڈھاکا "آب و گل" ڈھاکا "خاور" ڈھاکا۔ "پاسبان" ڈھاکا میں شائع ہوتے رہے۔

قیصر نے نظم و نثر دونوں اصناف پر طبع آزمائی کی ہیں۔ لیکن ان کا اصل میدان مضمون نگاری ہے۔ ان کی سخن فہمی اور سخن گوئی کی صلاحیت اچھی تھی۔ محفل مشاعرہ میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ ان میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ اردو و بنگلا دونوں زبان کے ادبی حلقوں سے منسلک تھے۔ بنگلا زبان کے فن و فنکاروں سے اردو داں طبقہ کو آگاہ کرنا ان کا اصل منشا تھا۔ ان کی یہ کوشش دونوں زبان کے لئے مفید تھی۔ اس سلسلے میں ان کا شمار سلیم اللہ فہمی، احسن احمد اشک، یونس احمر، رفیع احمد فدائی وغیرہ کے گروپ میں ہے۔ انہوں نے سابق مشرقی پاکستان کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور ادب سے متعلق متعدد مضامین سپرد قلم کئے۔ ان مضامین کے عنوانات ہی سے موضوع کی وضاحت

---

[1] مشرقی بنگال میں اردو ص ۳۸۹ [2] ایضاً

Dhaka University Institutional Repository

ہوتی ہے۔ مثلاً "مشرقی پاکستان تاریخ کے آئینے میں" "مسلمان اور بنگالی صحافت" "مشرقی پاکستان کا سب سے پہلا اردو جریدہ" "مشرقی پاکستان کے چند مشہور قبائل" "اقبال اور بنگالی ادیب" "مشرقی پاکستان کے لوک سنگیت" وغیرہ۔ مذکورہ مضامین ماہنامہ "ساقی" مشرقی پاکستان نمبر میں شائع ہوئے۔

قیصر ندوی کا اسلوب بیان صاف، سادہ اور متین ہے۔ بیان میں الجھاؤ نہیں۔ ان کی تحقیق وسیع تھی۔ ان کے مضامین جامع اور مدلل ہیں۔ ان کے مضامین میں صحافیانہ رنگ در آنے کے باوجود سلاست اور دلنشینی میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اردو داں ہونے کے باوجود بنگلا زبان و ادب و بنگال کی تاریخ سے جو لگاؤ تھا یہ ان کے بلند خیالات اور حب الوطنی کی بیّن دلیل کہی جا سکتی ہے۔

سابق مشرقی پاکستان کے اس اردو خادم نے ۱۶ دسمبر ۱۹۶۹ء کو اس دار فانی سے رحلت کی اور محمد پور قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

نمونۂ نثر: ..... پندرہویں صدی عیسوی میں حسین شاہ کی عہد حکومت کے ساتھ بنگال کی تاریخ میں ایک زریں دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمیشہ سے اس خطے کی آب و ہوا اچھی رہی ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی افراط اور ارزانی بہت تھی۔ اس کی وجہ سے دوسرے ملکوں سے تجارتی تعلقات بڑھتے رہے۔ مذکورہ صدی میں ترقی اس وجہ سے ہوئی کہ ملک میں آزاد حکومت قائم تھی اور اس کے ساتھ ہی چین اور پرتگال وغیرہ ملکوں کے لوگوں سے یہاں تجارت کی ابتدا ہوئی اور اسے خوب ترقی نصیب ہوئی [1]

نمونۂ شاعری:

حیات مستعار میں سکون کی تلاش کیا
سکوں اگر ہے زندگی تو موت کس کا نام ہے

---

[1] ماہنامہ ساقی، کراچی۔ مشرقی پاکستان نمبر ۱۹۶۳ء ص ۴
[2] قیصر ندوی ماہنامہ "خاور" اگست ۱۹۵۲ء ص ۶۰

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر عندلیب شادانی

(۱۸۹۷ء - ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا نام وجاہت حسین صدیقی۔ تخلص عندلیب۔ والد کا نام اشتیاق حسین صدیقی تھا۔ شادانی کی ولادت ۱۸۹۷ء میں ضلع مراد آباد کی ایک بستی سنبھل میں ہوئی[1]۔ ماں کا نام زینب بی بی تھا۔ فارسی کے مشہور عالم شاداں بلگرامی کے مقلد اور شاگرد مقلد تھے۔ اسی نسبت سے اپنے آپ کو شادانی کہتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ رام پور میں ہوئی۔ انہوں نے عربی اور فارسی کے تمام امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کئے۔ پھر چند وجوہ کی بنا پر وہ رام پور سے بیزار ہو گئے اور سیدھے لاہور پہنچے۔ یہاں انہوں نے ۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے فارسی میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ لاہور میں ڈاکٹر محمد اقبال، سر عبدالقادر، تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ڈاکٹر محمد عبداللہ، پروفیسر عابد علی عابد جیسے ادیب و شاعر سے ملاقات کا شرف حاصل رہا۔ اس ماحول نے شادانی کے اندر پوشیدہ ادبی ذوق کو بیدار کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں ہندو کالج دہلی میں اردو فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے[2] دہلی میں انہیں بیخود دہلوی سائل دہلوی، علامہ برق موہن وتاثر یہ کیفی دہلوی کی صحبتیں میسر ہوئیں۔ جنہوں نے ان کے شعر و ادب کے ذوق کو مزید جلا بخشی۔ اور زبان و بیان کے صحیح منہج سے آگاہ ہونے کا روشن موقع دیا۔ ۱۹۲۸ء میں لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی میں ہوا[3] ۱۹۳۴ء میں انہوں نے لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ ان کے مقالے کا عنوان "ہندوستان کے مسلم مؤرخ ۱۲۰۵ء تا ۱۲۵۹ء" تھا۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ان کا یہ تحقیقی مقالہ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ شادانی ۱۹۴۵ء تا ۳۰ جون ۱۹۶۹ء شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدر رہے۔ انہیں دو بار

---

[1] کلثوم ابوالبشر۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی حیات اور کارنامے۔ بنگلہ دیش ۱۹۹۲ء۔ ڈاکٹر کلثوم کی تحقیق کے مطابق شادانی کی سال پیدائش ۱۸۹۹ء ہے

[2] نظیر صدیقی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایک مطالعہ۔ مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۹۸۵ء ص ۱۱

[3] نظیر صدیقی، ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک مطالعہ، مکتبۂ اسلوب کراچی ۱۹۸۵ء ص ۱۱

Dhaka University Institutional Repository

آرٹ فیکلٹی کے ڈین بننے کا شرف بھی حاصل رہا۔ ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو ڈھاکے میں وفات پائی [1]

ڈاکٹر شادانی کو اردو و فارسی زبان پر حاکمانہ دستگاہ تھی۔ انگریزی زبان پر بھی غیر معمولی دستگاہ رکھتے تھے۔ انہیں تین حیثیت سے شہرت نصیب ہوئی۔ شاعر، افسانہ نگار اور ناقد۔

شادانی کو شاعرانہ صلاحیت قدرت نے ودیعت کی تھی۔ وہ فطری شاعر تھے۔ وہ قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعرانہ فنکاری کا اندازہ فی البدیہہ اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ شادانی کی فطرت میں جدت تھی۔ شاعری ہو یا تنقید و افسانہ نگاری، انہوں نے اپنا جادہ آپ بنایا۔ وہ کسی کے آگے زانوئے ادب طے کرنے کے قائل نہیں انہوں نے کسی کی پرستش نہیں کی۔ شاعری ہو یا نثر ہر جگہ ان کا شعور ادب حقیقت پر مبنی ہے۔ شادانی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں بھی غزل کی شان نمایاں ہے۔ عام طور پر اردو و فارسی شاعری میں محبوب کو ظالم و سفاک کہنے کا رواج چلا آرہا ہے لیکن شادانی نے یہاں بھی حقیقت کو مدنظر رکھا۔

مثلاً وہ کہتے ہیں :

مجبوریاں ہیں ظاہر کیوں کر کہوں کہ آؤ
اب دل نہیں سنبھلتا میں کیا کروں بتاؤ

شادانی عشق مجازی کے پرستار تھے۔ عاشق و محبوب کے دلی جذبات و کیفیات کی ترجمانی میں حقیقت سے کام لیا ہے ان کے یہاں محبت ہو یا شکوہ شکایت ایک طرز نہیں۔ یہ ان کی حقیقت پسندی کی پہچان ہے۔ زبان کی بندش، الفاظ کا برجستہ استعمال میں کمال حاصل تھا۔ علم عروض و بلاغت میں ماہر تھے۔ انہوں نے حسن و عشق کے واردات اور معاملہ بندی کے بیان میں ابتذال سے اپنے دامن کو پاک رکھنے کی سعی کی۔ شادانی نے اپنے عشقیہ بیان کے لئے گل و بلبل اور شمع و پروانہ کے فرسودہ استعارات کو ترجیح نہ دی۔ ان کے استعارات میں بھی جدت ہے۔ مثال :-

وہ دور تھے نظر سے اور چاندنی کھلی تھی
آنکھوں سے رات پیہم ٹوٹا کئے ستارے

بحیثیت مجموعی شادانی کا ایک سلجھا ہوا شاعرانہ رنگ ہے جس نے ان کے اشعار کو انفرادی حیثیت عطا کی ہے۔ شادانی کی شاعری میں جذبے کی شدت بھی ہے اور تجربے کی صداقت بھی، تخیل کی قدرت اور زبان کی صحت اور تازگی ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

ڈاکٹر شادانی ماہر فن نقاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی تنقیدی بصیرت بڑی عمیق اور تخلیقی

---

[1] ۱۹۶۹ء میں راقم فرانسیسی گرلز اسکول ڈھاکا میں دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ ۲۹ جولائی کو تقریباً گیارہ بجے ڈاکٹر شادانی کی وفات کی خبر اسکول میں پہنچی۔ کلاسیں روک دی گئیں پورے اسکول میں غم کا بادل چھا گیا۔ اساتذہ اور طالبات میں دو بجے دن تک قرآن خوانی ہوتی رہی

Dhaka University Institutional Repository

صلاحیت وسیع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم و ادب پر انہیں غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی۔ وہ فطرتاً بڑے بے باک اور نڈر نقاد تھے۔ معائب و محاسن کی پرکھ کا شعور تھا۔ وہ طبعاً حد درجہ کے خود مختار اور بے نیاز واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ شخصیت کو بھی معاف کرنا روا نہیں سمجھا۔ انہوں نے بڑی جرأت مندی سے "دور حاضر اور اردو غزل گوئی" میں غزل کے غیر صحت مندانہ رجحانات، رسمی خیالات، بے جان روایات کی مزاحمت کی۔ اس میں انہوں نے حسرت، اصغر، فانی اور جگر جیسے بڑے بڑے شعراء کو بھی نہیں چھوڑا۔ شادانی کی تنقیدی کتاب "تحقیق کی روشنی میں" اردو ادب کے تنقیدی ذخیرے میں قابل قدر اضافہ ہے۔ اس میں "شیفتہ ایک نقاد کی حیثیت سے"، "مرزا غالب اور دوسرے غالب"، "ریختی کا موجد" وغیرہ تحقیقی مضامین ہیں۔ یہ مضامین اردو ادب کے تحقیقی و تنقیدی میدان میں ان تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، جن کی انہیں ضرورت تھی۔ ان خوبیوں کے علاوہ شادانی کی تنقید میں ایک خامی رہ گئی ہے۔ انہوں نے فن کار کی خوبیوں کے بہ نسبت خامیوں کو زیادہ اجاگر کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی تنقید وقتاً فوقتاً عملی تنقید کی نہج سے ہٹ کر تخریبی تنقید کے کنارے تک پہنچ جاتی ہے۔ دراصل شادانی نقاد سے بڑھ کر محقق ہیں۔ تحقیق کے فرائض کو انہوں نے جس حسن و خوبی سے انجام دیا وہ قابل ستائش ہے۔

عندلیب شادانی افسانہ نگاری کے میدان میں بھی گہرے نقوش چھوڑے۔ ایک زمانہ تک وہ "پریم پجاری" کے نام سے "سچی کہانیاں" لکھتے رہے جو مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ بعد میں ان کہانیوں کا مجموعہ "جھوٹا خدا" اور "نوش و نیش" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔

"سچی کہانیاں" سے ان کا مطلب وہ سچے اور حقیقی واقعات ہیں جو ہماری روزانہ زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں جن کا بیان دلچسپ اور سبق آموز ہو۔

جہاں تک افسانے کے فن اور تنقید کا تعلق ہے "سچی کہانیاں" اس سے بے نیاز ہے۔ تاہم شادانی کی کہانیوں میں مقصد، پلاٹ اور تاثر، کردار کا فطری ارتقاء، واقعات کا تسلسل وغیرہ موجود ہے۔

ڈاکٹر نور الدین شادانی کی سچی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"..... ڈاکٹر عندلیب شادانی کی جدت پسند طبیعت نے اردو میں سچی کہانیاں لکھ کر اپنے لئے الگ الگ شاہراہ قائم کی ہے جس پر سوائے ان کے اور کوئی آج تک گامزن نہ ہو سکا۔"

Dhaka University Institutional Repository

شاعر، نقاد اور افسانہ نگار کی حیثیت کے علاوہ صحافت کے میدان میں بھی شادانی کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ ان کی ادارت میں ڈھاکہ سے ماہنامہ "خاور" کے بارہ شمارے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ یہاں کے مختلف ادبی سرگرمیوں سے بھی منسلک رہے۔ متعدد ادبی انجمنوں کی سرپرستی کی۔ مشاعروں اور ادبی نشستوں میں صدارتی فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ان کے بغیر ادبی نشستیں بے رونق سمجھی جاتی تھیں۔ شادانی اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔

نثری نمونہ : . . . . خدا غریق رحمت کرے حکیم حبیب الرحمٰن خان صاحب مرحوم کو ان کی زندگی میں یا یوں کہیئے کہ پاکستان بننے سے پہلے پہلے یہاں کی ادبی سرگرمیاں انہی کی ذات سے وابستہ تھیں۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ انہیں کی تحریک سے ۴ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کو مرزا ابوجعفر صاحب کشفی کے مکان پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ فدا علی خان صاحب مرحوم نے صدارت فرمائی۔ پروفیسر فدا علی خان صاحب ڈھاکا یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی و اردو کے چیرمین تھے۔ ڈھاکے کا یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں میں نے شرکت کی۔ مصرع طرح یہ تھا۔

"آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا" کتنی ہی قابل قدر ہستیاں جو اس بزم کی رونق تھیں آج آغوش لحد میں آسودہ ہیں۔ مگر تصور کی آنکھ سے میں آج بھی انہیں چلتے پھرتے، ہنستے بولتے دیکھ سکتا ہوں۔"[1]

ان کی تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہیں :

احسن الرسالہ یعنی اردو	ڈاکٹر وجاہت حسین	۱۹۲۵ء	روٹری پرنٹنگ ورکس لاہور
تحقیقات :	عندلیب شادانی	ندارد	جلیل اکیڈمی بریلی
تحقیق کی روشنی میں :	〃	طبع اول ۱۹۶۳ء	شیخ علم علی اینڈ سنز لاہور، پشاور، حیدرآباد
چہار مقالہ :	〃	۱۹۲۴ء	لاہور
جھوٹا خدا :	〃	۱۹۵۱ء	عالمی پرنٹنگ پریس لاہور

---

[1] عندلیب شادانی "ڈھاکہ کی ادبی محفلیں" ماہنامہ "ساقی" مشرقی پاکستان نمبر ص ۳۰۷

Dhaka University Institutional Repository

نوشت و تیش : شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور - کراچی

دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی : فروری ۱۹۵۱ء شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

سچی کہانیاں : طبع دوم جون ۱۹۴۵ء کتب خانہ علم و ادب دہلی

قصائد فانی تدوین

نشاطِ رفتہ : شعری مجموعہ ۲۳ / اکتوبر ۱۹۵۰ء
(تاریخ دیباچہ)

رباعیاتِ بابا طاہر (ترجمہ) ،، ،،

• نشاطِ رفتہ سے بطور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں :

تصویر میں نے مانگی تھی شوخی تو دیکھئے
اک پھول اس نے بھیجدیا ہے گلاب کا
لکھا ہے اس نے دل کا بھی عالم یہی ہے بس
بھیجا ہے ایک پھول مسل کر گلاب کا

تم چاندنی ہو، پھول ہو، نغمہ ہو، شعر ہو .
اللہ رے حسنِ ذوق مرے انتخاب کا

بنتی کبھی نہ حسن و محبت کی داستاں
ناکامیوں نے بات کا افسانہ کر دیا

میں نے مانا تمہیں کچھ مجھ سے سروکار نہ تھا
جاتے جاتے مجھے کیوں تم نے پلٹ کر دیکھا

Dhaka University Institutional Repository

مولانا تمنّا عمادی

(۱۹۰۵ء - ۱۹۷۲ء)

مکمل نام سید محی الدین، تخلص تمنّا اور عمادی لقب ہے۔ ۱۹۰۵ء میں پھلواری شریف پٹنہ میں ان کی پیدائش ہوئی۔ والد مولانا نذیر الحق اپنے وقت کے باکمال عالم تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ فائز تخلص تھا۔ تمنّا نے دینی و ادبی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی تھی۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبان پر عبور حاصل تھا۔ عربی و فارسی کلام میں مولانا شبلی اور اردو میں شمشاد لکھنوی سے اصلاح سخن کرتے تھے۔ نثر نگاری میں مولوی عبدالحق، مولانا سید سلیمان ندوی سے متاثر تھے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں نظام حیدر آباد نے سَو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا تھا۔ جو انہیں ۱۹۴۸ تک موصول ہوتا رہا۔[1]

تقسیم ہندوستان کے بعد ڈھاکا تشریف لے آئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ وہ یہاں بھی علمی و ادبی خدمات منسلک رہے۔ ۱۷ء سے کچھ دن پہلے کراچی ہجرت کر گئے۔ وہاں ۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء کو انتقال کیا۔ کراچی میں سپرد خاک کیے گئے۔

مولانا تمنّا عمادی کی شاعرانہ خصوصیات کے بارے میں سلیم اللہ قیصی کے بیان سے مجھے اعتراف ہے جو حسب ذیل ہے۔

"مولانا تمنّا عمادی متبحر ہیں اور ان کی شخصیت بجا طور پر کہہ سکتی ہے۔ "کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے"۔ مولانا اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فن شعر، عروض اور معانی و بیان پر جو قدرت حاصل ہے اس کی مثال ہمارے دور میں شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ ان شعبوں میں وہ ہمارے اسلاف کے ہم مرتبہ ہیں۔ قدرت کلام جیسے انکی خانہ زاد ہے۔ سنگلاخ زمینوں اور قافیوں کو پانی کر دکھاتے ہیں۔ قدیم رنگ کی عالمانہ غزل لکھتے ہیں۔ مولانا تمنا عمادی ملّی اور قومی واقعات اور تحریکات سے گہرا اثر قبول کرتے اور اسے اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔[2]

---

[1] "پورب و پاکستانے اردو" محی الدین۔ پاکستان پبلیکیشنز ڈھاکہ ۱۹۶۹ء، ص ۲۷۔ [2] مشرقی بنگال میں اردو ص ۲۰۵

[3] ششماہی قلم کار، ڈھاکا۔ جنوری ۱۹۶۱۔ ص ۱۵

Dhaka University Institutional Repository

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق سنجیدہ شاعر تھے۔ ان کے اشعار میں مذہبی عنصر اور اور رندانہ کیفیت کا امتزاج ہے۔ ان کی مثنویاں قومی و ملی احساس کی ترجمان ہیں۔ قیام مشرقی پاکستان کے دوران ان کی مثنوی "مثنوی معاد" اور "ارمغان انقلاب" اس ضمن میں لکھی گئیں۔

ایضاح سخن بتوضیح اصلاح سخن" تمنا کی بڑی مفید کتاب ہے جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں ڈھاکا سے شائع ہوا۔ یہ کتاب مسائل صرف و نحو اور بیان علم و عروض سے متعلق ہے۔

افعال مرکبہ: ان کی دوسری کتاب ہے جو انجمن پریس کراچی سے شائع ہوئی۔ ۱۱۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اردو علم صرف و نحو افعال مرکبہ سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب سنجیدہ ادب لکھنے والوں کے لئے بڑی مفید ہے۔

بہ قول اقبال عظیم ان کی عربی، فارسی اور اردو نثر و نظم کی تصنیفات و تالیفات میں ۲۱ مطبوعہ اور ۲۲ غیر مطبوعہ تخلیقات شامل ہیں۔ مذکورہ تصنیفات کے علاوہ ان کے متعدد علمی و ادبی مضامین اور شعری نگارشات برصغیر کے متعدد رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

نمونۂ کلام:

غم ہی غم ہوں، پر داغ ہے گلشن میرا
ہے ہر اک ٹوٹے ہوئے دل میں نشیمن میرا
پاس الفت کی قسم ہوں میں ہوا خواہ رقیب
آپ کا دوست تو ہے لاکھ ہو دشمن میرا
اہل دل رکھتے ہیں سینے میں تمنا مجھ کو
ہو گا پتھر کوئی جو دل نہیں مسکن میرا

نمونۂ رباعی:

ہے کون سا دن کہ ہم مصیبت میں نہیں
کہتا ہے یہ دل کہ چین قسمت میں نہیں
قسمت میں نہ ہو، نہ ہو، مگر اے اللہ
ایسا تو نہیں کہ تیری قدرت میں نہیں

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر شوکت سبزواری

(۱۹۰۷ء - ۱۹۷۳ء)

ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۹۰۷ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے[1] والد کا نام سید امیر علی تھا۔ آگرہ یونیورسٹی سے فارسی، اردو و عربی میں ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں قانون کی ڈگری بھی اسی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان سندوں کے علاوہ زبان سنسکرت، منطق اور فلسفہ میں بھی مزید تعلیم حاصل کی تھی۔ سابق مشرقی پاکستان آنے سے پہلے میرٹھ کالج (میرٹھ) اور اسلامیہ کالج بریلی میں عربی، فارسی اور اردو کے پروفیسر رہے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد ڈھاکا آئے اور شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی میں لکچرر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی ــــ ۱۹۵۲ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مقالے کا عنوان تھا "اردو زبان کی لسانی تاریخ"۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ "اردو زبان کا ارتقاء" کے نام سے کتابی شکل میں ۱۹۵۶ء میں "گہوارۂ ادب" سے شائع ہوا[2]۔ اردو زبان کی تعلیم اور علم لسانیات کی معلومات کی فراہمی کیلئے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ اس میں انہوں نے اردو زبان کے صرفی، نحوی اور صوتی سرمائے کا جائزہ لینے کے بعد اردو کے ماخذ کا کھوج لگایا ہے۔ ان کی دوسری کتاب "فلسفہ کلام غالب" ہے جس میں غالب کے کلام کے فلسفیانہ پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے علاوہ شوکت سبزواری کے متعدد تحقیقی مضامین مختلف ادبی رسائل مثلاً "ساقی" کراچی، "ماہ نو" لاہور، "دلربا" ڈھاکا "ندیم" ڈھاکا وغیرہ میں شائع ہوئے۔

شوکت سبزواری نے تحقیقی مقالے اور مضامین کے انداز بیان موضوع اور عنوان پر بڑی کڑی نگاہ رکھی ہے۔ یعنی موضوع کے لحاظ سے طرز تحریر اختیار کی ہے۔ ان کی طرز تحریر ہر لحاظ سے عالمانہ شعور کی نشاندہی کرتی ہے۔ شوکت کے بیان میں سچائی اور استدلال کا زور بدرجہ اتم ہے۔ ان میں مفہوم کو واضح کرنے میں جذباتیت اور انتہا پسندانہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی تحقیق کا انداز بہت ہی سنبھلا ہوا ہے۔ تحقیق و جستجو کا شعور اچھا ہے

---

[1] ذاتی فائل، مملو کا ڈھاکا یونیورسٹی رجسٹرار آفس۔

[2] شوکت سبزواری۔ "اردو زبان کا ارتقا" گہوارۂ ادب ڈھاکا

Dhaka University Institutional Repository

ان کی تنقید سائنٹیفک ہے۔

۱۹۵۹ء میں وہ کراچی بلائے گئے اور انجمن ترقی اردو کراچی کی خدمات میں منہمک ہو گئے۔ آخری دم تک موصوف وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے منسلک رہے۔ شوکت سبزواری کا انتقال ۱۹۷۳ء میں کراچی میں ہوا۔[1]

شوکت سبزواری کے مضمون "اردو ادب کی نئی پرانی قدریں" کی چند سطریں بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

"اردو کی جدید شاعری کے دو بڑے موضوعات ہیں: فطرت پرستی اور وطن پرستی۔ فطرت پرستی کی روح حسن ہے اور وطن پرستی کی عدل و انصاف۔ حالی کی نظم "انصاف" کو اس سلسلے میں ایک علامت کی حیثیت حاصل ہے۔ جو ہمارے جدید شعراء کے ایک بڑے رجحان کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد برصغیر میں انگریز کی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔ انگریز کی حکومت کی پالیسی شروع ہی سے استعمار پسندانہ تھی۔ وہ اس سرزمین سے تمتع حاصل کرنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ متمتع حاصل کرنے کے لئے برصغیر کے باشندوں خصوصت کے ساتھ مسلمانوں کو کچلنا شروع کیا۔"[2]

ڈاکٹر شوکت سبزواری کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

فلسفۂ کلام غالب : مطبوعہ

نئی اور پرانی قدریں: 〃 اس میں مصنف نے اردو زبان کی بہت سے اہم مسائل کو روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً "نے" کی سرگزشت مفعولی ضمیریں کی "کے" وغیرہ کا مناسب استعمال۔

اردو زبان کا ارتقا: طبع اوّل جولائی ۱۹۵۶ء ناشر گہوارۂ ادب ڈھاکا

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں نظیر صدیقی کے خط سے یہ معلومات فراہم ہوئیں۔

[2] ماہ نامہ "خاور" ڈھاکا ۱۹۵۲ء ص ۷

Dhaka University Institutional Repository

جس میں اردو زبان کے صرفی، نحوی اور صوتی سرمائے کا تحقیقی
لیا جائزہ لینے کے بعد اردو کے ماخذ کا کھوج لگایا گیا ہے۔

معیارِ ادب : اشاعت اول ۱۹۶۱ء انجمن پریس کراچی

یہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں تنقیدی اصول و مسائل کی
وضاحت کی گئی ہے۔ مضامین کے عنوانات حسبِ مراتب ہیں۔
مثلاً "تنقیدی نقطہ نگاہ کی اہمیت" "تنقید یا تقلید" "عربوں کا فنِ تنقید" "شعر اور اس کی تنقید" وغیرہ اردو ادب
اور فنِ تنقید کی تعلیم کے سلسلے میں یہ کتاب نہایت مفید ہے۔

لسانی مسائل : طبع اوّل انجمن پریس کراچی ۱۹۶۲ء

جس میں اردو زبان کے لسانی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

خواجہ محمد عادل

(۱۹۰۴ء-۱۹۷۳ء)

اصل نام محمد عادل۔ خاندانی لقب خواجہ اور تخلص عادلؔ ہے۔ ان کے والد خواجہ محمد اعظم کو نواب خواجگان ڈھاکا کے اردو ارباب قلم میں خاص شہرت حاصل تھی جس کا تفصیلی بیان گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے عادلؔ ۲۰ر دسمبر ۱۹۰۴ء کو ڈھاکے میں پیدا ہوئے[1] خواجہ عتیق اللہ شیداؔ عادل کے دادا اور نواب احسن اللہ نانا ہوتے تھے۔ عادل کی ابتدائی تعلیم (عربی۔ فارسی) ان کے دادا سے ہوئی۔ عادل کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا چسکا تھا۔ لیکن ۱۹۴۱ء سے انہوں نے باقاعدہ مشاعروں میں شعر پڑھنا شروع کیا۔ خواجہ بیدار بخت بیدار (۱۸۸۴ء - ۱۹۴۲ء) اور مولانا رضا علی وحشتؔ سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ فارسی شعراء میں خسرو، حافظ اور جامی کے کلام پسند تھے۔ انکی افتاد طبع فارسی شعر گوئی کی طرف مائل رہی۔ بیسویں صدی میں تقسیم ہند کے بعد کا زمانہ اردو شعر و ادب کے لئے بڑا خوشگوار رہا۔ اس دور کی ادبی محفلوں قابل ذکر ہے۔ خاص کر ڈھاکے میں اکثر شعر و شاعری کی محفل منعقد ہوا کرتی تھی ڈاکٹر عندلیب شادانی، وحشتؔ کلکتوی، آصف بنارسی میر محفل ہوتے تھے۔ اردو کی اس معیاری محفل کا کا عادل پر بڑا اثر رہا۔ ناطق لکھنوی و اثر لکھنوی جیسے اعلیٰ شعراء کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق و شوق کو جلا بخشی۔ ان کے علاوہ تقسیم ہند کے پہلے حکیم حبیب الرحمٰن کی قربت سے وہ اردو ادبی خدمات کی طرف مبذول ہو چکے تھے حکیم حبیب الرحمٰن کی مشہور تصانیف "آسودگان ڈھاکہ" اور "مساجد ڈھاکا" کی ترتیب اور مواد کی فراہمی میں نواب صاحب انکے معاون رہے۔ اردو زبان و ادب کی خدمات کے سلسلے میں خواجہ محمد عادل کا اہم رسالہ ماہنامہ "جادو" ہے۔ جو ان کی ادارت میں (۱۹۴۳ء - ۱۹۴۶ء) نکلتا رہا[2] "جادو" میں مولانا رضا علی وحشتؔ، فدا علی خان رامپوری، سید شرف الحسینی، خالد بنگالی، سید مظفر الدین ندوی جیسے اکابر قلم کے نگارشات شامل رہتے تھے۔

اقبال عظیم نے نواب سید محمد آزاد (۱۸۴۶ء - ۱۹۱۷ء) کو عادل کا مصاحب لکھا ہے۔ ایک حد تک صحیح نہیں

---

[1] اقبال عظیم۔ مشرقی بنگال میں اردو۔ ص ۳۲۹

سید فدا علی خان رامپوری (۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۵ء) شعبہ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کے صدر رہے۔ انہیں اردو، فارسی و عربی کے علاوہ بنگلا زبان میں بھی معلومات حاصل تھیں۔ انہوں نے بنکم چٹرجی کے ناول "بشو برکھا" کا اردو ترجمہ "بس [illegible]" کے نام سے کیا۔

[2] اقبال عظیم۔ مشرقی بنگال میں اردو ص ۳۳۰

Dhaka University Institutional Repository

کیونکہ عادل کی پیدائش مستند رائے کے مطابق ۱۸۹۰ء میں ہوئی ہے اور نواب سید محمد آزاد کا انتقال ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ اس حساب سے عادل اسوقت بارہ سال کے تھے۔

عادل کو شعر گوئی سے فطری لگاؤ رہا۔ اچھا کہتے تھے۔ ان کے کلام میں جا بہ جا داغ دہلوی کے رنگ نمایاں ہوگئے ہیں ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ان کے اشعار اسوقت شائع ہونے والے ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔

عادل نے ۱۹۷۳ء میں کراچی میں انتقال کیا۔ اور ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے قبرستان کراچی میں دفن ہوئے۔

نمونہ کلام:

آمد و رفتِ نفس کو جاوداں سمجھا تھا میں
زندگی کو کارواں در کارواں سمجھا تھا میں

دو ہی ہچکی میں منازل زیست کے طے ہو گئے
زندگی کو آج تک بارِ گراں سمجھا تھا میں

اب کھلا مجھ پر کہ یہ بھی اک فریب زیست تھا
زیست کو اپنی کسی کی داستاں سمجھا تھا میں

اپنی اپنی بولیاں ہی بولتے ہیں سب یہاں
ہم نشینانِ چمن کو ہم زباں سمجھا تھا میں

کچھ نہیں جز حسرت و یاس و الم عادل کے پاس [1]
دیکھ کر صورت تو اس کو شاد ماں سمجھا تھا میں

---

[1] شش ماہی "قلم کار" جنوری ۱۹۶۱ء ص ۱۰۶

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر محمد طاہر فاروقی

(۱۹۰۶ - ۱۹۷۸ء)

اصل نام محمد طاہر۔ لقب فاروقی تخلص طاہر تھا۔ ۱۹۰۶ء میں رام پور پیدا ہوئے۔ والد مولوی محمد محسن فاروقی اسلامیہ کالج پشاور میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔ طاہر فاروقی پشاور کے علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم پشاور میں ہوئی۔ جامعہ اردو آگرہ سے اردو و فارسی میں امتیازی سند حاصل کرنے کے بعد "دکتور ادب" کی اعزازی سند بھی ملی۔ تحقیقی مقالے کا موضوع تھا۔ "اورنگ زیب کے دربار میں فارسی ادب" کہا جاتا ہے کہ ڈھاکا یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مرزا جان طپش دہلوی پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی سعی کی تھی لیکن ان کا یہ کام شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی میں تعلیمی سال (۱۹۵۱ء - ۱۹۵۲ء) میں طاہر فاروقی کلرک بحیثیت ریڈر تقرر ہوا۔ صرف ایک سال بعد ان کا تبادلہ پشاور ہو گیا۔ طاہر فاروقی صاحب کا قیام سابق مشرقی پاکستان میں مختصر دنوں تک رہا۔ مگر وہ اپنی علمی صلاحیت اور کامیاب معلم کی حیثیت سے یادگار ہیں۔ انہوں نے ۱۹۷۸ء میں پاکستان میں انتقال کیا۔

ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) سیرت اقبال: یہ طاہر فاروقی کی نہایت عمدہ تصنیف ہے۔ علامہ اقبال کی سوانح اور کلام سے متعلق جتنی کتابیں منظر عام پر آئی ہیں اس میں "سیرت اقبال" کو انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں انہوں نے علامہ اقبال کی سوانح کے ساتھ انکی شاعری کا جامع اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اسلوب تحریر مدلل اور عالمانہ ہے۔ بیان میں بے جا طول اور الجھاؤ نہیں۔ ان کی ناقدانہ صلاحیت قابل داد ہے۔ یہ تصنیف فاروقی صاحب کے فن سوانح نگاری کی بین ثبوت ہے۔

(۲) بزم اقبال: (تالیف) آگرہ کے بزم اقبال میں پڑھے جانے والے مقالات کا مجموعہ ہے

---

[1] مشرقی بنگال میں اردو ص ۲۷۸

Dhaka University Institutional Repository

آگرہ میں اس بزم کی بنیاد بھی طاہر فاروقی ہی نے رکھی تھی۔[1]

مولانا محمد علی جوہر: مولانا محمد علی جوہر کی حیات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

اردو نثر کے نمونے: (تالیف) اس میں مختلف اردو ارباب قلم سرسید احمد خاں سے لیکر مجنوں گورکھپوری تک چیدہ چیدہ اردو ارباب قلم کے اقتباسات جمع کئے گئے ہیں۔ اور مقدمہ میں ان گرانقدر اقتباسات کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

ادبیات ایران نو: (تالیف) ۱۹۳۶ء تمام مشاہیر فارسی کا منتخب کلام شامل ہے۔

چمنستان ادب: (تالیف) اردو ادب سے متعلق ہے۔

چینی کی گڑیا: (ترجمہ) یہ ناول انہوں نے سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے متعدد تنقیدی مضامین بھی سپرد قلم کئے جو موقر رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔

طاہر فاروقی نے وقتاً فوقتاً شاعری بھی کی ہے لیکن ان کی علمی صلاحیت نثری میدان میں اجاگر ہوئی۔ شاعری میں وہ علامہ اقبال سے متاثر ہیں۔ ان کے اشعار اعلیٰ ادبی ذوق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ طرز کلام سنجیدہ اور رواں ہے۔ تشبیہات و استعارات میں مفہوم کی وضاحت بڑی خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔ نمونہ کلام حسب ذیل

نگاہ لطف سے دنیا بدل دی محشرستاں کی — سیاہی خود بخود اڑنے لگی ہے فرد عصیاں کی
مریض غم کی مشکل شاید آساں ہونے والی ہے — کہ مدھم روشنی ہونے لگی شمع فروزاں کی
الٰہی کیا کوئی تازہ قیامت اٹھنے والی ہے — پناہیں ڈھونڈتے ہیں انکے جلوے میرے ارماں کی
کوئی پھر بزم دل میں بے نقاب آنے کو ہے طاہرؔ — کہ صورت ہی بدلتی جا رہی ہے درد پنہاں کی[2]

نمونہ نثر: ۔۔۔۔ اقبال کا درس اور پیغام بھی تشکک و قنوط کے منافی ہے اس لئے فطری طور پر آپ کا تمام فارسی اور اردو کلام رجائیت سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا معلم اور مبلغ ارادہ بھی کرتا تو شاید آپ کے اشعار سے رجائیت حذف نہ کر سکتا تھا خود ہی اور آپ کے درس کے منافی اجزا ہیں آپ کی تعلیم کو سکون یا یاس سے بعد بعید اور سیر و حرکت اور امید و رجا سے قریبی تعلق ہے۔ اس لئے آپ کی غزلیں نظمیں اور مثنویاں سب رجائیت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔" (سیرت اقبال)

---

[1] سید اقبال عظیم "مشرقی بنگال میں اردو کے تیرہ سال" شش ماہی تعلیم کراچی کا جنوری ۱۹۶۱ء ص ۲۹ [2] ماہنامہ "ادب" ڈھاکا مئی/جون ۱۹۵۳ء۔ ص ۴۲

Dhaka University Institutional Repository

سُرور بارہ بنکوی

(۱۹۳۶ء - ۱۹۸۰ء)

نام سعید الرحمٰن۔ سُرورؔ تخلص ہے۔ رائے گنج بارہ بنکی (یو پی) میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء سے انہوں نے باقاعدہ شعر گوئی شروع کی۔ ان کی پرورش خالص روایتی شاعری کے ماحول میں ہوئی تھی۔ سرورؔ کی ابتدائی شاعری میں اس ماحول کی عکاسی ہے۔ رفتہ رفتہ ان کا رجحان ترقی پسند شاعری کی طرف مائل ہو گیا۔ لیکن وہ روایت سے منحرف نہیں تھے۔ بلکہ ترقی پسند شاعری کے مفید پہلوؤں کو اپنانے کے قائل تھے۔ سابق مشرقی پاکستان میں سرورؔ ہر جگہ کے نمائندہ تھے۔ سُرورؔ کی یہاں تشریف آوری کے متعلق یاور امان کے بیان کی تائید کرتی ہوں۔

> "سرورؔ بارہ بنکوی ۱۹۵۱ء میں یوم اقبال کے سلسلے میں ہونے والے ایک انڈو پاک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے جگر مراد آبادی کی معیت میں پہلی بار ہندوستان سے ڈھاکا آئے تھے اور تقریباً دو تین ماہ رہ کر ہندوستان واپس چلے گئے۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں جب وہ دوبارہ ڈھاکا آئے تو مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کی اور اپنی زندگی کے قیمتی بیس سال گزار دیئے۔ ۱۹۷۱ء میں وہ کراچی چلے گئے۔"[1]

سرورؔ بارہ بنکوی کا انتقال ۳ر اپریل ۱۹۸۰ء کو اچانک ڈھاکے میں ہوا۔ (جبکہ وہ انجمن ادب (جس کے وہ صدر رہ چکے تھے) کے اہتمام میں مشاعرہ منعقد کرنے اور اپنے فلمی کاروبار کے اہم کاموں کو انجام دینے ڈھاکا آئے تھے۔ ۳ر اپریل کو سرورؔ کے اچانک انتقال سے ان کے اعزاز میں ہونے والا مشاعرہ تعزیتی جلسے میں منتقل ہو گیا۔ سرورؔ کی میت ۴ر اپریل ۱۹۸۰ء کو بذریعہ پی۔ آئی۔ اے کراچی پہنچائی گئی اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔

سرورؔ کی شاعری پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ان کے قول کو بیان کرنا مناسب سمجھتی ہوں۔ سرورؔ اپنی شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> "شاعری کے بارے میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ شاعر کو اپنی ذات کے ساتھ ساتھ

---

[1] یاور امان۔ "زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے" ادبی رسالہ "محاذ" ۱۹۸۰ء ص ۱۰

Dhaka University Institutional Repository

اپنے عہد کی بھی ترجمانی ایسے فنکارانہ انداز میں کرنی چاہیئے جس میں آنے والی نسلوں کو جینے کا حوصلہ ملے اور جو انہیں ان کے مسائل اور دکھ درد کا مقابلہ کرنے اور ان پر منحیاب ہو کر زندگی کو حسین سے حسین تر بنانے کی ترغیب دے۔ اس معیار پر جو بھی تحریک یا تجربہ پورا نہیں اترتا اسے میں زندگی سے فرار اور جمہوری نظریات کے فروغ میں سدِ راہ تصور کرتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس میزان پر میری شاعری کس حد تک پوری اترتی ہے[1]"

پروفیسر ممتاز حسین ان کے فن کا جائزہ ان الفاظ میں لیتے ہیں :

" سرور کا فن کچھ اپنی ذات میں محصور نہیں بلکہ ان کے اپنے ماحول کا بھی ترجمان ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ماحول کی ترجمانی ہی ان کا فن ہے[2]"

محمد ممتاز حسین سرور کی فنکاری پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

" اسے ان کی خوش نصیبی سمجھئے یا بد نصیبی کہ انہوں نے اپنا وطن مشرقی پاکستان کو بنایا تھا جہاں کا سیاسی شعور مغربی پاکستان کو بھی چونکاتا رہتا تھا۔ سرور وہاں کی پُر آشوب زندگی سے متاثر تھے اور اپنی شخصیت کا سارا وزن وہاں کے ماحول کو تبدیل کرنے میں صرف کیا یا یہ کہ اپنے شعور کو اس کی تبدیلی کا آلۂ کار بنایا[3]"

سرور نے سابق مشرقی میں اردو ادب کے نئے رجحانات کو بلند حوصلی سے اپنانے کی کوشش کی زمان و مکان کے بدلتے ہوئے دھارے کے خلاف روایتی اصول پر اٹل رہنا پسند نہ کیا۔ یہ ان کی روشن خیالی کی بیّن ثبوت ہے۔ وہ بیک وقت جگر، جوش اور فیض سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ ان شعراء کے مقلد نہیں۔ ان کا ایک انفرادی رنگ ہے۔ شاعری انکی حساس طبع کی عکاس ہے جس میں غم دوراں و غم جاناں کی ترجمانی ملتی ہے۔ نہ اس میں سیاسی منصوبے ہیں نہ شور و غل۔ انکی شاعری کی بڑی خصوصیت انسانی ہمدردی ہے۔ "بیک آواز" "اے وطن اے وطن" "کرفیو" "شکست سے پہلے" (طویل نظم) تک کی نظموں میں ۱۹۷۱ء کے المناک سانحہ کی غمازی ہے۔ سابق مشرقی پاکستان میں کھلے ہوئے معصوم انسانوں کا ناگفتہ بہ حالات کا راگ

---

[1] سرور بارہ بنکوی "سنگِ آفتاب" (شعری مجموعہ) مطبوعہ رحمٰن پبلیشرز کراچی ۱۹۷۵ء ص ۱۶

[2] "سنگِ آفتاب"۔ سرورق۔

[3] ایضاً ص ۱۵

Dhaka University Institutional Repository

دھیمی اور پراثر زبان میں ادا کیا ہے۔ بہ قول فیض احمد فیض :

"سرور کی شاعری میں سجاوٹ بناوٹ نہیں۔"

سرور نے غزل بھی کہی ہے اور نظم بھی۔ فنکاری کے لحاظ سے وہ دونوں صنف شاعری میں کامیاب کہے جائینگے۔ ان کا کلام شیریں، مترنم اور شفاف کہا جاسکتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ سنگِ آفتاب (۱۹۷۵ء) کراچی سے شائع ہوا۔ مشغلہ شعر و شاعری کے علاوہ سرور سابق مشرقی پاکستان کی ادبی سرگرمیوں سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے "انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان" کے ناظم کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں

انہوں نے ڈھاکے سے "آب و گل" کے عنوان سے ایک ادبی رسالے کا اجراء بھی (۱۹۶۰ء) کیا تھا۔ رسالے کا عنوان بنگال کی آب و ہوا سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی افادیت کے لحاظ سے اردو ارباب ادب میں مقبول رہا۔ نظر صدیقی، قیصر ندوی، اُم عمارہ، احمد الیاس، افسر ماہ پوری، ادیب سہیل، زین العابدین وغیرہ کے معیاری تخلیقات سے یہ رسالہ مزین رہے۔

شاعری و ادبی سرگرمیوں میں منہمک رہتے ہوئے سرور مشرقی پاکستان کی فلمی دنیا میں بھی مقبول ہو گئے تھے۔ مشرقی پاکستان کی مشہور فلم "چندا" اور "تلاش" کے لئے نغمے اور مکالمے لکھے۔ انہوں نے خود اپنی فلم "آخری اسٹیشن" بنائی تھی۔

بحیثیت مجموعی سرور ایک حساس دل رکھنے والے بیدار مغز شاعر تھے۔ ان کی روشن خیالی انہیں فلمی دنیا تک لے گئی تھی۔ اس سے فلمی دنیا کو فائدہ پہنچا ہو یا ہو، ان کے اردو نغموں اور مکالموں سے دبستان اردو کے ذخیروں میں بلاواسطہ اضافہ کہا جاسکتا ہے۔

نمونۂ غزل :

سرد ہو کر رہ گیا بازار دار و گیر کا
گرمیٔ وحشت سے لوہا گل کیا زنجیر کا
اپنی باہوں میں تجھے دیکھا تھا اک شب اور میں
منتظر ہوں آج تک اس خواب کی تعبیر کا

Dhaka University Institutional Repository

ترجمانی کی اپنے دور کی میں نے سرورؔ
میرا فن ہے عکس میرے عہد کی تصویر کا

ان کی نظم "شکست سے پہلے" سے چند اشعار بطورِ نمونہ پیش کئے جاتے ہیں :

آج کی رات بھی کیا رات ہے تاریک و طویل
تذکرہ جس کا پڑھا تھا کبھی افسانوں میں
آج کی رات شہر میں کرفیو، پھر بھی
کوئی کٹیا میں ہے محفوظ نہ ایوانوں میں
حال سے بھاگے ہوئے لوگ بھٹک کر شاید
آ گئے ہیں کہیں ماضی کے بیابانوں میں
بربریت کا ہر اک سمت عجب عالم ہے
فرق باقی ہے درندوں میں نہ انسانوں میں
ان درندوں ہی کا اک میں بھی نمائندہ ہوں
ایک دیوانہ ہوں میں بھی انہی دیوانوں میں
ایسی لاشیں بھی ہیں جن کا نہیں پرساں کوئی
راہ میں، کھیتوں میں، دریاؤں میں میدانوں میں [1]

نمونۂ نثر : شہرت، مقبولیت اور عظمت بہت کم یکجا ہوتی ہیں۔ ممکن ہے ایک شخص مشہور تو ہو لیکن مقبول نہ ہو یا مشہور و مقبول ہو مگر عظیم نہ ہو۔ اردو ادب نے بہت کم ایسی شخصیتیں پیدا کی ہیں جس کے حصے میں یہ تینوں صفتیں آئی ہوں۔ ان شخصیتوں میں بھی بیشتر تعداد ایسے ادیبوں اور شاعروں کی ہے جنہیں انتقال کے بعد یہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ بھی ایک مخصوص طبقے میں۔ اس لحاظ سے جگر صاحب اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہیں اپنی زندگی ہی میں وہ شہرت، مقبولیت اور عظمت حاصل ہوئی جو ان کے دور میں یا اس سے قبل شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہوں [2]۔

---

[1] "سنگِ آفتاب" (شعری مجموعہ) ص ۱۵۰
[2] شمس ماہی "قلم کار" ڈھاکا۔ جنوری ۱۹۶۱ء ص ۳۴

Dhaka University Institutional Repository

فضل احمد کریم فضلی

(۱۹۰۶ء - ۱۹۸۱ء)

مکمل نام سید فضل احمد کریم۔ تخلص فضلی ہے۔ والد سید فضل رب فضل یو پی کے ممتاز ڈپٹی کلکٹر اور اور فارسی اردو کے شاعر تھے۔ فضلی کی پیدائش ۱۹۰۶ء میں الہ آباد میں ہوئی۔[1] ۱۹۲۸ء الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں شرکت کی اور کامیاب ہوئے۔[2] ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک ولایت میں مقیم رہے اور اسی دوران انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے اپنا تحقیقاتی مقالہ (فارسی غزل کا ارتقاء) پر بی۔ لٹ کی ڈگری لی۔ سرکاری ملازمت میں ان کا پہلا تقرر ۱۹۳۳ء میں بنگال میں ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ مستقل طور پر مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) سے وابستہ ہو گئے۔ مختلف مقامات میں مختلف عہدوں کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد شعبۂ تعلیمات میں سکریٹری مقرر ہوئے۔ ان کا یہ تقرر سابق مشرقی پاکستان میں اردو زبان و ادب کے لئے نیک فال ثابت ہوا۔ اس وقت مشرقی پاکستان کے تمام بڑے بڑے ضلعوں میں سرکاری اردو اسکولوں، ہر سرکاری کالج میں اردو کا باضابطہ شعبہ اور پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں درجہ دہم تک لازمی زبان کی حیثیت سے درسی نصاب میں اردو کا شامل ہونا فضلی کی کامیاب کوششوں کا مفید نتیجہ تھا۔[3] انہوں نے بنگلہ کو عربی رسم الخط میں رائج کرنے کی سعی "حروف القرآن" کے نام سے کی تھی جو ناکام رہی۔[4]

فضلی کو اپنا وطن پاکستان اور زبان سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ نثر ہو یا شاعری ہر جگہ انہوں نے اپنے دلی جذبات کو ایک انفرادی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ آخر دم تک علم و ادب کی خدمت کرتے ہوئے ۱۹۸۱ء میں کراچی انتقال کیا۔ فضلی بنیادی طور پر شاعر تھے۔ شاعری میں وہ مولانا صفی لکھنوی سے اصلاح سخن لیتے تھے انہیں وحشت کلکتوی اور جگر مرادآبادی سے بڑی انسیت تھی۔ جیسا کہ فضلی کے شعر سے ظاہر ظاہر ہے۔

---

[1] مشرقی بنگال میں اردو ص ۲۴۱

[2] " " " ۲۴۲

[3] " " " ص "

Dhaka University Institutional Repository

زندہ بنگال میں ہے گر اردو
اک سبب اس کا ہے رضا وحشت

اردو شعراء میں وہ میر۔ غالب، حالی اور فارسی میں حافظ اور امیر خسرو سے متاثر تھے۔ ان کی تصنیفات نظم و نثر حسب ذیل ہیں :

(۱) نغمۂ زندگی پہلا مجموعہ کلام (مطبوعہ ۱۹۴۱ء) انجمن ترقی اردو حیدر آباد

چشم غزال : مطبوعہ ۱۹۵۴ء)

فارسی غزل کا ارتقاء (تحقیقی مقالہ انگریزی میں)

خونِ جگر ہونے تک (ناول)، (مطبوعہ بار اوّل کیسل اینڈ کمپنی انگلستان

بار دوم دبستان (محدود) کراچی ۱۹۶۰ء

سحر ہونے تک (ناول) مطبوعہ جسارت پرنٹرز لاہور (بار اوّل ۱۹۸۹ء)

فضلی نے نظم و غزل دونوں اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے. ان کی شاعری نہ انقلابی ہے نہ سیاسی۔ انہوں نے صاف ستھری اور عام فہم زبان میں دلی جذبات کی عکاسی کی ہے. سادگی و پرکاری ان کے کلام کی جان ہے. بحریں چھوٹی لکھتے تھے :

نمونۂ کلام :

ہم غریبوں کا آسرا کیا ہے
ایک تو ہے ترے سوا کیا ہے
دل کسی بات میں نہیں لگتا
یا الٰہی مجھے ہوا کیا ہے

فضلی کی شاعری کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ عصری حالات اور ماحول پر ان کی نگاہ نہیں ہے۔ لیکن نثری تخلیقات میں ان کا رویہ اس کے برعکس ہے۔ نثر میں انہوں نے تاریخی، سیاسی، مذہبی، ثقافتی پہلو کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش ناول کی شکل میں کی ہے۔

فضلی کی دو مفید ناولیں اردو کے افسانوی ادب میں ایک اہم اضافہ ہیں جو پُر اثر انداز بیان، پلاٹ اور فن

Dhaka University Institutional Repository

ناول نگاری کے نئے تجربات میں اپنے نوعیت کی پہلی کامیاب کوشش کہی جا سکتی ہے۔ تاریخ کو ناول کا جامہ سب سے پہلے عبدالحلیم شرر نے "فردوس بریں" کے عنوان سے پہنایا۔ لیکن اس میں داستان گوئی کی چھاپ رہ گئی ہے۔ فضلی کی ناولیں "خون جگر ہونے تک" اور "سحر ہونے تک" اس عیب سے ایک حد تک پاک ہیں۔

"خون جگر ہونے تک" کا پس منظر ۱۹۴۶ء کا وہ ہولناک قحط ہے جسے سرزمین بنگال کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ مصنف نے اس قحط کی پامالیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کی عبرتناک تصویروں کو لفظی جامہ پہنا کر ناول کی شکل میں پیش کیا ہے۔ انگریزی اور بنگلہ میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں رفیق خاور اور بنگلہ میں خالدہ فہمی نے منتقل کیا ہے "سحر ہونے تک" فضلی کی دوسری کامیاب ناول کہی جا سکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی۔

> "ناول سحر ہونے تک" کا اصل موضوع دو قومی نظریہ ہے جس کے پیش نظر پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔ اس ناول میں اس وقت کی تمام سیاسی پارٹیوں کی شدید قسم کی جدوجہد ہے جب پاکستان بن رہا تھا۔ فضلی نے نہایت گہرائی کے ساتھ تاریخی حوالوں کی روشنی میں پہلے تو اس بات کا یقین تعین کیا ہے کہ ہندوستان میں ہندو مسلمان آباد تھے کی بجائے دو قومیں آباد تھیں۔ دونوں کی طرز معاشرت، معاشی حالت سماجی جدوجہد مختلف تھی۔ مذہب اخلاق، معاشرتی ماحول معاشی حالات سب کچھ مختلف تھا۔ اس حوالے سے مسلمان ایک قوم تھے، اقلیت نہیں۔ ایک وہ قوم جو صدیوں سے ہندوستان میں مقیم تھی جس نے آٹھ سو سال تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی تھی اور ہندو سا ایک ہزار سال سے غلام چلی آ رہی تھی اس بات کی خواہش مند تھی کہ وہ آزادی حاصل کرے۔ مسلمان قوم کو غلام بنا کر رکھ سکے[1]۔"

شہزاد منظر اپنی کتاب "پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال" میں فضلی کے ناولوں کے بارے میں یہ رائے پیش کرتے ہیں:

> "عندلیب شادانی کے بعد جو مصنف مشرقی بنگال میں ایک اہم ادیب کی حیثیت سے ابھرے وہ فضل احمد کریم فضلی ہیں۔ جنہوں نے آئی سی۔ ایس افسر کی حیثیت سے بنگال کے مختلف علاقوں میں بیس سال گزارے

---

[1] حسرت کاسگنجوی (سحر ہونے تک۔ تبصرہ) ماہنامہ محفل لاہور۔ جون ۱۹۶۲ء۔

Dhaka University Institutional Repository

اور وہاں معاشرے اور قدرتی مناظر سے گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ وہ اگرچہ بنیادی طور پر شاعر (اور وہ بھی غزل کے شاعر) تھے۔ لیکن انہوں نے بنگال میں قیام کے دوران دو ایسے ناول لکھے جو اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ایک کا نام "خون جگر ہونے تک" اور دوسرے کا "سحر ہونے تک"[1]

مجموعی طور پر فضلی اشاعر اور ناول نگار کی حیثیت سے غیر معمولی درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات کم لیکن معیاری ہیں۔ تاریخ پر ان کی تحقیق اچھی ہے۔ ان کا سماجی مشاہدہ گہرا اور نگاہ غائر ہے۔ ان کی باتوں میں سچائی اور طرز بیان میں دلنشینی ہے خاص طور پر جب وہ منظر کشی کرتے ہیں تو ان کے نثر میں شاعرانہ لطف خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ فضلی نے ناول لکھتے ہوئے اس کے فنی لوازم کے التزام کا خیال رکھا ہے۔ ان کی ناولیں پلاٹ، مکالمے، کردار نگاری، زمان و مکان کی ترجمانی اور مناظر کی مرقع کشی کے لحاظ سے مکمل کہی جا سکتی ہے۔

خونِ جگر ہونے تک" اور "سحر ہونے تک" ان کی یادگار ناولیں ہیں۔ "خون جگر ہونے تک" میں قحط کے مناظر حقیقت نگاری اور تاریخ کے حصے ہیں ـــ تو "سحر ہونے تک" میں فسادات کے واقعات بے باکی اور سچائی کے ساتھ پیش کئے۔ انہوں نے جا بجا اس بات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ مشرقی بنگال میں باوجود بنگالی زبان رواج پانے کے لوگ اردو میں بات کرنا فخر سمجھتے ہیں "خونِ جگر ہونے تک" میں کئی جگہ اس کی تفصیل ملتی ہے کہ مشرقی بنگال میں میلاد بنگالی زبان کی بجائے اردو میں پڑھا جاتا تھا۔ عربی کے بعد بنگال کے مسلمانوں کے لئے اگر کوئی زبان تھی تو وہ اردو ہی تھی۔

نمونۂ نثر:

"میلاد میں لوگ دور دور سے آئے۔ گھوڑا مارا میں اتنا بڑا مجمع کم ہوا تھا۔ میلاد عموماً اُردو میں ہوا کرتا تھا۔ مگر مولانا نے غایت علم کے ثبوت کے طور پر از ابتدا تا انتہا عربی میں ارشاد فرمایا۔ لوگ عش عش کر گئے۔ بڑا رعب پڑا۔ میلاد کے بعد ہی سے لوگوں نے مدرسہ میں اپنے بچوں کا داخلہ کرانا شروع کیا"[2]

---

[1] شہزاد منظر ص ۲۰۰

[2] "خون جگر ہونے تک" ص ۵۳

Dhaka University Institutional Repository

ماہر فریدی

(م - ۴ر اگست ۱۹۸۴ء کراچی)

نام ابو البرکات سید شاہ مصطفےٰ حسن۔ تخلص ماہر تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سید شاہ محمد عطاء الحق شاغل فریدی سے حاصل کی شاغل اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے لہذا اصلاح سخن بھی اپنے والد ہی سے لیتے رہے۔ ماہر فریدی کو عربی، فارسی اردو کے علاوہ انگریزی زبان سے بھی واقفیت تھی۔

ماہر فریدی ۳ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کھڑگپور مغربی بنگال سے ہجرت کر کے سیدپور آئے اور ریلوے کے جنرل اسٹور میں ملازمت کرتے رہے۔ ۱۹۶۸ء میں سیدپور میں اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انہیں بچپن ہی سے شاعرانہ ماحول ملا تھا۔ ادب نوازی ان کا فطری رجحان رہا۔ مغربی بنگال میں وہ انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے اور سیدپور میں بھی وہ انجمن ترقی اردو سے منسلک رہے۔ قیام بنگلہ دیش کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔ ۴ر اگست ۱۹۸۴ء کو کراچی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ ماہر فریدی کا شمار نئیں صدی کے معیاری شعراء میں ہے۔ ان کی شعری تخلیقات مختصر ہیں لیکن قابل قدر ہیں۔ ان کی شاعری میں وقت کی آواز ہے۔ ماہر فریدی کی شاعری غم جاناں و غم دوراں کی ترجمان ہے۔ ان کے اشعار میں تاریخی حوالے بھی ہیں اور زمانے کی سمت ظریفی کے خلاف جد وجہد کی تلقین بھی کی ہے۔ نظم گوئی میں وہ علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی سے متاثر ہیں۔ ان کی غزلوں میں صوفیانہ رنگ عیاں ہے۔

شاہین بدر علامہ ماہر فریدی کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"کلکتے میں مسلم لیگ کے ایک جلسے میں بانی صدارت محمد علی جناح کر رہے تھے اس موقع پر ماہر فریدی نے اپنی لکھی ہوئی دس بند پر مشتمل نظم "ذرا سن اے پاکستان" پڑھی۔ جسے سن کر محمد علی جناح بہت محظوظ ہوئے تھے۔ اور بڑی گرم جوشی سے ماہر فریدی سے مصافحہ کیا تھا!"[1]

اس نظم کا پہلا بند یہ ہے:

سن اے مسلم ذرا اب اس طرف بھی دھیان ہو جائے۔
خدا یا کاش مستحکم ترا ایمان ہو جائے
نبیؐ کی ذات اقدس کا اگر عرفان ہو جائے
جو سچے حال میں اسلام تیری شان ہو جائے
زمیں کیا ہے؟ زمانہ تابع فرمان ہو جائے
جہاں تیرے قدم پہنچیں وہ پاکستان ہو جائے

---

[1] شاہین بدر، "علامہ ماہر فریدی ۔ ایک مطالعہ" رسالہ انتخاب سیدپور نومبر ۱۹۸۶ء ص ۵۵

Dhaka University Institutional Repository

سنہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کی سیاسی حالات سے متاثر ہو کر انہوں نے ۲۳ بند کی ایک طویل نظم لکھ کر محمد علی جناح کی خدمت میں رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجدی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی رسید بھی ماہر صاحب کو موصول ہوئی تھی۔

اس نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

وقت پر سب وحدت ملّی کے دیوانے ہوئے
کام پورا ہو گیا تو اپنے بیگانے ہوئے
اجنبی سے ہو رہے ہیں جانے پہچانے ہوئے
رشتہ تسبیح ٹوٹا منتشر دانے ہوئے

ایسے پاکستان کو اے قائد اعظم سلام

ماہر فریدی کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل ان کی تین نثری کتابیں شائع ہوئیں وہ یہ ہیں۔

(۱) نور المبین (میلاد)
(۲) بچوں کی بحث
(۳) الٹ پھیر۔

نمونہ غزل:

وہ خواب ہوں جس خواب کی تعبیر رہے گی
میں تو نہ رہوں گا، مری تصویر رہے گی
گو شمع صفت بزم سے خاموش اٹھوں گا
گویا میرے اشعار کی تحریر رہے گی
جو خوبیاں اسلام کی ورثے ہیں مسلمی میں
وہ عزت ناموس وہ توقیر رہے گی
تو بخش ہی دے گا، تری رحمت پہ یقیں ہے
ماہر کی جو جھوٹی بڑی تقصیر رہے گی

۱؎ رسالہ انتخاب، سیدپور ۱۹۸۶ء (خصوصی نمبر) ص ۵۱ و (شمارہ ۲) ص ۱۲

Dhaka University Institutional Repository

رفیع احمد فدائی

(م - ۱۹۸۸ء)

مکمل نام۔ رفیع احمد۔ تخلص فدائی ہے۔ رفیع احمد فدائی کا آبائی وطن 'بہار' تھا۔ ان کے والد کسب معاش کے سلسلے میں کلکتے میں رہتے تھے۔ رفیع احمد کی پیدائش کلکتے ہی میں ہوئی اور وہیں پروان چڑھے۔ انہوں نے ۱۹۴۴ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا اور ۱۹۶۸ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کے ماتحت پرائیوٹ طور پر بی۔ اے کی ڈگری لی۔ وہ ۱۹۵۱ء میں ڈھاکا آ گئے اور مستقل طور پر بود و باش اختیار کی۔ ان کی ذہنی نشوونما مغربی و مشرقی بنگال کے ادبی و ثقافتی ماحول میں ہوا۔ اسی بنا پر انہیں بنگلا زبان و ادب کے بنگال کے رسم و رواج سے بھی واقفیت حاصل تھی۔ خاص کر سابق مشرقی پاکستان آنے کے بعد انہوں نے بنگلا زبان میں مزید تعلیم حاصل کی تھی۔ اس سلسلے میں ان کی صلاحیت کا یہ عالم تھا کہ وہ بنگلا زبان میں افسانہ لکھ لیتے تھے۔

اردو ادبی حلقے میں رفیع احمد کی حیثیت مختلف الجہات ہے۔ وہ صحافی، مترجم، شاعر، افسانہ نگار اور مقالہ نویس (وکاہیہ انشائیہ) کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ لیکن ان کی شہرت کا باعث تراجم نگاری ہے۔ رفیع احمد فدائی نے متعدد اردو کتابوں کو بنگلا زبان میں منتقل کیا۔ وہ تراجم کرتے ہوئے تخلیق کی اصل صفات کو برقرار رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تراجم شدہ کتابوں میں قاری کو اصل کا گمان ہوتا ہے۔ رفیع احمد فدائی کی بنگلا سے اردو میں منتقل کی ہوئی کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

اصل	نام مصنف	تراجم
بشو نبی	کوی غلام مصطفیٰ	سرورِ کائنات[1]
مریتو کھودا	قاضی نذرالاسلام	جواء العجل (افسانہ)
بؤ بیگم	پرنسپل ابراہیم	بہو بیگم (〃)
آلو بخارا	〃 〃	آلو بخارا (طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
جھکا لتا	کوی معین الدین	جھکا لتا (مختصر افسانوں کا مجموعہ)

---

[1] اثاثۂ حیات، رفیع احمد فدائی۔ مرتب، ہمایوں ظفر۔ فدائی اکاڈمی کراچی ۱۹۹۶ء۔ ص ۲۲

Dhaka University Institutional Repository

کتابوں کے عنوانات کے تراجم سے سے ظاہر ہے کہ مترجم کو صلاحیت ہے۔

جواُ العجل سے ترجمے کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

"جس طرح ایک ہی مالک کے پالتو کتے اور بلی مجبوراً ایک دوسرے کو برداشت کر لیتے ہیں۔ یہی حال ان لوگوں کا بھی ہے۔ یہ ایک دوسرے پر غراتے تو بہت ہیں لیکن ان بے چاروں کی زندگی میں اتنی فرصت ہی نہیں کہ آپس میں بڑے پیمانے پر لڑ جھگڑ سکیں۔"[1]

رفیع احمد فدائی کی دیگر اہم خدمات وہ کتابیں ہیں جو اس وقت پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان رابطے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یعنی انہوں نے اردو اہل زبان کے لئے بنگلا اور بنگالی اہل زبان کے لئے اردو سیکھنے کی غرض سے "بنگلا سکھا" (بنگلا تعلیم) اور اردو ورڈ بک (اردو تعلیم) جیسی مفید کتابیں تحریر کیں۔ یہ کتابیں اسوقت دونوں بازوؤں (اردو۔ بنگالی) میں مقبول ہوئیں۔[2]

مذکورہ ادبی کارناموں کے علاوہ رفیع احمد فدائی کا اہم میدان صحافت ہے۔ انہوں نے اردو بنگلا دونوں زبانوں کے جریدوں اور روزناموں میں قابل قدر صحافتی خدمات انجام دیں۔

ادبی طرز نگارش میں صحافت نگاری ایک علیحدہ خصوصیت کی حامل ہے اس کے لئے فن کار کی وسیع سیاسی بصیرت اور پختہ قوت مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ رفیع احمد فدائی ان خصوصیات کے کماحقہ حامل تھے۔

انہوں نے ۱۹۴۷ء میں روزنامہ "الحق" کلکتہ سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ کلکتہ سے نکلنے والے "کارواں، آزاد ہند، استقلال، اجالا، انقلاب، آفتاب، نقاش اور عصر جدید" سے بھی صحافی کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ ڈھاکا میں پہلے روزنامہ "پاکستان" کے ایڈیٹر پھر روزنامہ "ستارہ" میں بحیثیت سب ایڈیٹر فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۸ء تک اور ۱۹۶۶ء کے بعد کچھ دنوں تک روزنامہ "پاسبان" ڈھاکا کے ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔ "شیشہ و تیشہ" عنوان کے تحت "پاسبان" میں ظکاہیہ کالم بھی لکھتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں اردو کا ہفت روزہ اخبار "سب رنگ" کی ادارت میں ۱۹۶۱ء تک شامل رہے۔ ڈھاکا سے شائع ہونے والے دوسرے اردو اخبار "ہماری آواز" "وطن" میں بھی صحافتی خدمات انجام دیں۔[3]

---

[1] رفیع احمد فدائی۔ جواء العجل۔ ڈھاکا ۱۹۶۰ء ص ۱۱

[2] اثاثۂ حیات، رفیع احمد فدائی۔ ص ۱۵

[3] " " " ۲۲

Dhaka University Institutional Repository
82

جب ۱۹۵۸ء میں حاجی بشیر نے "پاسبان" کو خرید کر اپنے ہونے والے بہنوئی مصطفےٰ حسن کو دیدیا تو مصطفےٰ "پاسبان" کے ایڈیٹر بنے۔ اس موقع پر کچھ دنوں کے لئے فدائی "پاسبان" سے علیحدہ رہے اور کسب معاش کے لئے دوسرے ذرائع سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے "ویلج ایڈ" (ادارہ) میں ملازمت شروع کی جو بعد میں "ایگریکلچرل انفارمیشن" میں تبدیل ہو گیا۔ اس ادارے میں رفیع احمد اردو بنگالی ٹرانسلیٹر سب ایڈیٹر کی حیثیت سے قیام بنگلہ دیش ۱۹۷۱ء تک کام کرتے رہے۔ اس ادارے میں "کریشی کتھا" کے نام سے بنگلہ زبان میں ایک جریدہ نکلتا تھا۔ موصوف اس جریدے کے لئے مغربی پاکستان زرعی اطلاعات" سے اردو مضامین کا بنگلہ مضامین ترجمہ کرتے تھے۔ اس سرکاری جریدے کے علاوہ مولانا اکرم خاں کے "محمدی" اور "آج" اور محی الدین صاحب کے "مدینہ" میں بھی ان کی کہانیاں اور مضامین شائع ہوتے رہے[۲]۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد دو سال تک ہندوستان میں جنگی قیدی کی حیثیت سے دن گزارنے کے بعد رہائی ملی اور ۲۳ اکتوبر ۷۳ء کو کراچی پہنچے۔ وہاں کچھ دنوں تک ہفت روزہ "معیار" اور روزنامہ "اعلان" سے منسلک رہے۔ کراچی میں وہ اپنے آخری ایام تک روزنامہ "جنگ" کراچی سے وابستہ رہے۔ ۱۳ مئی ۱۹۸۵ء کو کراچی میں انتقال کیا اور پیوند خاک ہوئے۔

ناسپاسی ہو گی اگر اس صاحب فن صحافی کے شعری ذوق کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ صحافت ان کا پیشہ تھا۔ شاعری اور افسانے انہوں نے شوقیہ لکھے۔ ایک اچھے ہونے کی حیثیت سے سماج پر ان کا قوت مشاہدہ پختہ تھی۔ سماج میں پرورش پانے والے برے کرداروں کی مذمت کرنا ان کا نصب العین تھا۔ شاعری میں بھی ان کا مقصد یہی رہا۔ اور اس کے لئے انہوں نے سنجیدہ شاعری کے پہلو بہ پہلو طنزی شاعری کو بھی ترجیح دی۔ شاعری میں ان کا طرز نگارش اکبر الہ آبادی سے متاثر تھی۔

مثال:

بہت پتلا ہے یارو حال اپنا اس زمانے میں
جدھر دیکھو اُدھر ہوتا ہے گھپلا اس زمانے میں

مصافِ زندگی میں "سیرتِ فولاد" کی باتیں
سمجھ سکتا نہیں کالج کا لڑکا اس زمانے میں

نہ کر علم و ادب کی بات اب ہرگز فدائی تو
ہوا ہے زر کے آگے علم رسوا اس زمانے میں

---

۱ "اثاثۂ حیات" رفیع احمد فدائی ص ۱۲
۲ ایضاً ص ۱۵

Dhaka University Institutional Repository

وقتاً فوقتاً انہوں نے سنجیدہ شاعری پر بھی طبع آزمائی کی ہے جس میں روایتی اصول کو برقرار رکھتے ہوئے جدید فکر و تخیل سے فائدہ لیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے زندگی کے تلخ تجربے کو شعری جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

مثال : الم کی موجوں میں تنہا ہی مسکراتا ہوں
کسے پڑی ہے سہے غم یہاں کسی کے لئے

زبان بند رکھ اپنی فدائی دنیا میں
نہیں یہاں ہے جگہ صدق و راستی کے لئے

ترجموں کے علاوہ رفیع احمد فدائی نے طبع زاد افسانے بھی لکھے۔ ان کے افسانوں کا مرکزی خیال معاشرہ کی اصلاح پر مبنی ہے معاشرہ میں بدچلن و بدفطرت مرد و عورت کے خصائل، مثلاً چوری، اغوا، لالچ وغیرہ ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ فنی اعتبار سے ان کے افسانے کمتر سہی مقصد کے اعتبار سے مفید ہیں۔ ان کے افسانوں میں "چور" "چیف گیسٹ" وغیرہ اچھے افسانے ہیں۔ ان میں موجودہ دور کے سماج کی عکاسی ہے۔ افسانے کا پلاٹ اور کردار انہوں نے اپنے ماحول سے اخذ کئے۔ واقعات کے بیان میں سچائی ہے۔ ان کے افسانوں میں قاری کو اپنے سماج کا عکس نظر آتا ہے، دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔

اس ہمہ جہت شخصیت نے تمام عمر ادبی خدمات میں گزار دی۔ یہی ان کا پیشہ اور نشہ تھا۔

Dhaka University Institutional Repository

ایاز عصمی

۱۹۹۰/۸۹-

ایاز عصمی ۱۹۴۷ء کے بعد سابق مشرقی پاکستان آئے۔ اس سرزمین کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ بنگلہ دیش کے ادبی حلقے میں ان کی پہچان افسانہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے ہے۔ افسانہ نگاری ان کا مشغلہ اور صحافت ان کا پیشہ تھا۔ انہیں اردو کے علاوہ بنگلہ زبان سے بھی واقفیت تھی۔ ان میں افسانہ نگاری کی صلاحیت تھی۔ ان کے افسانے زیادہ تر متوسط طبقے سے وابستہ ہیں۔ افسانے کے کردار انہوں نے اپنے اردگرد کے ماحول سے اخذ کئے ہیں۔ ایاز عصمی نے معاشرتی افسانے بھی لکھے۔ معاشی بدحالی، جنسی الجھاؤ، خانگی تصادم، ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان کا طرز بیان دلنشیں اور پُر اثر ہے۔ شروع سے آخر تک واقعات میں تسلسل رہتا ہے۔

ایاز عصمی نے افسانہ نگاری کے علاوہ بنگلہ دیش کی مشہور لوک فلم "روپ بان" کا اردو ورژن کا مکالمہ بھی لکھا روزنامہ "پاسبان" ڈھاکا کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی کچھ دنوں تک وابستہ رہے۔ ۱۹۷۰ء میں ایاز عصمی نے عشرت کلکتوی کے ساتھ مشترکہ ادارت میں ڈھاکا سے ماہنامہ "شعاع" شائع کیا!

ایاز عصمی ۱۹۷۱ء میں انقلاب بنگلہ دیش کے نامساعد حالات سے مجبور ہو کر کراچی ہجرت کر گئے۔ وہاں انہوں نے روزنامہ "امن" روزنامہ "مساوات" اور ہفت روزہ "نوائے وقت" میں صحافی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں[۲] کراچی میں آخری ایام تک صحافت نگاری سے وابستہ رہے۔ ۱۹۹۰/۸۹ء کے درمیان انہوں نے کراچی میں انتقال کیا۔ اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

نمونہ افسانوی نثر:

"جاڑا، گرمی، برسات، کسی حالت میں اس لائحہ عمل میں سرمو فرق نہیں پڑتا تھا۔ شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کی چنگاریاں پھوٹ پڑیں اور حکومت نے اس آگ کو پھیلنے سے روکنے کے لئے کرفیو لگا دیا تو نعیم میاں نے اپنے معمولات کو تعطل سے بچانے کے لئے کرفیو پاس نکلوالیا۔ حالانکہ کرفیو پاس نکلوانے کے لئے انہیں کافی بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی۔ بڑی سفارش، پیروی کے بعد کرفیو پاس ملا تھا انہیں۔۔۔!"

---

[۱] شہزاد منظر "پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال"، پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی ۱۹۹۵ء ص ۲۰۳ [۲] ایوب جوہر "ایاز عصمی کی یاد میں" انکشاف خصوصی اشاعت جنوری ۱۹۹۰ء ص ۵۲۔ [۳] ایاز عصمی۔ "دائرے" دبستان مشرق، مرتب علی حیدر ملک) کھلنا ص ۷۷

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر ذکی آذر

(۱۹۴۰ء - ۱۹۹۹ء)

نام ذکی احمد صدیقی۔ قلمی نام۔ ذکی آذر۔ تخلص آذر۔ پیدائش ۱۹۴۰ء میں سرائے ساہو ضلع سارن (چھپرا) بہار میں ہوئی[1]۔ والد کا نام شیخ محمد ظہیر الحق[2]۔ ذکی آذر، مشرقی پاکستان کے مقبول ناقد و شاعر نظیر احمد صدیقی کے برادر خرد تھے۔ ۱۹۴۸ء میں والدین کے ہمراہ ڈھاکہ آئے۔ ڈھاکا بورڈ سے میٹرک و انٹرمیڈیٹ، قائداعظم کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ موصوف ڈاکٹر عندلیب شادانی کے شاگرد تھے۔

ذکی آذر کا پیشہ درس و تدریس تھا۔ جنوری ۱۹۶۷ء میں انٹر کالج سلہٹ (سابق مشرقی پاکستان) میں بحیثیت لکچرر ان کا تقرر ہوا۔ انقلاب بنگلہ دیش کے نامساعد حالات سے مجبور ہو کر ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد ۱۹۷۴ء میں اسلام آباد پہنچے۔ وہاں چار سال تک پنجاب گورنمنٹ کالجوں میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں بعد ازاں اسلام آباد میں وفاقی حکومت کے ایک کالج میں لکچرر کی حیثیت سے زندگی کے آخری ایام تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ پہلی اکتوبر ۱۹۹۹ء کو کراچی میں انتقال کیا۔

اختر لکھنوی، ذکی آذر کی شاعرانہ حرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ذکی آذر اردو میں غالب، اقبال، فراق، جمیل مظہری، ن۔ م راشد، مختار صدیقی اور محبوب خزاں کی شاعری سے متاثر تھے۔ فارسی میں حافظ، فردوسی، خسرو اور بیدل کی شاعری کو پسند کرتے تھے۔ انگریزی میں شیکسپیر اور ٹی۔ ایس ایلیٹ اور ہندی میں کبیر داس، تلسی داس اور ہیرا بائی کے دوہے گیت اور بھجن پسند تھے۔"[1]

آذر کا کلام برصغیر کے معیاری ادبی رسائل مثلاً "ادب لطیف" لاہور، "نصرت" لاہور، "شیپ" کراچی، ماہنامہ ساقی کراچی

---

[1] [2] حاصل سفر۔ "ذکی آذر (شعری مجموعہ) مرتب نظیر صدیقی۔ ایجوکیشنل پریس کراچی۔ ۱۹۹۴ء ص ۷

[2] ایضاً ص ۳۴

Dhaka University Institutional Repository

ماہنامہ "ہم قلم" کراچی۔ سات رنگ کراچی، ماہنامہ "ندیم" ڈھاکا۔ کرنافلی چائنگام۔ وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ ان کا شعری مجموعہ "حاصل سفر" ان کے انتقال کے بعد ۱۹۹۴ء ایجوکیشنل پریس کراچی سے شائع ہوا۔

ذکی آذر نے کسی سے اصلاح سخن نہیں لیا۔ وقتاً فوقتاً عندلیب شادانی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ان کا ذوق ادب ان کے بڑے بھائی نظیر صدیقی کے سائے میں پروان چڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب تحریر میں خواہ غزل ہو یا نظم نظیر صدیقی کا نقش نمایاں ہے۔

ذکی آذر کا شاعرانہ مزاج کلاسیکی ہے۔ لیکن وہ جدید اسالیب و تراکیب کو باصلاحیت اپنانے کے قائل تھے۔ شعری و ادبی نگارشات میں وہ تقاضائے وقت کے موافق رواں رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی شاعری فکر و احساسات کی شاعری ہے۔ آذر کا فکری رجحان سابق مشرقی پاکستان کے جدید رجحان کی طرف مائل رہا۔ انہوں نے نظم و غزل کے علاوہ مفید مضامین بھی لکھے۔ لیکن ان کے فکری و فنی جوہر غزل میں نمایاں ہیں۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق کی داستان سے لے کر عصری ماحول اور معاشرے کی ناانصافیوں کا غم ہے۔ آذر کی شاعری میں داخلیت اور جمالیت کا امتزاج ہے۔ انہیں سرزمین بنگلادیش سے بڑا پیار تھا۔ بنگلادیش کی بوڑھی گنگا ندی، ماجھی کے بھٹیالی سُر، ندی کے کنارے ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری چادر نے ان کے دل کو موہ لیا تھا۔ ان دلفریب مناظر میں وہ صرف محظوظ نہیں ہوئے۔ بلکہ اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "زرد مہتاب" اور "من کی آگ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انقلاب بنگلادیش کو وہ خاموش تماشائی بن کر نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں دھیمی اور پرسوز انداز میں ان پُر آشوب دور کی ترجمانی کی۔ بحیثیت مجموعی ان کی شاعری تفسیر حیات بھی ہے اور تفسیر زمان و مکاں بھی۔ انہوں نے تمام باتیں اشارے اور کنائے میں کہی ہیں۔ انداز بیان میں سچائی اور دل نشینی بدرجہ اتم موجود ہے۔

ان خوبیوں کے علاوہ ان کے کلام میں کماحقہ ابہام کی خامیاں ملتی ہیں۔ ذیل میں سے متعلق ان کی نظم "من کی آگ" سے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

من کی آگ

(عورت کی زبان سے)

:: جادو کا یہ دیس پریتم! مجھ کو کبھی نہ بھایا

:: سابق مشرقی پاکستان (بنگلادیش)

Dhaka University Institutional Repository

سکھیاں میری دیکھ جلے ہیں کیا سکھ میں نے پایا
پھولوں کی کنج میں مجھ کو دھوپ ملی نہ چھایا
جادو کا یہ دیس پریتم! مجھ کو کبھی نہ بھایا

غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں انقلاب بنگلادیش کے پر آشوب دور کی عکاسی ہے۔

تھا گرد سے اٹا ہوا سر پہ چمکتا چاند
اور ذرہ ذرہ ریت کا تھا ایک جھلکتا چاند
کس درجہ زرد تھا فلک پر سرکتا چاند
دیکھا تھا سرخ فرش پہ اس نے سسکتا چاند
دریا کا پانی خون سے گل رنگ ہو گیا
خاموش دیکھتا رہا تنہا چمکتا چاند
گزری وہ بھی شب کہ قیامت کا تھا سماں
نیچے دہکتی آگ تھی، اوپر دہکتا چاند
آذر لہو ترنگ نہ ہو کیوں غزل کہ آج
گزرا ہے گنگناتا ہوا کچھ سنکتا چاند

ذیل میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے جو فکری و فنی لحاظ سے مفید کہے جا سکتے ہیں۔

شاید کوئی خیال حقیقت سے جا ملے : آذر ترا شتے رہو پیکر خیال کے

میری زندگی کا حاصل یہی تشنگی ہے میری ۔ یہی آگ زندگی ہے کہیں یہ بھی بجھ نہ جائے
یہی حاصل سفر ہے، یہی داستاں ہے میری ۔ میری آنکھ میں فروزاں، میری آرزو کے سائے
میرا سر ہی سائباں تھا، میری آگ زندگی تھی ۔ انہیں دھوپ کھا گئی ہے، جو چلے تھے سائے سائے

Dhaka University Institutional Repository

شہاب الدین رحمت اللہ

(۱۹۱۳ء — ۱۹۹۱ء)

نام شہاب الدین رحمت اللہ۔ تخلص شہاب۔ والد محمد یونس، آرہ کے بڑے زمینداروں میں تھے۔ والدہ بہار کے مشہور شاعر اور عالم امداد امام اثر کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ شہاب کی پیدائش ۹ جون ۱۹۱۳ء کو بہ مقام آرہ بہار میں ہوئی۔ شہاب کی پرورش علمی و ادبی ماحول میں ہوئی۔ گورنمنٹ کالج پٹنہ سے ۱۹۳۳ء میں بی۔اے آنرس کا امتحان پاس کیا۔[1] ۱۹۳۵ء میں S.C.S. کے مقابلہ امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں نتروکونہ (میمن سنگھ) میں بحیثیت S.D.O. ان کا تقرر ہوا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء میں سابق مشرقی پاکستان میں ڈھاکا کے پہلے D.C. مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک صوبۂ بنگالہ اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک سابق مشرقی پاکستان کے مختلف مقامات میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ سابق مشرقی پاکستان میں مسلسل کمشنر رہنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں سکریٹری پاکستان منصوبہ بندی کمیشن کی حیثیت سے آئی۔ سی۔ ایس پنشن کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔[2] انہوں نے سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران اردو داں طبقے کے بچوں کے لئے چھوٹے بڑے تعلیمی ادارے قائم کئے۔ جن میں قائداعظم کالج۔ رحمت اللہ انسٹی ٹیوٹ۔ رحمت اللہ اکیڈمی، نرائن گنج۔ رحمت اللہ ماڈل ہائی اسکول ڈھاکا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔[3]

قیام بنگلہ دیش کے بعد شہاب نیپال اور تھائی لینڈ کے راستے ۳۰ جون ۱۹۷۲ء کو کراچی پہنچے۔ وہاں آخری دم تک ادبی خدمات میں مصروف رہے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو کراچی ہی میں وفات پائی۔

شہاب، دبستان اردو میں شاعر، مضمون نگار اور مترجم کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں، انہیں ملازمت کے پہلو بہ پہلو ادب نوازی کا بھی شغف رہا۔ بہ قول وفا راشدی

"شہاب الدین رحمت اللہ انگریزی اردو کے معروف شاعر اور مترجم تھے۔ انہیں فن مصوری سے فطری شغف تھا

---

[1] "میرے بزرگ میرے ہم عصر"، ایجوکیشن پریس کراچی ۱۹۹۵ء ص ۱۸۸

[2] " ایضاً ص ۱۸۹

[3] " ایضاً ص ۱۸۹

Dhaka University Institutional Repository

جوانی میں شہسواری اور شیروں کے شکار کا شوق رکھتے تھے۔ فوٹوگرافی میں شہرت کی وجہ سے برٹش رائل سوسائٹی لندن اور علامہ اقبال سے عقیدت کی بنا پر اقبال اکیڈمی پاکستان کے لائف ممبر رہے [1]

ان کے تصنیفات درج ذیل ہیں :

(۱) آرٹ اِن اردو پوئٹری :

یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوئی۔ اردو شاعری کی ابتدا سے اقبال تک کے اردو شعراء کا انگریزی میں پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں اردو اشعار کے منظوم انگریزی ترجمے ہیں۔ اشعار سے متعلق تصویریں بھی شہاب کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے فن مصوری کو پاکستان کے عظیم "مصور" عبدالرحمٰن چغتائی نے بہت پسند کیا۔ اس منظوم تراجم (آرٹ ان اردو پوئٹری) کا پیش لفظ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا اور اس کی افادی اہمیت کی داد دی۔

(۲) ہنڈریڈ جیمس فرام غالب (غالب کے سو اشعار) ناشر نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی ۱۹۸۰

اس میں شہاب کی پینٹنگ کے علاوہ چغتائی اور صادقین کی بنائی ہوئی تصاویر بھی شامل ہیں۔

(۳) ٹین جیمس فرام غالب (مصور) مطبوعہ کلکتہ ۱۹۴۳ء

یہ غالب کے دس منتخب اشعار کا منظوم ترجمہ ہے۔ سر تیج بہادر، سر رادھا کرشن اور ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی وغیرہ نے اس ترجمے کی بڑی پذیرائی کی [2]

مبارک عظیم آبادی نے اس کتاب کے بارے میں اپنا تاثر ایک نظم کی شکل میں پیش کیا جس کا پہلا شعر یہ ہے

یہ ٹین جیمس غالب کے ہیں وہ جواہر
ہر اک کو جواہر کی اک کان کہیے

ٹین جیمس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوا جس کا پیش لفظ اس وقت کے گورنر بنگال کی اہلیہ لیڈی مالیپ کیبی نے لکھا تھا [3]

مرقع شہاب : (غزلوں کا مجموعہ) پہلا ایڈیشن کراچی سے دوسرا دہلی سے شائع ہو۔

---

[1] [2] [3] میرے بزرگ میرے ہم عصر ۱۸۹ - ۱۹۰ - ۱۹۱

Dhaka University Institutional Repository

(۵) سحرِ حلال ۔ مرتبہ ڈاکٹر وفا راشدی ۔ مکتبہ اشاعت اردو کراچی ۔ ۱۹۸۵ء

یہ شہاب کے نظموں کا مجموعہ ہے ۔ اس میں شہاب نے اشعار کے حوالے سے تصاویر بنائی ہیں ۔

(۶) فریادیات کے نام سے تیسرا شعری مجموعہ زیرِ ترتیب تھا کہ موصوف گزر گئے ۔

بہ قول ڈاکٹر یوسف حسن :

"مرقعِ شہاب میں ۸۲ غزلیں اور ۵۰ مرقعے ہیں ۔ شہاب صاحب نے غالب کی غزلوں کی زمین اور قافیہ و ردیف میں اپنی غزلیں کہیں ہیں ۔ اور ہر ایک غزل میں سے ایک شعر کے مرکزی خیال کو تصویر میں پیش کیا ہے"[1]

شہاب کے اشعار میں کوئی نیا تفکر نہیں ۔ البتہ یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ شہاب میں شعر کہنے کی صلاحیت، زبان و بیان پر قدرت اور الفاظ کے انتخاب و استعمال کا سلیقہ جو معیاری شاعر میں ہونا چاہیئے وہ موجود ہیں ۔

ذیل میں چند اشعار بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں ۔

غالب سے شہاب آپ کے اشعار جدا ہیں
لے اس کی ہے، پر آپ کا اندازِ بیاں اور

شاہکارِ شوق کہیئے کاتبِ تقدیر کا
ہے مرقع درد کا پیکر ہر اک تصویر کا

زندگانی کا مقدر اس میں مضمر ہے شہاب
حلقۂ تقدیر ہے، حلقہ ہر اک زنجیر کا

---

[1] ڈاکٹر یوسف حسن "مرقعِ شہاب" "انتخاب" سیدپور ۔ شمارہ (۳) ص ۲۵

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر فروغ احمد

(۱۹۲۰ء - ۱۹۹۴ء)

مکمل نام۔ محمد فروغ احمد۔ تخلص فروغ۔ ۱۹۲۰ء میں مونگیر کے پابند صوم وصلوٰۃ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے[1]۔ والد ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ ۱۹۴۱ء میں میٹرک اور ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تقسیم ہندوستان کے نامساعد حالات سے مجبور ہو کر ۱۹۴۹ء میں وہ سابق مشرقی پاکستان آئے۔ اپنے خورد و نوش کی کفالت کے لئے رحمت اللہ ہائی اسکول ڈھاکا میں بطور معلم ملازمت شروع کی۔ ان تدریسی ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہوئے ڈھاکا یونیورسٹی سے ایم۔ اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور گولڈ میڈل کے مستحق بنے۔ اس کے بعد قائداعظم کالج ڈھاکا میں کل وقتی اور ڈھاکا یونیورسٹی میں جز وقتی طور پر ملازمت شروع کی[2]۔ پاسبان ڈھاکا اور ہفت روزہ مسلم (انگریزی اخبار) کے ایڈیٹر رہے۔ قیام بنگلہ دیش کے بعد ۱۹۷۳ء میں لاہور چلے گئے اور وہاں "تسنیم (جریدہ)" کی عارضی ادارت سنبھالی۔ ریڈیو پاکستان سے صبح کی خبروں سے پہلے "قرآن حکیم اور ہماری زندگی" کے عنوان سے کئی سال تک ان کی تقریریں نشر ہوتی رہیں لاہور کی اردو ادبی سرگرمیوں میں بڑے انہماک سے وہ حصہ لیتے رہے۔ آغاز ہی میں ادارہ "نور" اور ماہنامہ "بتول" کے جنرل مینجر بنا دیئے گئے۔ پھر ماہنامہ "سیارہ" میں بھی ان کو حلقہ ادارت میں جگہ مل گئی۔ فروغ احمد نے بنگلا دیش میں (۱۹۴۹ء - تا ۱۹۷۳ء) ۲۲ سال اور پاکستان میں (۱۹۷۳ء تا ۱۹۹۴ء) ۲۱ سال گزارے۔ انہوں نے اپنی ۷۴ سالہ زندگی میں دو حکومتوں کی کایا پلٹ دیکھی لیکن صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان سیاسی خلفشار نے ان کے قوت فہم کو پختہ بنا دیا تھا۔ بنگلہ دیش اور پاکستان دونوں جگہ انہوں نے ادبی سرگرمیوں میں بڑی خندہ پیشانی سے حصہ لیا۔

فروغ احمد اردو ادبی حلقے میں صحافی، مضمون نگار، نقاد اور شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ فروغ ادب برائے اسلام کے حامی تھے۔ ادب اور تنقید اپنے آپ کو اسلامی نظریات کے تابع رکھنا چاہتا ہے۔ فروغ کا مطمح نظر اسلامی اصول کا پابند تھا۔ سیاسی معاملے میں وہ جماعت اسلامی کے حامیوں میں تھے۔ شعر و ادب میں فروغ کا نقطہ تفکر حسن عسکری، سلیم احمد، اسعد گیلانی کے علاوہ بنگلا دیش کے بنگالی شاعروں میں کوی غلام مصطفیٰ فرخ احمد وغیرہ سے مماثل ہے۔ فروغ کو علامہ اقبال سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ وہ

---

[1] پروفیسر محمد عثمان رمز۔ فروغ احمد۔ اقبال اور تفہیم اقبال" سیارہ لاہور فروغ نمبر ستمبر ۱۹۹۵ء ص ۴۷

[2] نعیم صدیقی۔ فروغ بزم دین و ادب" " " " ص ۷

Dhaka University Institutional Repository

صوفیہ کلام اقبال سے متاثر تھے۔ انہوں نے ادب کو اسلام کی تبلیغ کا وسیلہ بنانا مصلحت سمجھا۔ یہ قول فروغ اسلام کا بنیادی مقصد اخوت، محبت، بھائی چارگی اور تحفظ انسانیت ہے۔ اس سلسلے میں فروغ کے تنقیدی مضامین "اسلامی ادب کی تحریک" "اسلامی ادب ۷۰ء تا ۷۹ء" "اسلامی ادب کے تنقیدی لوازم" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ فروغ احمد ترقی پسندوں کو اشتراکی ادب کے مترادف سمجھتے تھے۔

ان کے مقالے ماہنامہ سیارہ (لاہور) "بتول" (لاہور) چراغ راہ، ماہنامہ "فاران" (کراچی) "ساقی" (کراچی) سہ ماہی مجلہ "تخلیقی ادب"، روزنامہ "پاسبان" ڈھاکا وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔

انکی تنقید روایتی ہے۔ تنقید میں وہ مولانا شبلی و حالی سے متاثر ہیں، وہ تنقید کرتے ہوئے مصنف کو ایک ہمدرد دوست کی طرح مشورہ دیتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں سچائی، بے باکی بدرجہ اتم موجود ہے۔ بیان میں پیچیدگی نہیں۔ فروغ ایسے نقادوں میں سے ہیں جنکے یہاں سوچ بچار کے بعد پیش کئے ہوئے خیالات اور سلجھا ہوا انداز نظر آتا ہے

تنقید کے علاوہ فروغ نے ترجمے بھی کئے اور ڈرامے بھی لکھے۔ "افکار جوانوں کے" فروغ احمد کے ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں ان کے ڈرامے "افکار جوانوں کے" "منزل ہے کہاں تیری" "جب سلمی فتح ہوا" اور "نوائے وقت" کے عنوان سے ڈرامے شامل ہیں۔ فنی لحاظ سے ان کے ڈرامے کامیاب نہیں، فکری لحاظ سے عمدہ ہیں۔ یہ ڈرامے مقصدیت کے تحت لکھے گئے۔ مثلاً "افکار جوانوں کے" عنوان سے جو ڈرامہ لکھا ہے اس میں فکر اقبال کے چند اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ اس ڈرامے کو ڈھاکا یونیورسٹی کے طلبہ نے برٹش کونسل ہال کے آڈیٹوریم میں اسٹیج کیا تھا۔

دوسرا ڈراما "جب سلمی فتح ہوا" ایک ریڈیائی تشکیل ہے۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں "سلمی" کی فتح اس ڈرامے کا پلاٹ ہے۔ اسلام کی فتح اور ظلم کی شکست اس کا بنیادی مرکز ہے۔ اس میں فروغ نے اسلام کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

نثر کے علاوہ انہوں نے شاعری بھی مقصدیت کے تحت کی ہے جس کا بنیادی تصور مذہب اور اخلاق ہے۔ وقتاً فوقتاً سماج کی بے اعتنائی کی نشاندہی بھی ملتی ہے۔ طرز تحریر صاف اور رواں ہے۔ "سواء السبیل" فروغ کا ایک طویل اسلامی نظم ہے۔ اس نظم کا ماخذ قرآن مجید ہے۔

فروغ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

تفہیم اقبال : مطبوعہ سندھ اکاڈمی

تفہیم اقبال کو فروغ نے مرتب کیا۔ یہ چھ ابواب پر مشتمل علامہ اقبال سے متعلق مقالات کا

Dhaka University Institutional Repository

مجموعہ ہے۔ اس میں علامہ اقبال کے خطوط، عورت کلام اقبال کے آئینے میں، اقبال کا فلسفہ خودی، عقیدۂ آخرت، فکر اقبال میں بلندی" جیسے مفید عنوانات کے علاوہ "بنگلا زبان میں فکر اقبال کا اثر" کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔

نوائے بردہ (تراجم): ساتویں صدی ہجری میں مصر کے معروف نعت گو شاعر اور محدث علامہ محمد بن سعید البوصیری کا قصیدہ "قصیدۂ بردہ" کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ یہ تراجم ۱۶۴ شعروں پر مشتمل ہے جس کے دائیں صفحے پر عربی متن اور بائیں صفحے پر اردو منظوم ترجمہ ہے۔ یہ قصیدہ عشق خدا و رسول پر مبنی ہے۔

آپا حمیدہ بیگم: ایک محب دین متین اور علمبردار حق محترم خاتون کی سیرت اور سوانح ہے۔

اقبال کا پیغام خودی: ... علامہ اقبال کی خودی سے منسلک اشعار کی توضیح و تبصرہ ہے۔

سواء السبیل: (طویل اسلامی نظم) ۱۹۶۸ء میں لکھی گئی۔ ادارۂ مطبوعہ کراچی نے شائع کیا۔

ذیل میں سواء السبیل سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اہل نظر کو فکرِ سواء السبیل دیے
آوازِ انتباہ، بہ ہر سنگِ میل دیے
عشقِ غیور مستعدِ کارزار ہے
اس تازہ دم سپاہ کو حکمِ رحیل دیے
چشمِ بشر کو مشعلِ والشمس چاہیئے
شمعِ حیات کو نفسِ جبرئیل دیے
دعوے ان کے جتنے وہ باطل ہوئے ہیں سب
حق ہے ہمارے پاس تو اس کی دلیل دیں [1]

400590

---

[1] فروغ احمد، سواء السبیل، مطبوعہ ادارہ مطبوعات طلبہ، کراچی ۱۹۶۸ء

ঢাকা বিশ্ববিদ্যালয় গ্রন্থাগার

Dhaka University Institutional Repository

نمونہ نثر :

" ادب اور پاکیزگی دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ اچھا ادب وہ ہے جو پاکیزگی کا مرقع ہو۔ کوئی ادب اچھا ادب ہو ہی نہیں سکتا اگر وہ پاکیزگی کی قدروں کو پروان نہ چڑھائے ۔ ادب اور فوٹو گرافی میں بڑا فرق ہے ۔ بعض لوگ ادیب کا کام یہ سمجھتے ہیں کہ وہ معاشرہ کی عکاسی کرے گویا معاشرہ کے ذہن و جذبات کو سنوارنا اس کا کام نہیں ہے۔ ایسے کام واعظوں کے لئے محفوظ ہے ۔ مجھے اس نظریہ فن سے اختلاف ہے ۔ ہم کسی ادیب کو اس وقت تک اچھا ادیب نہیں سمجھ سکتے جبتک کہ وہ شریف النفس نہ ہو۔ اپنے کردار و اطوار میں، تخلیقات میں، اپنے رکھ رکھاؤ اور تعلقات میں صفائی، ستھرائی اور پاکیزگی کا ثبوت نہ دے۔[۱۴]"

---

[۱۴] فروغ احمد۔ "ادب، ادیب، اور معاشرہ" ماہنامہ سیارہ، فروغ نمبر ۱۹۹۵ء۔ ص ۱۴۲

Dhaka University Institutional Repository

اَفسر ماہ پوری

(۱۹۱۸ء - ۱۹۹۵ء)

ظہیر عالم صدیقی نام۔ تخلص افسر ماہ پوری۔ والد کا نام مولوی عبدالرحمٰن تھا۔ افسر ماہ پوری یکم دسمبر ۱۹۱۸ء (تعلیمی سند کے مطابق) کو (صوبۂ بہار) چھپرا ضلع کے ماہ پور موضع میں پیدا ہوئے[1]۔ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان دیا۔ اور اعزازی نمبر سے کامیاب ہوئے[2]۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد ہی بنگال سکریٹریٹ (رائٹرس بلڈنگ) میں ملازمت مل گئی۔ ۱۰ جنوری ۱۹۷۴ء کو حکومت بنگلہ دیش کے تحت اسی دفتر (سکریٹریٹ) سے پنشن ملی اور ۲۳ جنوری کو معہ اہل وعیال کے کراچی منتقل ہو گئے۔ زندگی کے آخری چوبیس[24] سال کراچی میں گزاری[3]۔

افسر ماہ پوری تقسیم ہندوستان کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا آگئے[4] اور مستقل سکونت اختیار کی۔ انہوں نے پہلی غزل یوم اقبال کے مشاعرے کے موقع پر کہی جس کی طرح تھی۔ "منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی"[5]

افسر ماہ پوری کا سرزمین بنگال سے تعلق کئی دہائیوں سے رہا ہے۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک غیر منقسم بنگال پھر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۴ء تک سابق مشرقی پاکستان اور بنگلادیش۔ اس عرصے میں وہ یہاں کے ادبی مراکز و فضا کو سمجھنے میں کامیاب ہوئے۔ صحیح معنوں میں ان کی ادبی صلاحیتوں نے مشرقی پاکستان میں مقام اعتبار حاصل کیا۔ ان کا ادبی ذوق و شوق اردو روایات ادب کے سایہ میں بنگال ہی میں پروان چڑھا۔ ان کے شعر و ادب کا ماخذ و اکتساب اس سرزمین کے عناصر ادب سے متاثر رہا۔ بلاشبہ ان کا شمار ان اردو شعراء و ادباء میں ہوتا ہے جنہوں نے یہاں کے نئے ادبی رجحانات کا خیر مقدم کیا اور اس سرزمین میں ایک ادبی مزاج کی تشکیل ہوئی۔ ان فنکاروں کا طرز بیان روایتی اسلوب سے منسلک ہوتے ہوئے بھی جداگانہ خصوصیت کا مالک ہے۔ اس گروپ میں سب کا تذکرہ یہاں مقصد نہیں۔ نقطۂ نظر کی توضیح کے لئے چند نام لکھنا ضروری سمجھتی ہوں۔ مثلاً سرور بارہ بنکوی، عابد داناپوری، وحید قیصر ندوی، رفیع احمد فدائی، احمد زین الدین،

---

[1] افسر ماہ پوری۔ "سوانحی خاکہ" نگار ماہ (نظمیں) ایجوکیشن پریس کراچی۔ ۱۹۷۲ء

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] ایضاً ص ۳۳

Dhaka University Institutional Repository

احمد سعدی، احسن احمد اشک، بیخود بنگالی، مسعود شہریار، ام عمارہ، غلام محمد، صلاح الدین محمد وغیرہ

پروفیسر جاذب قریشی افسر ماہ پوری کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"۔ ۔ ۔ ۔ انہیں شعر و ادب کے بدلتے ہوئے اسالیب کا بھی علم رہا ہے۔ اور انہوں نے ہمیشہ نئے اور پرانے رجحانات سے بھی آگاہی رکھی ہے۔ افسر صاحب نے شعر و ادب کی نئی سمتوں میں اپنا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ رومانی افسانے لکھے۔ اردو، انگریزی تنقیدی مضامین تحریر کئے۔ نظمیں اور غزلیں لکھیں اور بنگلا زبان کے شہ پاروں کے بہت سے ترجمے بھی کئے۔ اور پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نئے لکھنے والوں سے باخبر رہے۔"[1]

افسر ماہ پوری کے ادبی رجحانات پر جاذب قریشی کا تبصرہ معتبر ہے۔ چند سطور ملاحظہ فرمائیں۔

افسر ماہ پوری مشرقی پاکستان میں اہم ادبی مقام رکھتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہاں کی ادبی فضا کی تعمیر میں ان کا ہاتھ بھی تھا۔ وہ مشرقی پاکستان میں اردو کے باشعور ادیبوں میں سے تھے۔ جو ادب کو پیغام محبت سمجھتے تھے۔ اردو کے ساتھ ساتھ بنگلا ادب سے واقفیت اور دونوں زبانوں کی آگاہی نے انہیں خیر سگالی کا جوہر شناس اور خوش مشربی کا جوہر تراش بنا دیا تھا۔ افسر ماہ پوری نے نذر الاسلام کی مسلم تہذیب کی مناسبت رکھنے والی نظموں کا منظوم ترجمہ "جام کوثر" کے نام سے کیا تھا جو بنگلا اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد بنگالی نظموں اور بنگالی افسانے کے تراجم اردو کے مؤقر رسائل میں شائع ہوئے۔ اپنی ادبی صلاحیتوں کی وجہ سے افسر صاحب کو مشرقی پاکستان کی ادبی فضا کی فعال حیثیت تھی اور ان کی اپنی وسعت نظر کے سبب وہ اردو و بنگالی دونوں ادبی حلقوں میں مقبول و معروف رہے۔ افسر ماہ پوری کی ادبی صلاحیتوں نے مشرقی پاکستان میں مقام اعتبار حاصل کیا اور وہاں ان کو اردو ادب کی باکمال شخصیتوں سے صحبت کا شرف حاصل رہا۔ ان میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، وحشت کلکتوی اور تمنا عمادی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں[2]

افسر ماہ پوری کی تصنیفات یہ ہیں :

(۱) جام کوثر — قاضی نذر الاسلام کی اسلامی نظموں کی منظوم تراجم۔ بنگلا اکیڈمی ڈھاکہ ۱۹۶۳ء

---

[1] نگار ماہ (نظمیں) ص ۱۵-۱۶

[2] ایضاً

Dhaka University Institutional Repository

(۲) غبارِ ماہ - (غزلیں) ایجوکیشن پریس کراچی ۱۹۸۶ء

(۳) نگارِ ماہ (نظمیں) 〃 〃 ۱۹۹۲ء

(۴) طور سے حرا تک (حمد و نعت) پیرنٹو گراف پریس کراچی ۱۹۹۶ء

(۵) سوکھی پتیاں (افسانے) 〃 〃 〃 ۱۹۹۹ء

غیر مطبوعہ

(۶) دیارِ ماہ (غزلوں کا دوسرا مجموعہ)

(۷) اظہارِ خیال (تنقیدی و تاثراتی مقالے)

(۸) سرزمین خواب و آب (بنگالی شاعری ادب و ثقافت پر مضامین اور بنگالی کہانیوں کے تراجم)

دبستان اردو میں افسر ماہ پوری شاعر، مترجم، مضمون نگار، افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔

افسر نے شاعری میں غزل، نظم، حمد، نعت، رباعی وغیرہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی اور اپنی قادرالکلامی کا ثبوت پیش کیا۔ ان کی غزلوں میں قدیم و جدید رنگ کا ایک خوش آئند امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا، سمجھا، ان پر بیتی اسے شعروں میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اور حقائق کی ترجمانی میں سچائی سے کام لیا۔ افسر ماہ پوری کی غزلوں میں تجربات و مشاہدات کے علاوہ مذہبی رنگ بھی نمایاں ہے۔ ان خصوصیات نے انہیں ایک انفرادی رنگ عطا کی ہے۔

غبارِ ماہ سے چند اشعار بطور مثال ملاحظہ فرمائیں۔

دور سے بانگِ اذاں آنے لگی
جلد ہی نور کا تڑکا ہو گا

ہم کو کوئی گلہ نہیں گردشِ صبح و شام سے
راہِ وفا میں ہم لٹے اپنوں کے اہتمام سے

داستاں عمر پریشاں کی کہی ہے کتنی
کوئی بتلائے کہ اب رات ڈھلی ہے کتنی

Dhaka University Institutional Repository

دیکھ کے مجھ کو یہ انداز لگالو افسرؔ
رنج کتنا ہے زمانے میں خوشی ہے کتنی

پہچان آدمی کی نہیں سہل آج کل
اک آدمی چھپا ہوا ہر آدمی میں ہے

اک نظم نگار کی حیثیت سے افسرؔ اچھے شاعر ہیں۔ نگار ماہ ان کی کل چھیالیس نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان نظموں میں ان کی شخصیت اور عہد کی عکاسی ہے۔ نظم میں ان کی شاعری علامتی ہے۔ مکر و فریب، ضرب و کرب، تنہائی و جستجو، مایوسی حب الوطنی، جو دور جدید کے ہر انسان کا مقدر ہے افسرؔ کی نظموں میں عیاں ہے۔ انہوں نے وقت کے تقاضے سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں۔ نظموں میں انکی شاعرانہ صلاحیت اجاگر ہے۔ "ایک مکڑی" "زرد پتے" "درسِ عمل" "نغمۂ ملی" وغیرہ ان کی مفید نظمیں ہیں۔

افسرؔ کی نظموں میں قاضی نذرالاسلام کے خطیبانہ اور باغیانہ رنگ کی عکاسی کما حقہ نمایاں ہے۔ ان کی نظم "مغنیہ" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تاروں کو چھیڑ چھیڑ کر لرزا دے بزمِ کائنات
سوزِ نوائے ساز سے گرما دے محفلِ حیات
پھونک دے سحرِ سامری توڑ دے بندشِ جہات
چھیڑ دے ساز چھیڑ دے ہوتی ہے عقل ہوشیار
چھیڑ دے پھر مغنیہ، بربطِ زندگی کے تار

نعت گوئی میں افسرؔ نے روایت کی پاسداری کے پہلو بہ پہلو عصری مطالبات سے بھی ہم آہنگ کیا۔ آنحضرتؐ کی مدحت میں نہ کسی فرسودہ خیال کو پیش کیا اور نہ فلسفیانہ اشعار کہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اللہ و رسولؐ سے والہانہ عشق کا اظہار ان کے حمد و نعت کا بنیادی مقصد ہے۔ افسرؔ نے "پیغام" کے ساتھ "عمل" کے تقاضوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے یہاں بھی ان کا رنگ انفرادی ہے۔ افسرؔ کی نعتیہ شاعری غزل کے پیکر میں لکھی گئی ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

حمد و نعت کا نمونہ :-

خدمتِ مخلوق کی توفیق دے
یہ بھی تیری بندگی کا کام ہے

انساں سے پیار کرنا تری بندگی کے ساتھ
یہ بھی ہے راہ تیری رضا کے حصول کی

افسر ماہ پوری بنیادی طور پر شاعر تھے۔ لیکن نثر نگاری میں بھی انہوں نے مفید خدمات انجام دیئے۔ ان کے بیشتر مضامین بنگالی فن اور فنکار سے متعلق ہیں۔ ان کے تخلیقی اور تنقیدی مقالات جو برصغیر کے مختلف جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کا مجموعہ "سرزمین آب و خواب" کے نام سے زیر ترتیب ہے جس میں بنگالی شاعری، ادب اور ثقافت پر مضامین اور بنگالی کہانیوں کے تراجم ہیں۔ افسر کو بنگلا شعر و ادب سے بڑی دلچسپی رہی۔ جیسا کہ وہ خود اپنے بارے میں "نگارِ ماہ" میں تفصیلی بیان دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

" الغرض راقم نے اپنی بساط بھر اردو شعر و ادب کے فروغ، اردو، بنگلہ شعر و ادب کو ایک دوسرے سے متعارف و مربوط کرنے اور باہمی اخلاق و رواداری کی وسعت میں سارے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کیا۔[1]" (بھوپیا، مشرقی پاکستان کا لوک گیت)

نذر الاسلام کی افسانہ نگاری وغیرہ ان کے تحقیقی مضامین ہیں۔ ان کا اسلوب بیان صاف ستھرا اور رواں ہے۔ مترجم کی حیثیت سے افسر ماہ پوری معتبر کہے جا سکتے ہیں۔ "جامِ کوثر" ان کی تراجم نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ قاضی نذر الاسلام کی نظموں کا منظوم ترجمہ ہے۔ افسر نے تراجم میں اصل کی شان کو بحال رکھنے کی ایک حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے تراجم اور مفید مقالے سے بنگلہ ادب کے جواہر اردو قارئین کے سامنے عیاں ہوئے۔

شعر و شاعری کے علاوہ مختصر افسانہ نگاری میں بھی افسر نے طبع آزمائی کی اور معیاری افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "سوکھی پتیاں" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ افسر ایک باشعور افسانہ نگار تھے۔ ان کا قوتِ مشاہدہ اور نفسیاتی شعور اچھا ہے۔ وہ اپنے دلی جذبات و تاثر کو فطری صلاحیت سے افسانہ اور شاعری کے سانچے میں

---

[1] افسر ماہ پوری۔ "نگارِ ماہ" ص ۳۱

Dhaka University Institutional Repository

پیش کرتے رہے۔ افسر کے افسانے آپ بیتی اور جگ بیتی کی ترجمان ہیں۔ ان کی کہانیوں میں تکنیک کی کچھ خامیاں رہ جانے کے باوجود افسانوی ادب میں قابل قبول ہیں۔ "پُل" "سلاپ" "عبدل" "بلیک آؤٹ" ان کی اچھی کہانیاں ہیں ۔ "پُل" کا پلاٹ سابق مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیٰحدگی کے نتائج ہیں۔ "عبدل" میں ایک ایماندار گھریلو ملازم کی کہانی ہے۔ جو شریف ہونے کے ساتھ ایماندار بھی ہے۔ اس کہانی کا مقصد یہ ہے کہ شرافت اور ایمانداری پر انسانی عظمت کا دارومدار ہے۔

نمونۂ نثر: ..... جب میں پُل پر پہنچا تو ہوا زوروں سے چلنے لگی۔ اور دل و دماغ میں ایک ملکوتی راحت و فرحت سی لہرانے لگی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نیچے کی طرف دیکھا۔ دریا نہایت جوش و خروش سے بہہ رہا تھا۔ رہ رہ کر ہولناک بھنور بنتے اور رفتہ رفتہ پانی میں تحلیل ہو جاتے میرے لئے یہ نظارہ دلچسپ بھی تھا اور ہیبتناک بھی۔ پھر میں دریا کے دونوں کناروں کا جائزہ لینے لگا۔ مشرقی ساحل پر بے شمار کشتیاں جمع تھیں اور ان کے بادبان ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ ملاح کشتیوں میں پٹ کی گانٹھیں نہایت چستی اور سرعت سے لاد رہے تھے۔ پٹ سن کے ریشے چاندی کے تاروں کی طرح دھوپ میں چمک رہے تھے"[1]

---

[1] افسر ماہ پوری "پُل" (افسانہ)

Dhaka University Institutional Repository

مولانا عبدالرحمٰن بیخود

(۱۹۰۸ء - ۱۹۹۵ء)

نام عبدالرحمٰن بہ معروف بیخود بنگالی۔ تخلص بیخود۔ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء ضلع اعظم گڈھ کے قصبہ مبارک پور میں پیدا ہوئے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے اور دیوبند سے فارسی و عربی میں اعلیٰ قابلیت حاصل کی۔ اردو فارسی و عربی کے علاوہ بنگلہ زبان میں غیر معمولی صلاحیت حاصل تھی۔ وہ اپنے احباب میں بیخود بنگالی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

بیخود ۱۹۲۸ء میں ملازمت کے سلسلے میں کلکتہ آئے۔ ۱۹۴۷ء میں نامساعد حالات سے مجبور ہو کر ڈھاکا آئے اور مستقل طور پر بود و باش اختیار کی۔ یہاں ان کا تقرر نیو گورنمنٹ (بوائز) ہائی اسکول میں اردو فارسی کے معلم کی حیثیت سے ہوا۔ غالباً ۱۹۷۵ء کے قریب اسی اسکول سے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی اور کراچی ہجرت کر گئے ان کا انتقال کراچی میں ۱۹۷۵ء میں ہوا اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔

بیخود کا تعارف شاعر، مضمون نگار اور مترجم کی حیثیت سے ہے۔ لیکن ان کی شہرت کا باعث وہ تراجم ہیں جو انہوں نے بنگلا زبان سے اردو میں کئے۔ بیخود پوربی میں پیدا ہوئے لیکن بنگال کی آب و ہوا میں انہیں پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ وہ دونوں زبان کی مزاج سے اچھی طرح واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ترجمہ شدہ افسانوں میں اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ نثر میں بیخود کی زبان صاف ستھری اور سلیس ہے۔ نظم میں فارسی الفاظ کا استعمال مناسب جگہ پر کیا ہے۔ ان کی شاعری میں روایت اور جدیدیت کا امتزاج ہے۔ بیخود کی تصنیفات و تالیفات کی فہرست یہ ہے۔

(۱) بنگلا ادب کی تاریخ (ڈاکٹر شہید اللہ کی کتاب "بنگلا شاہتیر ایتی ہاش" کا اردو ترجمہ۔)

(۲) معلم الانشاء۔ (نصابی کتاب)

(۳) باقیات الصالحات۔

لہ مشرقی بنگال میں اردو ص ۳۸۱

Dhaka University Institutional Repository

(۴) اردو بنگلا لغت ۔ بنگلا اکاڈمی، (سابق مشرقی پاکستان) ڈھاکا [1]

(۵) مشرقی افسانے (۱۵ بنگلا افسانوں کے تراجم کا مجموعہ) " " "

اس کے علاوہ انہوں نے کچھ درسی کتابیں بھی لکھیں ۔ ان کی نظمیں، مضامین اور افسانوں کے ترجمے ۔ ماہنامہ "خاور" اور "دلربا" ئیں ڈھاکا سے شائع ہوتے رہے ۔ بیخود سابق مشرقی پاکستان ریڈیو کے تعلیمی نشریات سے بھی منسلک تھے ۔

نمونۂ نثر :

" ندی کے کنارے پرانے درخت کے نیچے شام کو گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی مجلس منعقد ہوا کرتی ہے ۔ ان لوگوں کی جو موت کے محل کی طرف قدم بڑھا چکے ہیں مسافروں کے آخری قافلے اسی طرح کی محفلیں جمایا کرتے ہیں ۔ " [2]

نمونۂ نظم :

ذروں میں بھی ہے مہر مگر مشاقِ جمالِ یار تو ہو
ہر دیدۂ گل ہے پیمانہ گلشن میں کوئی میخوار تو ہو

ہے جوشِ جنونِ قیس وہی لیلائے حقیقت عنقا ہے
منصور جہاں میں لاکھوں ہیں اے عشق صلائے دار تو ہو

---

[1] محی الدین مولانا، یوریو پاکستانے اردو۔ ڈھاکا ۱۹۶۹ء ص ۸۴

[2] بیخود۔ مشرقی افسانے ۔ بنگلا اکاڈمی ڈھاکا ص ۱۱۴

Dhaka University Institutional Repository

اختر لکھنوی

(۱۹۳۵ء - ۱۹۹۵ء)

نام محمود الحسن۔ اختر تخلص تھا۔ اختر کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ والد کا نام محمد حسین تھا۔[1] ادبی دنیا میں اختر لکھنوی کی پہچان ایک صحافی، شاعر اور مضمون نگار کی حیثیت سے ہے۔ اختر تقسیم ہندوستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں لکھنؤ سے ہجرت کر کے ڈھاکا آئے۔ اور مستقل سکونت اختیار کی۔ ان کی شاعری سابق مشرقی پاکستان میں پروان چڑھی۔ انہوں نے سابق مشرقی پاکستان کے سماجی و قومی مسائل، ہجرت کا کرب، مہاجرین کی نو آبادی کا پُرغور مطالعہ کیا اور ان تاثرات کو شعری جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ ان کی شاعری میں دو ہجرتوں کے کرب نمایاں ہیں۔ پہلی ہجرت تقسیم ہندوستان (۱۹۴۷ء) کے نتیجے پر دوسری قیام بنگلا دیش کے بعد۔[2]

اختر لکھنوی جب تک ڈھاکے میں رہے وہ یہاں کے اردو ادبی سرگرمیوں سے منسلک رہے۔ اختر ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۹ء تک انجمن ترقی اردو پاکستان کے آفس سکریٹری کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۵۶ء سے انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ پہلے روزنامہ "انقلاب" ڈھاکا کے سب ایڈیٹر ہوئے۔ بعد ازاں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۵۸ء میں روزنامہ "انقلاب" کے بند ہو جانے کے بعد حسب ذیل روزناموں اور جریدوں سے وابستہ ہوئے

(۱)	روزنامہ "ہنگامہ" ڈھاکا	ایڈیٹر
	روزنامہ "انگارہ" ڈھاکا	//
	ہفت روزہ "رنگ" ڈھاکا	جز وقتی صحافی
	ہفت روزہ "چترالی" ڈھاکا	// //
	ہفت روزہ "میزان" ڈھاکا	// //
	ہفت روزہ "سیارہ" ڈھاکا	// //
	روزنامہ "پاسبان" ڈھاکا	// //

---

[1] اختر لکھنوی "دیدۂ تر" (شعری مجموعہ) "کچھ اپنے بارے میں" بزم ارباب سخن پاکستان۔ اورنگی ٹاؤن کراچی ۱۹۸۶ء

[2] "دیدۂ تر" (دیباچہ)

Dhaka University Institutional Repository

"دیدۂ تر" سے بطور مثال چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

اس وقت کا بیان ہے باہر بیان سے
جب بات کر رہا تھا دھواں آسمان سے

ہم خانہ بدوشوں سے پوچھے نہ پتہ کوئی
اک شہر میں دن گزرا، اک شہر میں رات آئی

یہ معجزہ نہیں ہے تو کیا اس کا نام ہے
دو ہجرتوں کے بعد بھی تابِ کلام ہے

اختر نے غزل کی روایت کو بھی برقرار رکھا اور اردو شاعری کے جدید رجحانات کو بھی اپنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے زبان و بیان کو خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ ان کی زبان میں لطافت بھی ہے اور دلکشی بھی۔

مثال ملاحظہ ہو :

کسی کی آنکھ میں جلتا ہوا دیا نہ ملا
تمہارے شہر میں کوئی بھی بے خطا نہ ملا

کھاتے تھے قسم جن کے کردار و عمل کے ہم
شامل صفِ اعدا میں وہ ہم نفساں بھی ہیں

اختر لکھنوی کی شعری و نثری تخلیقات بنگلا پاک و ہند کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہے جن میں "دلربا" (ڈھاکا) فنون (لاہور) آجکل، شمع، بیسویں صدی (دہلی) سب رس، صبا (حیدر آباد دکن) ساقی، سیپ، جامِ نو، افکار (کراچی) حریم، نیا دور، بادبان (ڈھاکا) وغیرہ کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں ان کی پہلی شعری تخلیق ۱۹۴۸ء میں آستانہ دہلی میں شائع ہوئی جو ایک نعت تھی۔

Dhaka University Institutional Repository

انہوں نے ذاتی طور پر روزنامہ "امن" نکالا تھا۔ جو پریس والوں کی غفلتوں کے سبب چند دنوں میں بند ہو گیا پھر ادبی ماہنامہ "فنکار" جاری کیا جو ایک سال تک شائع ہوتا رہا۔

اختر نے سنہ ۱۹۶۲ء میں ریڈیو مشرقی پاکستان ڈھاکا میں ملازمت اختیار کی۔ ٹیلویژن سے خبریں پڑھیں اردو فلموں کے لئے کہانیاں، مکالمے اور گیت لکھے۔ ریڈیو کے لئے روزانہ اردو نشریات کے ساتھ تقریباً دو سو ڈرامے، فیچر اور دوسرے پروگرام لکھے۔ ۱۶ر دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء تک وہ ریڈیو مشرقی پاکستان ڈھاکا سے وابستہ رہے۔ یہاں ان کا قیام ۲۱ سال تک رہا۔ قیام بنگلادیش کے بعد ۶ر مارچ ۱۹۷۲ء کو کراچی ہجرت کر گئے۔ تین ماہ بعد ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں ملازمت مل گئی۔

اختر لکھنوی کا اصل میدان شاعری ہے۔ جو ان کے ذہنی رجحان اور دلی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ انکی شاعری یہاں کی سیاسی و قومی مسائل کی عکاس ہے۔ انہوں نے یہاں (بنگلادیش) کی سماجی و سیاسی و قومی مسائل کا غائر مطالعہ کیا اور اسے شعری پیمانے میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ افسر ماہ پوری ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اختر لکھنوی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی ان کے افکار و جذبات کا واحد وسیلہ ہے۔ مگر غزل کے پیرائے میں انہوں نے جس رنگ و آہنگ سے المیہ مشرقی پاکستان کی نوحہ خوانی کی ہے اس کو سامنے رکھ کر اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے غزل میں اس المیے کا مرثیہ لکھا ہے تو اس دعوے کو غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔"[1]

اختر لکھنوی کا مجموعہ کلام "دیدۂ تر"، سنہ ۱۹۸۴ء میں بزم ارباب سخن کراچی (پاکستان) سے شائع ہوا۔ "دیدۂ تر" کے اشعار میں دہشت، موت، بے بسی۔ المیہ، دوسری ہجرت (۱۹۷۱ء کے بعد) غربت اور غیریت کے حقیقی شاعرانہ نقوش پیش کیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ میر تقی میر (۱۷۲۴ء - ۱۸۱۰ء) نے دلی اور دل کا مرثیہ لکھا ہے۔ میرا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اختر لکھنوی نے غزل نہیں کہی بلکہ سابق مشرقی پاکستان کا مرثیہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق "دیدۂ تر" پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> "موت، دیدۂ تر" کے اشعار میں مابعد الطبیعات مجاز طبعی انجام اور خواہش مرگ کی صورتوں میں نہیں بلکہ بے رحمانہ حالات کی پیدا کردہ وسیع، سفاک اور سرد حقیقت بن کر سامنے آتی ہے"

---

[1] افسر ماہ پوری۔ "اختر لکھنوی۔ دیدہ شنیدہ" "دیدۂ تر" ص ۱۸

Dhaka University Institutional Repository

شہزاد منظر

(۱۹۳۳ء-۱۹۹۷)

اصل نام ابراہیم عبدالرحمٰن عارف۔ قلمی نام شہزاد منظر (تبسم عارف۔ عمر خیام) امرتلہ لین، کلکتہ میں یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۴ء-۱۹۹۵ء میں واقع ہونیوالے ہندو مسلم فسادات سے متاثر ہوکر ڈھاکا آئے۔ اور مستقل سکونت اختیار کی۔ سنہ ۱۹۷۱ء تک ان کا ڈھاکے ہی میں قیام رہا۔ بعد ازاں کراچی ہجرت کر گئے۔ ۱۹ر دسمبر سنہ ۱۹۹۷ء کو ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔ موصوف اپنے آخری ایام تک اردو ادبی سرگرمیوں سے منسلک رہے

اردو دبستان ادب میں شہزاد منظر کا تعارف ایک معتبر صحافی، مقبول افسانہ نگار اور باشعور ناقد کی حیثیت سے ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ صحافت شہزاد کا پسندیدہ پیشہ تھا۔ افسانہ اور تنقید سے متعلق شہزاد کا مطالعہ وسیع تھا۔ افسانہ ان کا مخصوص موضوع تھا جس میں انہوں نے بھرپور اور مفید کام کئے۔ انہوں نے کبھی اپنے نام و نمود کی پروا نہیں کی۔ وہ ادب کے عاشق اور قلم کے دھنی تھے۔ اسی لگن نے انہیں کثیر التصانیف بنا دیا۔ ان کی صحافت نگاری اور تصنیفات کی فہرست مندرجہ ذیل ہیں:

صحافت:

روزنامہ "عصر جدید" کلکتہ	(رپورٹر)	۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۰ء
روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ	(〃)	۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۴ء
ہفت روزہ "آثار" کلکتہ	(معاون مدیر)	۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۳ء
روزنامہ "پاسبان" ڈھاکا	(سب ایڈیٹر)	۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۵ء
روزنامہ "وطن" ڈھاکا	(اسسٹنٹ ایڈیٹر)	۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۱ء
ہفت روزہ "چترالی" ڈھاکا	(اسسٹنٹ ایڈیٹر	۱۹۶۵ تا ۱۹۷۱ء

نوٹ: میرے سوالنامے کے جواب میں شہزاد منظر نے اپنی کل تصنیفات کی فہرست بہم ارسال کیں۔

Dhaka University Institutional Repository

روزنامہ "مساوات" لاہور (نمائندہ خصوصی مقیم ڈھاکا ۱۹۷۰ تا ۱۹۷۱ء

روزنامہ "جنگ" کراچی (سب ایڈیٹر) ۱۹۷۱ تا ۱۹۷۲ء

ہفت روزہ "پیمان" کراچی (مدیر معاون) ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۳ء

روزنامہ "مساوات" کراچی (اسسٹنٹ ایڈیٹر) جون ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۹ء

روزنامہ "جنگ" کراچی (ادبی کالم نگار) ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۹ء

ادارت:

ماہنامہ "ساقی" کلکتہ

ماہنامہ "ماہِ نو" کلکتہ

رکنیت:

کراچی پریس کلب

کراچی یونین جرنلسٹ

آرٹس کونسل آف پاکستان

مطبوعہ تصانیف

جدید اردو افسانہ (تنقید) مطبوعہ ۱۹۸۲ء ہندوستانی ایڈیشن ۱۹۸۸ء

اندھیری رات کا تنہا مسافر (ناول) مطبوعہ ۱۹۸۴ء گجراتی میں ترجمہ ۱۹۸۵ء

ردِعمل (تنقید) مطبوعہ ۱۹۸۶ء منظر پبلی کیشنز کراچی

ندیا کہاں ہے تیرا دیس (افسانے) مطبوعہ ۱۹۹۵ء " " "

علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ (تنقید) مطبوعہ ۱۹۹۰ء

غلام عباس ۔ ایک مطالعہ (تنقید) مطبوعہ ۱۹۹۱ء

سندھ کے نسلی مسائل (سیاسات) مطبوعہ ۱۹۹۴ء

مشرق و مغرب کے چند مشاہیر ادباء (تنقید) مطبوعہ ۱۹۹۶ء

Dhaka University Institutional Repository

پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال	مطبوعہ	۱۹۹۶ء	پاکستان اسٹڈی سنٹر
پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال	مطبوعہ	۱۹۹۷ء	〃 〃
عصمت چغتائی کے دس بہترین افسانے	مطبوعہ	۱۹۹۷ء	

بیدی کے دس بہترین افسانے

کرشن چندر کے دس بہترین افسانے

زیر طبع تصانیف۔

محمد حسن عسکری ــــ ایک مطالعہ (تنقید)

جدید اردو ناول

تین شہروں کی کہانی (سفرنامہ)

راجندر سنگھ بیدی

ترقی پسند ادب کا مستقبل (تنقید)

فحش ادب کیا ہے؟ (تنقید)

ہمارا تنقیدی ورثہ (تنقید)

اردو کے بڑے افسانہ نگار

منٹو کے دس بڑے افسانے (انتخاب و مقدمہ)

قرۃ العین حیدر کے دس بہترین افسانے (انتخاب و مقدمہ)

تندیا کہاں ہے تیرا دیس (منظر پبلی کیشنز کراچی ۱۹۹۰ء) شہزاد منظر کے ایک ناولٹ اور تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے قیام پاکستان سے انقلاب بنگلا دیش کے عرصے پر محیط ہے۔ شہزاد نے اپنے دیباچہ "کچھ اس کتاب کے بارے میں" کے بیس منظر کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

" میری زندگی کا بڑا حصہ بنگال (مشرقی اور مغربی بنگال) گزرا ہے۔ میں رہنے والا تو عظیم شہر کلکتے کا ہوں۔ لیکن زندگی کا طویل عرصہ مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ اور مشرقی بنگال کے مختلف ضلعی شہروں اور دیہاتوں میں گزرا ہے۔ میں نے وہاں کے عوام، انکی

Dhaka University Institutional Repository

روزمرہ زندگی اور ان کے معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس لئے میں نے ان کی زندگی سے متاثر ہو کر جو افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً "ندیا کہاں ہے تیرا دیس"، "سراب" اور "سزا" وہ اردو میں قطعی مختلف طرز کے افسانے ہیں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں نے مشرقی پاکستان دیہی زندگی کے بارے میں اردو میں پہلی بار افسانہ لکھا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں نے مشرقی پاکستان کی دیہی زندگی کو اس کی تمام تر اصلیت کے ساتھ منعکس کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام فطرت (سیلاب، طوفان اور دریاؤں کے کٹاؤ) کے خلاف جس بے جگری سے نبرد آزما رہتے ہیں اس کی بہت کم مثال ملتی ہے۔ میں نے اپنا پہلا افسانہ "ندیا کہاں ہے تیرا دیس" میں اسے ہی موضوع بنایا ہے۔[1]

مشرقی بنگال کی دیہی پس منظر میں لکھے ہوئے ان کے افسانوں کو اگر بنگلا زبان میں منتقل کیا جائے تو بے تامل قاری کو گمان ہوگا کہ اس کا مصنف کوئی بنگالی نژاد ہے۔ انہوں نے "ندیا کہاں ہے تیرا دیس" افسانے کا آغاز کوی جسیم الدین کے ایک مشہور بھاٹیالی گانے کے چند مصرعوں سے نہایت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ کہانی کی سرخی اور آغاز پہلی نظر میں قاری کو اپنی طرف مائل کرتی ہے ان کے افسانوں میں تاثر کا ارتکاز بدرجہ اتم ہے۔ بنگال کے دیہی ماحول کی مناسبت سے گاہے بگاہے بنگلا محاوروں کے استعمال نے کہانی کی روح کو تازگی بخشی ہے۔ مثلاً "ہاٹ"[2]، "پانتھا بھات"[3]، "رادھا گھر" وغیرہ بنگلا زبان کے مخصوص الفاظ ہیں۔ جو شہزاد منظر نے اپنے افسانوں میں استعمال کئے ہیں۔ شہزاد منظر کے افسانے ان کے تجربات اور مشاہدات کے حقیقی عکاس ہیں۔ نوعیت کے لحاظ سے وہ افسانہ نگاری میں منشی پریم چند سے مماثلت رکھتے ہیں۔ شہزاد نے صرف افسانہ نویسی ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ناول نویسی کی بھی سعی کی۔ اس سلسلے میں ان کا مفید کارنامہ "اندھیری رات کا تنہا مسافر" کے عنوان سے ایک کرداری ناول ہے۔ جس کی بنیاد انسانی المیے پر رکھی گئی ہے۔ یہ ناول اسپینی شاعر گیبریلا مسترل کی زندگی سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ اس ناول کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۲ء میں پہلی بار ماہنامہ نگارش کراچی (مدیر ناصر محمود) کے سالنامہ میں "زندگی ایک نغمہ" کے شائع ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں ہفتہ وار جبرائیل ڈھاکا میں قسط وار شائع ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں تیسری بار آہنگ کراچی میں شائع ہوا۔ اس ناول کا پس منظر بنگال ہے۔ اور سارے واقعات کلکتہ اور لندن کے گرد گھومتے ہیں۔ ناول کا زمانہ

---

[1] ندیا کہاں ہے تیرا دیس، دیباچہ

[2] سہ روزی بازار۔ [3] بنگال میں رات کو پکے ہوئے باسی چاول میں پانی ڈال کر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ ناشتے میں کھایا جائے، اسے پانتھا بھات کہا جاتا ہے۔

[4] بادر چی خانہ۔ [5] بنگلا زبان کے مشہور دیہی شاعر

Dhaka University Institutional Repository

دوسری جنگ عظیم سے قیام پاکستان تک کا ہے۔ تخیل اور حقیقت کا امتزاج ہے کہ قاری کو کہانی پر تاریخ کا دھوکہ ہوتا ہے۔" اندھیری رات کا تنہا مسافر" کے بارے میں محمد خالد اختر رقمطراز ہیں:

" یہ ناول قاری کو جبراً پڑھواتا ہے۔ مصنف نے کہیں بھی اس کی بہت میں جھوٹ موٹ کی صناعی اور رنگ آمیزی سے کام نہیں لیا۔ کہانی نہایت سادگی، خوبصورتی اور مہارت سے جوڑی گئی ہے۔"[1]

افسانہ اور ناول کے علاوہ اردو تنقید نگاری میں بھی شہزاد منظر کا نام نمایاں ہے وہ اپنی تنقید نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

" میں نے افسانے کی بہ نسبت تنقید اتنی زیادہ لکھی ہے کہ لوگ اب مجھے تنقید نگار سمجھتے ہیں۔"[2]

صبا اکرام، شہزاد منظر کا تنقیدی نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" شہزاد منظر کا ادب کے ایک پارکھ کی حیثیت سے یہ عقیدہ تھا کہ نقاد کا علمی اور دانشورانہ طور پر اس قابل ہونا کافی نہیں کہ وہ کسی فن پارے کو صحیح طور پر پرکھ سکے اور اس کی خوبیوں اور نقائص کو اپنی تحریر میں پیش کرے۔ بلکہ اس پر زیادہ زور دیتے تھے کہ ایسا کرتے ہوئے دیانتداری کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھے اور کسی تعصب کا شکار نہ ہو۔"[3]

تنقید کرتے ہوئے شہزاد نے اپنے زمانے کے اہم ترین موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ناقدانہ رائے پیش کرتے ہوئے غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی۔ ان کی تنقیدی مضامین کا مجموعہ " ردِ عمل" (منظر پبلی کیشنز کراچی سنہ ۱۹۸۵ء) انیس ۱۹ مضامین پر مشتمل ہے۔ بیشتر مضامین نظری اور نظریاتی حوالے سے لکھے گئے ہیں چند مضامین عملی تنقید کے زمرے میں ہیں۔

" پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال" (پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی سنہ ۱۹۹۷ء) مصنف کا دوسرا مفید تنقد کتاب ہے۔ یہ دراصل اردو افسانے کے تنقیدی تاریخ ہے۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے اس کتاب کے بارے میں سید حسین محمود جعفری (ڈائرکٹر پاکستان اسٹڈی سنٹر) لکھتے ہیں:

---

[1] محمد خالد اختر۔ "اندھیری رات کا تنہا مسافر"، سرورق۔

[2] سہ ماہی روشنائی۔ (ادبی رسالہ) کراچی۔ اپریل تا جون سنہ ۲۰۰۰ء "شہزاد منظر کا انداز نظر۔ ص ۱۸۹

[3] سہ ماہی روشنائی " " " " ص ۲۱۱

Dhaka University Institutional Repository

"شہزاد منظر نے تقسیم ہند سے قبل اردو افسانے کی نصف صدی کی تاریخ و ارتقا کا تعارف کرانے کے بعد پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس کا ایک انتہائی تحقیقی و تنقیدی جائزہ لے کر نہ صرف ہمارے تنقیدی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے بلکہ افسانے کے موضوعات اور افسانہ نگاروں کے تاثرات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لے کر پاکستانی معاشرہ و سماج کو سمجھنے میں ہماری مدد کی ہے۔"[1]

"پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال" (منظر پبلی کیشنز کراچی ۱۹۹۶ء) بھی شہزاد کے تنقیدی تخلیقات میں شامل ہے اس کتاب میں پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سالہ جائزے کے بعد سات نقادوں کے تفصیلی مطالعے پیش کئے گئے ہیں۔

"علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ" (منظر پبلی کیشنز کراچی ۱۹۹۰ء) شہزاد منظر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں افسانے کے حوالے سے بارہ افسانہ نگاروں کے بارے نو اور ناولوں کے تعلق سے دو۔ یعنی کل تیئس ۲۳ مضامین شامل ہیں۔

تنقیدی نثر کا نمونہ: ..... جہاں تک تنقید کی تخلیق کا درجہ حاصل کرنے کا سوال ہے۔ یہ مطالبہ کرنے سے قبل ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ تنقید قطعی عملی معاملہ ہے جبکہ تخلیق جذباتی اور حسیاتی۔ تنقید سائنس ہے جبکہ تخلیق آرٹس۔ تنقید کی سرحدیں تمام مروجہ علوم و فنون کی سرحدوں سے ملتی ہیں۔ جبکہ تخلیق کا تمام تر تعلق انسان کے جذبات و احساسات سے ہے[2]۔

نمونہ افسانوی نثر ..... "اس کی تیز آواز ندی کے خاموش سینے کو چیرتی ہوئی فضا میں گونج رہی تھی اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر، بھاٹیالی گانے میں کھویا ہوا تھا۔ سورج دن بھر کے سفر سے تھک کر تیزی سے اپنی کٹیا کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کے چہرے کی تازگی اور رنگ و روغن ماند پڑ چکا تھا جس کی وجہ سے اس کی تمازت کم ہو چکی تھی۔ ندی گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی[3]"

---

[1] پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال، شہزاد منظر۔ مطبوعہ پاکستان اسٹڈی سنٹر۔ جامعہ کراچی ۱۹۹۱ء ص ۹

[2] "ردعمل" شہزاد منظر۔ (منظر پبلی کیشنز کراچی ۱۹۸۵ء ص ۱۹۲

[3] ندیا کہاں سے تیرا دیں، شہزاد منظر (منظر پبلی کیشنز کراچی ۱۹۹۰ء ص

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی
(۱۹۱۵ - ۱۹۹۸ء)

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ۱۹۱۵ء میں بہ مقام رودلی شریف ضلع بارہ بنکی (یو پی) کے ایک معزز اور رئیس گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام چودھری سرفراز احمد تھا۔ اس زمانے کے عام دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی انہوں نے ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز (اردو) اور ۱۹۴۰ء میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اور "شبلی ایک دبستان" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر علی گڑھ مسلم یونیورسی سے ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ڈھاکا آئے اور مستقل بود و باش اختیار کی۔[1] ۱۹۵۹ء میں شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرران کا تقرر ہوا۔[2] ۱۹۶۹ء میں اسی شعبے کے صدر بنے اور جون ۱۹۷۱ء تک اسی عہدے پر قرار رہے۔[3] ۱۹۷۵ء میں انہیں ملازمت سے سبکدوشی ملی اور وہ کراچی ہجرت کر گئے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۹۸ء کو کراچی میں انہوں نے اس دار فانی سے رحلت کی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کی افتاد طبع مضمون نویسی کی طرف مائل تھی۔ وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں طالب علمی دوران ان کا ایک مقالہ (۱۹۳۶ء) بعنوان "اردو نثر کی ابتدا اور ارتقاء" علی گڑھ میگزین میں سال کے بہترین مقالوں میں شمار کیا گیا اور انعام کا مستحق ٹھہرا۔ اسی مقالے کی بدولت وہ علی گڑھ میگزین کے مدیر معاون (۱۹۳۷ء - ۱۹۳۸ء) اور ۱۹۳۹ء میں مدیر اعلیٰ بنا دیئے گئے۔ ان کے زمانۂ ادارت میں علی گڑھ میگزین کا علی گڑھ نمبر شائع ہوا۔ جو علی گڑھ میگزین کی تاریخ میں بہ قول اقبال عظیم "سنگ میل" کی حیثیت رکھتا ہے۔[4]

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء آفتاب احمد صدیقی کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ ۱۹۴۰ء کے بعد وہ ادبی میدان میں خاموش نظر آتے ہیں۔ ماہنامہ دلربا (ڈھاکا) (جنوری فروری ۱۹۵۲ء) میں ان کی ایک نظم "آمد شباب" شائع ہوئی جو علی گڑھ میگزین میں شائع شدہ نظم تھی۔

---

[1] مشرقی بنگال میں اردو ص ۳۱۰

[2] [3] ذاتی فائل ڈھاکا یونیورسٹی کے رجسٹرار آفس میں محفوظ ہے ص ۵

[4] مشرقی بنگال میں اردو ص ۳۱۳

Dhaka University Institutional Repository

نظم کا نمونہ یہ ہے:

فلک کا نیتا ہے، زمیں ہل رہی ہے
جوانی سے طفلی گلے مل رہی ہے
اسے اپنے ہی سے حجاب آ رہا ہے
خراماں خراماں شباب آ رہا ہے
کوئی اس سے پوچھے کہ کیا چاہتی ہے
مجسّم گلستاں بنا چاہتی ہے

آفتاب احمد صدیقی نے شوقیہ شاعری کی۔ ان کا اصل میدان تحقیق تنقید ہے۔ اس سلسلے میں ان کی طرز تحریر کو تدریسی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے مضامین میں عبارت آرائی ہے۔ اظہارِ بیان سنجیدہ اور جامع ہے۔ تنقید کی بہ نسبت ان کے یہاں تحقیقی رجحان زیادہ تھا۔ شعر و ادب کے میدان میں وہ قدماء کو بھول جانے کے قائل نہیں۔ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے رجحانات کے پیشِ نظر قدیم و جدید مفکرین ادب میں توازن برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

گلہائے داغ: مطبوعہ مکتبہ عارفین، ڈھاکہ ۱۹۵۷ء

اس کتاب میں مصنف نے پہلے داغ کی شاعری پر روشنی ڈالی اور اس کے بعد کلام کا انتخاب پیش کیا۔ ان کی اس تصنیف کے سلسلے میں ڈاکٹر شادانی اور ڈاکٹر حنیف فوق نے اپنے اپنے خیالات پیش لفظ کے طور پر پیش کئے۔ اور ان کی ناقدانہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ داغ کا کلام صرف عیاشانہ کلام پر مشتمل نہیں بلکہ اس میں قابل قدر سنجیدہ اشعار بھی ہیں۔

صہبائے مینائی: مطبوعہ ڈھاکا ۱۹۵۸ء

اس کتاب میں آفتاب احمد صدیقی نے امیر مینائی کا کلام، ان کی شخصیت اور ان کی غزلگوئی پر تبصرہ کیا ہے کتاب کے دیباچے میں منذر لیب شادانی نے مصنف کے ناقدانہ خیالات کا اعتراف

Dhaka University Institutional Repository

اور ان اور ان کی کاوشوں کی داد دی ہے۔

شبلی ایک دبستان مطبوعہ مکتبہ عارفین پریس، ڈھاکہ

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جسے لکھ کر انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ۲۶۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ایک مفید ادبی کارنامہ ہے، جس میں شبلی اور انکے نوائے وقت کی بھرپور آئینہ داری ہے۔

اس کے علاوہ اردو نثر کی ابتدا و ارتقا (کتابچہ) "قرآن السعیدین" اور "اقبال کا انسان کامل" وغیرہ بھی ان کی مفید تصنیفات ہیں۔

نمونہ نثر یہ ہے۔

"..... انیسوی اور بیسویں صدی کا دور عبوری ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہے گا، اس زمانے میں مفکرین، مجاہدین اور معلمین کی ایک پوری جماعت ملک و ملت کی فلاح و بہبود میں کوشاں نظر آتی ہے۔ صرف مسلمانوں میں سرسید، حالی، شبلی، نظیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، سمیع اللہ خان چراغ علی ایک طرف اور مولانا سید احمد بریلوی، مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کے رفقاء دوسری طرف اپنے کارناموں کی بدولت حیات ابدی پا چکے ہیں۔ سرسید احمد کو اس دور کا مصلح اعظم کہا جاتا ہے۔"

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر سید اقبال عظیم

(۱۹۱۳ء - ۲۲ ستمبر ۲۰۰۲ء)

اصل نام سید اقبال عظیم۔ تخلص اقبالؔ۔ والد سید مقبول عظیم عدیمؔ اردو کے غزل گو شاعر تھے۔ آبائی وطن قصبہ انبہٹہ ضلع سہارن پور تھا۔ بڑے بھائی سید وقار عظیم برصغیر کے نامور تنقید نگار گزرے۔ ۸ جولائی ۱۹۱۳ء کو اقبال عظیم کی پیدائش ضلع میرٹھ (یوپی) میں ہوئی۔ کئی پشتوں سے ان کے خاندان میں شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اقبال عظیم اس شعری و ادبی ماحول میں پروان چڑھے۔ انہوں نے لکھنو یونیورسٹی سے ۱۹۳۴ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے آگرہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کا امتحان دیا۔ اور فرسٹ کلاس فرسٹ آئے۔ ۱۹۳۵ء میں ٹیچرس ٹریننگ کالج لکھنو سے سند معلمی لینے کے علاوہ ہندی (۱۹۴۱ء لکھنؤ) اور بنگلا (۱۹۶۵ء ڈھاکا) کے خصوصی امتحانات پاس کئے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے تحت ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے "مغربی بنگال میں اردو" کے عنوان پر تحقیقی مقالہ (۵۲-۱۹۵۱ء) لکھا جسے ان کے رہنما (عندلیب شادانی) نے چند خامیوں کی وجہ سے نامکمل قرار دیا۔ اور وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے میں ناکام رہے۔ ۹ جولائی ۱۹۵۰ء تک گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنو اور دیگر گورنمنٹ کالجوں (یوپی ہندوستان) میں معلم انگریزی اور اردو کی حیثیت سے ملازمت کی۔ ۱۰ جولائی ۱۹۵۰ء کو سابق مشرقی پاکستان آئے۔ یہاں ڈھاکہ ڈگری کالج اور سرکاری کالج چاٹگام میں اردو لکچرر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے پروفیسر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۱ء تک پروفیسر اور صدر شعبہ اردو رہنے کے علاوہ سنیر ایجوکیشن سروس" سابق مشرقی پاکستان کے تحت تعلیمی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔

اقبال عظیم اپنا شعری مجموعہ "ماحصل" کے دیباچے میں سابق مشرقی پاکستان میں ان کی اردو ادبی خدمات کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں نے مشرقی پاکستان میں اپنی زندگی کے بیس سال اردو زبان کے رضا کار کی حیثیت سے گزارے اور میری تمام علمی و ادبی صلاحیتیں اس صوبے میں صرف اردو زبان کے استحکام اور تبلیغ و اشاعت کی کوششوں میں صرف ہوئیں۔ چنانچہ وہاں بیٹھ کر میں نے لکھنے پڑھنے کا جو کچھ کام کیا سب کا سب اسی مقصد کے تحت کیا!"[1]

---

[1] اقبال عظیم "ماحصل (کلیات)" ۱۹۸۷ء دہلی۔ ص ۱۹

نوٹ: میرے سوالنامے کے جواب میں اقبال عظیم نے اپنے بارے میں کل معلومات بہم ارسال کیں۔ ۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء

Dhaka University Institutional Repository

سابق مشرقی پاکستان میں اردو کی تعلیمی و ادبی خدمات کے بارے میں موصوف کا مذکورہ بیان معتبر ہے۔
برصغیر کے اردو ارباب قلم میں اقبال عظیم کا تعارف کامیاب معلم، معیاری شاعر، نامور محقق و ناقد کی حیثیت سے ہے۔
اقبال عظیم کی تصنیفات کے عنوانات ان کی علمی ذکاوت، نصب العین اور کتابوں کی نوعیت کی ترجمان ہیں۔
ان کی تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔

مشرقی بنگال میں اردو: مشرق کوآپریٹو پبلی کیشنز ڈھاکا۔ اگست ۱۹۵۴ء۔
سابق مشرقی پاکستان (بنگلادیش) کی دو سو سالہ لسانی و ادبی تذکرہ اور لسانی مسائل کے سیر حاصل تفصیلی جائزے پر مشتمل ہے۔ اس میں اقبال عظیم نے حکیم حبیب الرحمٰن کے مسودات سے فائدہ اٹھایا تاہم ان کی تحقیق و تفتیش قابلِ داد ہے مصنف نے دیگر ناقدین کے اقوال پر زیادہ اکتفا کیا۔ اپنی رائے زنی بہت کم کی ہے دبستان اردو میں اس ضخیم تصنیف کی سب سے بڑی وقعت یہ ہے کہ اردو محققین اور تذکرہ نگاروں کے لئے مشعل راہ ہے۔

مضراب: پہلا مجموعہ غزلیات ۱۹۷۵ء

دیوانِ ناطق: حکیم ناطق لکھنوی کے دیوان کی ترتیب و تدوین و اشاعت مع مقدمہ ۱۹۵۶ء

سات ستارے: سات معمارانِ پاکستان (سرسید احمد خان، نواب بہادر عبد الطیف، سر سلیم اللہ، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، محمد علی جناح، لیاقت علی خان۔)
نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں لکھی ہے اس کتاب کی نوعیت تاریخی اور سیاسی ہے۔ مصنف کا مقصد اسلاف کے کارناموں کو یاد دلانا ہے۔

مشرق: مشرقی پاکستان سے متعلق ادبی، لسانی، معاشرتی اور ثقافتی مضامین کا مجموعہ ہے یہ کتاب مصنف کی تحقیقی صلاحیت کا مفید نمونہ ہے۔

قاب قوسین: مجموعہ نعتیہ کلام ۱۹۷۷ء

مضراب و رباب: غزلوں کا دوسرا مجموعہ۔

Dhaka University Institutional Repository

لب کشا — نعتوں اور غزلوں کا مجموعہ

چراغِ آخر شب — غزلوں کا مجموعہ — ایجوکیشنل پریس کراچی دسمبر ۱۹۹۳ء

ماحصل : (مکمل سرمایۂ شاعری) لاہوتی فائن آرٹ پریس نئی دہلی۔

اس کتاب پر تاریخ اشاعت درج نہیں۔

ناشر: بزم خدام الادب (نئی دہلی)

کے معتمد اعزازی نے "نذر" (پیشکش)

۸ر جولائی ۱۹۸۷ء کو لکھی ہے۔

انگریزی زبان میں انیس[19] اضلاع پاکستان سے متعلق

ادبی و لسانی تحقیقی مقالات ۱۹۶۵ء - ۱۹۷۰ء

زیر ترتیب کتابیں :

(۱) آنکھوں دیکھی (شخصیات و واقعات) جنہوں نے مجھے متاثر کیا۔

(۲) روحِ سخن : جدید و قدیم شعرا کے غیر معروف اور منتخب اشعار

(۳) رہنمائے تلفظ :

شعر گوئی میں اقبال عظیم کا درجہ معیاری ہے انہوں نے حمد، نعت، غزل سب ہی اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی۔ لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ انہوں نے دورِ متقدمین سے لیکر متاخرین تک اردو شعراء کا کم و بیش اثر لیا لیکن کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ "علامہ اقبال کو تمام سخن وروں کا سرتاج مانتے تھے ــــ اقبال عظیم فطری شاعر تھے۔ ان کا قوت مشاہدہ اچھا تھا۔ ماضی اور حال پر ان کی نگاہ عائر تھی۔ اقبال عظیم کی شاعری کی مثال کہنہ صراحی نئی میں شراب سے دی جا سکتی ہے۔ انہوں نے روایتی اسلوب اپنایا مگر فنی کمالات کے ساتھ نئے جدید رجحانات کو نظر انداز نہیں کیا اس نوعیت سے ان کا رنگ انفرادی ہے۔ ایک اچھے شاعر کی طرح اقبال عظیم کا دل حساس اور نظر بیں دور بین تھیں وہ عصری

Dhaka University Institutional Repository

پیغامات سے غافل نہیں رہے۔ ان کی غزلوں میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا امتزاج ہے۔ ان کی شاعری بیکاروں کا مشغلہ نہیں۔ اس میں تفکر اور تغزل کی ہم آہنگی ہے۔ ان کا کلام پختہ، شُستہ اور بے ساختہ ہے۔ ان کی شاعری ان کے دل و دماغ کی سچائی و صفائی کی عکاسی کرتی ہے۔ اقبال عظیم کی شاعری میں جابجا مذہبیت غالب ہے لیکن مولویت نہیں۔ اقبال عظیم اسلام سے جینے کا سبق لیتے ہیں۔ ان کے یہاں قنوطیت اور رجائیت کی آمیزش ہے۔ وہ مصائب سے گھبراتے نہیں بلکہ راضی بہ رضا رہ کر پریشانیوں کا مقابلہ خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں آمد ہے آورد نہیں۔ جو کیفیت ان کے دل پر ہوئی ہے وہی زبان پر آئی ہے۔ اور شعر کا روپ دھار کر امر بن گئی ہے۔ انہیں الفاظ کے استعمال کا ملکہ حاصل تھا۔ ان کے لہجے میں اچھوتا پن اور فکر میں گہرائی ہے جیسا کہ وہ خود گویا ہیں۔

دو باتوں سے ہوتا ہے معیارِ سخن محکم
لہجے کا اچھوتا پن اور فکر کا گہرا پن

اقبال عظیم کے اشعار میں زندگی کی ترجمانی ہے۔ انہوں اسلامی اصول کے تناظر میں وقتاً فوقتاً مفید مشورے بھی دیئے۔ مثال:

ہم نے سیکھا ہے اذانِ سحری سے یہ اصول
لوگ خوابیدہ سہی، ہم کو صدا دینا ہے

جب آدمی کا طرزِ سخن معتبر نہ ہو
زیبِ سخن حوالۂ قرآن ہوا تو کیا

Dhaka University Institutional Repository

خلاف ورزیٔ احکامِ مصطفےٰ نہ کرو
خطا کرو بھی تو اتنی بڑی خطا نہ کرو

جو ہو سکے تو تقاضائے وقت پہچانو
گھروں میں بیٹھ کے اوروں پہ تبصرہ نہ کرو

اقبال عظیم کے دیگر مفید اشعار:

جب بھی اس شہر کی تاریخ لکھی جائے گی
تذکرہ ہوگا ہمارا بھی حوالوں کی طرح

آج کے بچے یہ سُن لیں کہ ہماری روداد
کل لکھی جائے گی تحقیقی مقالوں کی طرح

اک ذرا چوک نظر آپ کی اور مات ہوئی
زندگی چلتی ہے شطرنج کی چالوں کی طرح

سنا ہے میرے رقیبوں میں سخت اَن بن ہے
میرے خلاف مگر اتحاد ہے، ان میں

شاعر کے علاوہ محقق و مضمون نگار کی حیثیت سے بھی اقبال عظیم کی خدمات لائق تحسین ہے۔ پچھلے اوراق میں یہ تذکرہ ہو چکا ہے مشرقی بنگال میں اردو۔ مشرق۔ سات ستارے وغیرہ تحقیقی نوعیت سے منسلک ہیں۔ مزید برآں انہوں نے تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی سپرد قلم کئے۔ جو اس وقت کے موقر رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ اقبال عظیم کے نثری کارنامے تحقیق سے منسلک ہیں۔ وہ ادیب نہیں اچھے محقق تھے۔

Dhaka University Institutional Repository

نمونہ نثر :

" آخری تاجدار اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ کے ادبی اور دوسرے کارنامے بھی اپنے زمانے کے اثرات سے عاری نظر نہیں آتے۔ انہیں قدرت کی طرف سے طبع رسا اور زبردست فہم و ذکاوت عطا ہوئی تھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے وہ ان علوم و فنون کی بہتر سے بہتر تعلیم سے بھی بہرہ یاب ہوئے تھے۔ جو ایک تاجدار سلطنت کے لئے ضروری تھے۔ انہیں مختلف چیزوں کا شوق تھا۔ ایک طرف انہیں فن تعمیر سے دلچسپی تھی تو دوسری طرف وہ شعر و سخن کے انتہائی دلدادہ تھے۔"

(بہ حوالہ، "تاجدار اودھ کے منظوم خطوط)

اقبال عظیم نے اپنی ساری زندگی اردو علم و ادب کی خدمات میں صرف کردی۔ زندگی کے آخری ایام میں آنکھوں کی بینائی ضائع ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ان کی قوت ارادی اور ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے سیمناروں میں شرکت کیلئے بیرونی ممالک کا سفر کیا۔ ان کی آنکھیں معذور تھیں لیکن وہ معذور نہیں ہوئے۔ اس کیفیت کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں جا بجا کیا ہے۔ بطور مثال:

آنکھ معذور سہی ہم ابھی معذور نہیں
زندگی کرتے ہیں ہم آنکھ ہی والوں کی طرح

اقبال عظیم نے ۲۲ ستمبر ۱۹۷۲ء کو کراچی میں رحلت فرمائی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔

Dhaka University Institutional Repository

شائستہ اکرام اللہ

(۱۹۱۵ء - ۲۰۰۰ء)

نام شائستہ اختر۔ معروف شائستہ اکرام اللہ۔ پیدائش ۱۹۱۵ء کلکتہ میں ہوئی[1]۔ والد سر حسان سہروردی کلکتہ یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر تھے۔ دادا مولانا عبید اللہ عبیدی (۱۸۴۴ء - ۱۸۸۵ء) برصغیر کے مشہور عالم صاحب دیوان شاعر اور اسلامیہ کالج ڈھاکہ (موجودہ کوی نذرالاسلام کالج) کے بانی و پرنسپل تھے۔ والدہ شہر بانو، نواب سید محمد آزاد (اودھ پنچ اخبار کے مشہور نامہ نگار) کی بیٹی تھیں۔ اردو و فارسی کی اچھی معلومات حاصل تھی۔ شائستہ اکرام اللہ کی پیدائش ننھیال میں ہوئی! شائستہ بیگم کا تعلق بنگال میں اردو و فارسی کا ادب نواز خاندان سے تھا۔ میرا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو و فارسی زبان و ادب کے علاوہ تعلیم نسواں کی بھی علمبرداری بھی اسی خاندان کو حاصلی رہی۔ شائستہ کی پھوپھی خجستہ اختر سہروردیہ (۱۸۷۳/۷۴ء - ۱۹۱۹ء) بنگال میں تعلیم نسواں کی پہلی علمبردار خاتون کہی جاسکتی ہیں۔

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں شائستہ اکرام اللہ کی خود نوشت مختصر سوانح اور برصغیر کی مسلم ثقافت سے منسلک انکی انگریزی کتاب "بی ہائنڈ دی ویل (پس پردہ) میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۹۱۵ء نوشتہ ہے۔ اقبال عظیم کو اس معاملے میں کچھ غلط فہمی ہوگئی۔ انہوں نے سن پیدائش ۱۹۲۵ء لکھا ہے۔

⁂ خجستہ اختر سہروردیہ فارسی میں آنرس اور ایم۔ اے کی سند یافتہ بنگال کی پہلی مسلم خاتون تھیں خجستہ کلکتہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے فارسی کی پہلی ممتحن خاتون رہیں۔ ۹ مارچ ۱۹۰۹ء کو انہوں نے کلکتہ میں سہروردیہ بیگم مسلم گرلز اسکول کی بنیاد رکھی تھی۔ جبکہ بیگم رقیہ نے سخاوت میموریل گرلز اسکول کلکتہ کی بنیاد ۱۹۱۱ء میں رکھی۔ لہذا میرا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ بنگال میں تعلیم نسواں کے حق میں پہلی آواز خجستہ بیگم ہی کی بلند ہوئی۔ اور بیگم رقیہ نے اسے نقطۂ عروج تک پہنچایا۔ "کوکب دری" (میلاد نامہ) "آئینۂ عبرت" "سلک مروارید" خجستہ اختر کی یادگار تصنیفات ہیں۔ خجستہ اختر کے بیٹے پروفیسر حسن شاہد سہروردی اور حسین شہید سہروردی (سابق وزیر اعظم پاکستان) برصغیر میں غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔

Dhaka University Institutional Repository

شائستہ اکرام اللہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ان کے والدین کی نگرانی میں ہوئی۔ جو ڈپٹی نذیر احمد کی اصلاحی ناولوں (مراۃ العروس) اور توبۃ النصوح) خواجہ حسن نظامی کے تاریخی افسانوں اور میر انیس کے مرثیوں پر مشتمل تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں نے ان کے دل کو متاثر اور ذہن کو بیدار کیا۔ میر انیس کے مرثیوں نے انہیں اردو زبان کی فصاحت و بلاغت سے آشنا اور حق و باطل کے تنازعے سے دل و دماغ کو متاثر کیا۔

شائستہ کے والد نے مطالعہ علم کا شوق دیکھ کر انہیں جدید تعلیم سے بہرہ مند کرنے کی خاطر LORE TO HOUSE CALCUTTA میں داخل کر دیا۔ یہاں سے شائستہ نے سینئر کیمبرج کی ڈگری حاصل کی۔ پھر ۱۹۳۳ء اسی کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی لندن سے انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی عنوان تھا "مختصر افسانہ نگاری پر تنقیدی نظریہ"

شائستہ کو اردو و انگریزی زبان و ادب پر بڑی استعداد حاصل تھی۔ ان کا پہلا مضمون ۱۹۳۴ء میں "عصمت دہلی" میں شائع ہوا۔ عنوان تھا "انگریزی طریقے سے نام لکھنا"۔ اردو رسائل عصمت دہلی، تہذیب نسواں، ہمایوں لاہور، حریم، لکھنؤ، انگریزی جرائد مثلاً کلکتہ سول اینڈ ملیٹری گزٹ، ڈان کراچی، اسٹیٹسمین کلکتہ، ہندوستان ٹائمز کلکتہ میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ عصمت کی وہ مستقل مضمون نگار تھیں۔ انہیں عصمت کا سالانہ ادبی انعام (۲۹) حاصل کرنے کا شرف حاصل رہا[1]۔ ان کے زیادہ تر مضامین اصلاحی، سیاحی، معاشرتی، ثقافتی پہلو پر مبنی ہیں۔ شائستہ بیگم بیرونی ممالک میں عمر کا بیشتر حصہ گزارنے کے باوجود اردو ادب اور مشرقی تہذیب کی دلدادہ تھیں۔ انہیں پاکستان میں پارلیمنٹ کی ممبر اور مراکش کی سفیر رہنے کا شرف حاصل رہا ہے[2]۔ انکی تصنیفات یہ ہیں۔

(۱) نیک بیبیاں : اس کتاب میں دور گذشتہ کے ان بڑے گھرانوں کی خواتین کے حالات لکھے ہیں جو آج کی خواتین کے لئے سبق آموز ہیں۔ اسے تذکرہ کہا جا سکتا ہے۔

(۲) "اردو ناولوں اور مختصر افسانہ نویسی پر تنقیدی تبصرہ" (تحقیقی مقالہ)

(۳) نینا کے خطوط (افسانہ)

(۴) کوشش ناتمام : (افسانوں کا مجموعہ)

---

[1] عصمت الماسی۔ جوبلی نمبر اگست ۱۹۶۸ء لاہور ص ۹۸

[2] ماہنامہ "بنات" لاہور۔ مئی ۱۹۷۱ء ص ۳۲

Dhaka University Institutional Repository

PUBISHED
FROM PARDA TO PARLIAMENT BY OXFORD UNIVERSITY LONDON

CEREMONIES CUSTOMS AND COLOUR
BEHIND THE VEIL FIRST PUBLISHED
BY PAKISTAN PUBLICATION. 1953

حسین شہید سہروردی
اے بائیوگرافی (سوانح) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، پاکستان ۱۹۵۱ء

نمونہ نثر:

"عصمت" کے دور اول کے لکھنے والیوں کے ناول اصلاحی اور مقصدی ہیں۔ کیونکہ یہ اصلاحی اور مقصدی دور تھا۔ جبکہ مسلمانوں کی معاشرت کی تعلیمی، اخلاقی اور تمدنی اصلاح پر لکھنا نہ صرف مضمون نگار، ناول نگار اور مقرر کا موضوع تھا بلکہ شاعر بھی اصلاحی نظمیں لکھتے تھے۔ خالص ادب کی کسوٹی پر مقصدی ناول یا افسانہ کا درجہ کم سمجھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے مقصدی ناول نگار کا اپنے نقطہ نگاہ کے اظہار کی کوشش سے کردار نگاری میں کمزوری رہ جاتی ہے۔ اس کے کردار جیتے جاگتے، چلتے پھرتے انسان نہیں ہوتے۔"[1]

شائستہ نے ۱۱ دسمبر ۲۰۰۰ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ اور وہیں پیوند خاک ہوئیں۔

---

[1] عصمت الماسی جوبلی نمبر کراچی۔ اگست ۱۹۶۸ء ص ۱۸۶

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر نظیر صدیقی

(۱۹۳۴ء - ۲۰۰۱ء)

مکمل نام محمد نظیر الدین صدیقی۔ ادبی نام نظیر صدیقی۔ تخلص نظیر۔ والد کا نام شیخ محمد ظہیر الحق تھا۔ پیدائش ۱۷ نومبر ۱۹۳۴ء کو موضع سرائے ساہو ضلع چھپرا (بہار) میں ہوئی۔

۱۹۴۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک اور ۱۹۴۸ء میں الہ آباد بورڈ (جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور) سے آئی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ۱۹۵۳ء میں ایم۔ اے اردو کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۵۴ء میں قائداعظم کالج ڈھاکہ میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں قائداعظم کالج سے استعفیٰ دے کر نوٹرڈم کالج ڈھاکا میں اردو کے عہدے پر بحال ہوئے۔ اسی دوران جز وقتی لکچرر کی حیثیت سے ۱۹۶۰ء میں مدرسۂ عالیہ اور ۱۹۶۳ء میں شعبہ صحافت ڈھاکا یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ ۱۹۶۹ء میں نوٹرڈم کالج ڈھاکا سے استعفیٰ دے کر اردو کالج کراچی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۷۱ء میں ان کا تبادلہ فیڈرل گورنمنٹ کالج اسلام آباد ہو گیا۔ ۱۹۷۶ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں معاون پروفیسر کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس یونیورسٹی میں کئی سال تک شعبۂ اردو کے صدر رہنے کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۹۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اور ۲۰ اکتوبر کو حکومت پاکستان کی جانب سے پیکنگ یونیورسٹی بیجنگ (چین) روانہ ہوئے۔ وہاں یونیورسٹی میں تدریسی خدمت انجام دے کر یکم جولائی ۱۹۹۱ء کو اسلام آباد واپس آ گئے۔

اردو ارباب قلم میں نظیر صدیقی کی شہرت اردو معلم، انشائیہ نگار، نقاد اور شاعر کی حیثیت سے ہے۔ ان کو اردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی دستگاہ حاصل تھی۔ انہوں نے اردو شعر و ادب سے متعلق انگریزی زبان میں بھی تصنیفات پیش کیں۔ ان کی تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے۔

شہرت کی خاطر (انشائیہ) پاک کتاب گھر ڈھاکا۔ اپریل ۱۹۶۱ء

یہ نظیر صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں "بیسویں صدی کے نقطہ نظر" "شہرت کی خاطر" "نظیر صدیقی مرحوم" ان کے اچھے مضامین ہیں۔ اس کے تمام مضامین میں اسلوب بیان کی فنکاری

۱؎ نظیر صدیقی۔ "سو یہ ہے اپنی زندگی" (سوانح حیات)

Dhaka University Institutional Repository

اچھی ہے۔

تاثرات وتعصبات (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) : شعبۂ تحقیق و اشاعت مدرسۂ عالیہ ڈھاکا۔ طبع اوّل ۱۹۶۲ء

یہ تنقیدی مجموعہ، موصوف کے گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ جن میں یگانہ چنگیزی، فیض احمد فیض، رشید احمد صدیقی، کچھ اپنی صفائی میں" اپنی نوعیت کے مفید مضامین ہیں۔ تاثرات و تعصبات مجموعی طور پر قابل قدر مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں نظیر صدیقی کا ناقدانہ صلاحیت اور صاف ستھرا اسلوب بیان قابل قدر ہے۔

میرے خیال میں (تنقید) : پاسبان آفسٹ پریس ڈھاکا۔ طبع اوّل مئی ۱۹۶۸ء

"میرے خیال میں" نظیر صدیقی کا چودہ تنقیدی مضامین پر مشتمل مجموعہ ہے۔ ان مضامین نظری اور عملی دونوں قسم کی تنقیدیں ہیں۔ "نظری تنقید میں اظہار یا ابلاغ اور اردو غزل کدھر کہاں؟ اردو ادب اور شعبہ اردو پر ناقدانہ اظہار خیال کیا ہے۔ عملی تنقید میں میر تقی میر، علامہ اقبال، کے کارناموں پر ناقدانہ تبصرہ اور نئے لکھنے والوں مثلاً ضیا جالندھری، محبوب خزاں، سلیم احمد کی شاعری اور افسانہ نگاری کا جائزہ پیش کرنے کی سعی کی ہے "میرے خیال میں" کے مطالعہ سے ان کی وسیع ادبی معلومات اور گہرے غور و فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ تشنگان ادب کے لئے یہ کتاب مفید کہی جا سکتی ہے۔

حرتِ اظہار (شعری مجموعہ) : خرم پریس کراچی۔ تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء

سو صفحات پر مشتمل یہ نظیر صدیقی کی غزلوں کا مجموعہ ہے اس کے بیشتر اشعار ان کے مشاہدات و تجربات کے ترجمان ہیں۔

جان پہچان (شخصیت نگاری) : اردو اکاڈمی کراچی ۱۹۷۹ء

ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایک مطالعہ : عظیمی پرنٹرز ناظم آباد کراچی۔ اشاعت اول ۱۹۸۵ء

اس میں مصنف نے عندلیب شادانی کی حیات اور ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ اسلوب بیان سلیس اور عام فہم ہے۔ واقعات کے بیان میں سچائی ہے۔ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب عندلیب شادانی کے

Dhaka University Institutional Repository

کے دور میں یہاں کے ادبی محفل کی آئینہ داری کرتی ہے۔

اردو ادب کے مغربی دریچے : نیشنل بک فاونڈیشن کراچی۔ ۱۹۸۳ء

جدید اردو غزل - ایک مطالعہ پبلی کیشنز اردو بازار لاہور ۱۹۸۴ء

اس میں جدید اردو غزل گوئی سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

ارمیں عالمی ادب کے تراجم : علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۱۹۸۸ء

دو سفرنامے : بک سنٹر راولپنڈی

سو یہ ہے اپنی زندگی (خودنوشت سوانح حیات) سرحد اردو اکاڈمی ایبٹ آباد۔ بار اول ۱۹۹۱ء

یہ نظر صدیقی کی خودنوشت سوانح حیات ہے جس میں ان کی زندگی کے ساتھ بنگلا پاک و ہند کے ادبی و سماجی ماحول کی عکاسی ہے۔ یہ کتاب نصف صدی کی ترجمان ہے۔ اسلوب بیان دلچسپ ہے۔

اقبال اینڈ رادھا کرشن (انگریزی) : اسٹرلنگ پبلشرز لمیٹڈ دہلی۔ ۱۹۸۸ء

آف دی ایسٹ اینڈ ویسٹ (انگریزی) ندیم پبلی کیشنز، اسلام آباد ۱۹۹۶ء

کالمسز آن بک این انگلش اینڈ اردو (انگلش) اسلام آباد ۱۹۹۸

ریف لکشن آف لائف اینڈ لٹریچر ثنا پبلی کیشن اسلام آباد ۱۹۹۶ء

ترتیب و تدوین

میگانہ چنگیزی : فیروز سنز کراچی ۱۹۷۱ء

نقشہائے رنگا رنگ : کاروانِ ادب، ملتان ۱۹۷۷ء

شیرازۂ خیال " " " ۱۹۸۲ء

نظر صدیقی کا مزاج انشا نگاری کے موافق تھا۔ ان کے انشائیوں میں فکر و نظر کا مادہ اور بیان میں تر و تازگی ہے۔ ان کے طنز و طرافت میں ندرت تہیں، بے ساختگی ہے جس سے ہنسنے ہنسانے کا شعور ظاہر ہوتا ہے۔ ادب و ثقافت کی بدحالی یا بربادی پر دردمندانہ اظہار کرتے ہوئے ان کا لہجہ غم و غصے سے آمیز ہو کر کبھی کبھی باغیانہ رنگ اختیار کر جاتا ہے

Dhaka University Institutional Repository

اور یہی کیفیت ان کی شاعری میں بھی ہے۔

نقاد کی حیثیت سے انہوں نے تنقید کے اصول و فرائض پر پابند رہنے کی کوشش کی ہے۔ تنقید میں وہ رشید احمد صدیقی اور حسن عسکری کے تابع نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے انہوں نے رشید احمد صدیقی کی روش پر چلنے کی کوشش ضرور کی لیکن بالواسطہ طور پر ان کے تنقیدی مضامین انشائیہ نگاری کا رنگ غالب ہے۔ ان کی ابتدائی تنقیدی "میرے خیال میں"، "تاثرات و تخصیصات" کے اکثر مضامین میں حوالات کا ذکر کم ہے۔ جبکہ تحقیق و تنقید کو چولی دامن کا ساتھ ہے اور تحقیق کی بنیاد حوالات ہیں۔ حوالات کی کمی ان کے مضامین کو کہیں کہیں بیانیہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ تکنیک کے لحاظ سے نظیر صدیقی کے انشائیہ مضامین تنقیدی مضامین کے مقابلے میں زیادہ کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔

شاعری میں نظیر صدیقی کا درجہ معیاری ہے۔ انہوں نے اپنا شعری مجموعہ "حسرت اظہار" کے دیباچے میں اپنی اظہاریت کے لئے تنقید کو پہلا اور انشائیہ کو دوسرا اور شاعری کو تیسرا وسیلہ کہا ہے۔ ان کی جذباتی اور فکری خیالات کی ترجمانی کے لئے انہوں نے شعر گوئی کو مناسب سمجھا۔ ورنہ ان کا طبعی رجحان شاعری کی طرف مائل نہیں تھا۔ نظیر نے اپنی شاعری کا آغاز ۱۹۵۹ء سے کیا۔ زندگی کی تلخی اور اس پر تنقید ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا سمجھا، جو کچھ ان پر بیتی اسے شعری پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ نظیر غزل کے شاعر ہیں۔ درد و غم ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کی شاعری میں روایت اور جدید رجحانات کا امتزاج ہے۔ اور روزمرہ محاورے کا استعمال صحیح کیا ہے۔ ان کی غزلیں غم جاناں اور غم دوراں کی ترجمان ہیں۔ ان خصوصیات میں نظیر صدیقی ایک انفرادی نمایاں ہے۔ رنگ کے حامل ہیں

نمونہ کلام :

عقل منکر ہو خدا سے تو دعا کس سے کریں
زندگی! تیری جفاؤں کا گلا کس سے کریں
زندگی! کتنے حیا سوز تقاضے ہیں ترے
پھر حیا کیسے کریں اور حیا کس سے کریں
محرم راز خطرناک بھی ہوتے ہیں نظیر
دل کو ہلکا جو کریں ہم تو بھلا کس سے کریں

Dhaka University Institutional Repository

غم کے ہاتھوں بن گئی ہے زندگی ایسا عذاب
چاہتا ہے دل یہی، اب کل نہ دیکھوں آفتاب
چند لفظوں میں یہی ہے میری رودادِ حیات
کارِ دنیا بے مزہ اور کارِ دل یکسر خراب
اتنے دھوکے ہم نے کھائے ہیں توجہ کے نظیرؔ
ہے یہیں اب ہر توجہ، ہر نظر سے اجتناب[1]

نمونہ نثر:

" اقبال تو خیر عمل کے شاعر کہلاتے ہیں۔ لیکن یہاں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ میرؔ کی شاعری دل و دلّی یا ذات و کائنات کا مرثیہ ہونے کے باوجود ہمیں بے حسی، بے عملی اور مجہولیت کی طرف نہیں لے جاتی۔ ان کے یہاں نشاطِ عمل کا احساس نہ سہی، ضرورتِ عمل پر اصرار ضرور ہے۔ میرؔ نے اپنی شاعری میں نہ فلسفی بننے کی کوشش کی ہے نہ پیغمبر۔ لیکن انکے یہاں زندگی کی اعلیٰ قدروں کا عرفان اور اثبات ضرور ملتا ہے۔ ان کی شاعری زخم خوردہ دلوں کے لئے مرہم بھی ہے اور زندگی کی تاریکی میں کھو جانے والوں کے لئے مشعل بھی[2]"

---

[1] حسرتِ اظہار۔ ص ۳۰ [2] میرے خیال میں ص ۲۲۲

Dhaka University Institutional Repository

خواجہ عطشؔ

(۱۹۱۹ء - ۸ر جنوری ۲۰۰۲ء)

خاندانی نام خواجہ ریاض الدین حسین۔ قلمی نام خواجہ ریاض الدین عطشؔ۔ والد کا نام خواجہ رضی الدین حسین تھا۔ ان کے دادا خواجہ سید فخر الدین حسین غالبؔ کے شاگرد اور اردو و فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ خواجہ عطشؔ کی تاریخ ولادت کے بارے میں پروفیسر ہارون الرشید کی حسب ذیل رائے سے مجھے اختلاف ہے۔

"خواجہ عطشؔ نے اپنے مجموعہ کلام "سوغاتِ جنوں" کے دیباچہ (تحریر کردہ ۵ر جون ۱۹۸۶) میں اپنی عمر ۶۶ سال لکھی ہے (ص ۱۴) جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا سال پیدائش ۱۹۱۹ء ہے۔ لیکن اس مجموعے میں ایک مضمون نگار نے ان کا سال پیدائش ۱۹۲۵ء لکھا ہے۔ عطشؔ کے اپنے بیان کی روشنی میں درست نہیں۔[1]"

خواجہ عطشؔ اردو ادبی حلقے میں بلند پایہ شاعر اور محقق کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۸ء سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں ایک فوجی ہوا باز کی حیثیت سے پانچ سال تک مشرق بعید میں جنگی خدمات انجام دی۔ ۱۹۵۲ء میں وہ ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آئے اور ڈھاکے کو اپنا مسکن بنایا۔ یہاں انہیں واپڈا میں ملازمت مل گئی جہاں وہ سنیر ایڈمنسٹر کی حیثیت سے قیام بنگلادیش تک کام کرتے رہے۔ خواجہ عطشؔ نے یہاں بھرپور زندگی گزاری۔ ان کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں پروفیسر ہارون الرشید رقمطراز ہیں:

"خواجہ عطشؔ نے ڈھاکے کی ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے دادا مرحوم سخن دہلوی کی یادگار کے طور پر ڈھاکے میں ۱۹۵۴ء میں "بزم سخن" کی بنیاد ڈالی۔ یہ انجمن سابق مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے تک سرگرم رہی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی اور علامہ آصفؔ بنارسی اس کے سرپرست اور مرحوم اخترؔ دہلوی سکریٹری رہے۔ اس بزم کے زیر اہتمام ماہانہ ادبی نشستیں اور سہ ماہی اور سالانہ مشاعرے پابندی سے ہوتے رہے۔ ۱۹۶۳ء میں خواجہ عطشؔ نے ڈھاکے میں "بزم اقبال" بھی قائم کی جس کے صدر نواب حسن عسکری مرحوم نائب صدر کیبنٹ خورشید انور اور وفا براہی، سرپرست ڈاکٹر عندلیب شادانی اور جنرل سکریٹری خود خواجہ ریاض الدین عطشؔ تھے۔ معاون سکریٹری نوشاد نوری، اخترؔ دہلوی و روشن علی عشرتؔ تھے

---

[1] پروفیسر ہارون الرشید۔ زیر طبع "محفل جو اجڑ گئی" اقتباس

Dhaka University Institutional Repository

اس بزم کے تحت بھی ماہانہ اور سالانہ مشاعرے پابندی سے ہوتے رہے۔ خواجہ عطش کے گھر پر بھی مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ جس کا سلسلہ کراچی سے لے کر مشرق وسطیٰ اور مشرق وسطیٰ سے امریکہ کی رہائش گاہ کے دوران تک جاری رہا[1]"

خواجہ عطش نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں انہوں نے کلاسیکی شاعری سے اکتساب کرتے ہوئے جدید شاعری کی صحت مند قدروں کو اپنانے کی کوشش کی۔ ان کے افکار میں گہرائی اور بیان میں وسعت ہے۔ وہ فطرتاً روشن خیال تھے۔ ڈھاکے میں قیام کے دوران انہوں نے چالیس سے زیادہ فلمی گیت لکھے[2] شاعری کے علاوہ نثر میں ان کا کام تحقیق و تفتیش تھا۔

۱۹۹۱ء سے اپنی زندگی کے آخری ایام تک خواجہ عطش شکاگو (امریکہ) میں مقیم تھے۔ وہاں بھی وہ ادبی سرگرمیوں سے منسلک رہے۔ خواجہ عطش، اختر سعیدی کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میں اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ مجھے وہاں کی جن ادبی و ثقافتی تنظیموں نے اعزازات اور ایوارڈ سے نوازا ہے اس میں علیگڑھ یونیورسٹی المنائی ایسوسی ایشن، اردو رائٹرس ایسوسی ایشن، ساؤتھ ایشین پرفارمنگ آرٹس کونسل آف امریکہ، اردو اکاڈمی، دی پاکستان ایسوسی ایشن بحرین، پاکستان فیڈریشن آف امریکہ اور عثمانیز کے نام شامل ہیں اس کے علاوہ اردو سوسائٹی آف نارتھ امریکہ نے بھی مجھے "غالب ایوارڈ" عطا کیا ہے۔ جو میرے لئے بڑے اعزاز و افتخار کی بات ہے[3]"

۸ جنوری ۲۰۰۲ء کو کینسر کے مرض میں شکاگو (امریکہ) میں خواجہ عطش کا انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

سوغاتِ جنوں (غزلوں کا مجموعہ)

یہ مجموعہ ڈھاکا میں قیام کے دوران "جادۂ منزل" کے نام سے ترتیب پا چکا تھا۔ کتابت ہو چکی تھی لیکن یہاں یہ اشاعت پذیر نہ ہو سکا۔

---

[1] ہارون الرشید، خواجہ عطش" انٹرنیشنل پیش رفت کراچی نومبر ۲۰۰۱ء ص ۴۷

[2] سہ ماہی پیش رفت کراچی "عطش نمبر ص ۳۸

Dhaka University Institutional Repository

"جشنِ جنوں" نظموں کا مجموعہ ہے۔ درد و نفس حمد و نعت کا مجموعہ۔

نثری تصنیف :

اردو کا نسب نامہ (اردو زبان کی مبسوط تاریخ)

اردو ہزار داستان۔

داغ کا آخری چراغ ـــــ مبارک عظیم آبادی۔

نمونۂ غزل :

ہر گوشۂ عالم میں زمانے کی صدا ہوں
میں وقت کا چلتا ہوا نقشِ کفِ پا ہوں
بجھ بجھ کے جلا، جل کے بجھا، بجھ کے جلا ہوں
میں رہ گزرِ بادِ حوادث کا دیا ہوں
اک عالمِ دنیا ہے میری ذات کے اندر
میں آگ بھی، مٹی بھی ہوں، پانی ہوں ہوا ہوں
ٹکرا کے پلٹتی ہے جو اسرارِ فلک سے
گردوں میں بھٹکتی ہوئی اک ایسی صدا ہوں
دن بھر کی عطش دھوپ کو دامن میں سمیٹے
میں شام کے سورج کی طرح ڈوب رہا ہوں

اشک کی بوند کو مٹی سے بچا کر رکھنا
یہ ٹپک جائے تو مشکل ہے اٹھا کر رکھنا
روشنی جس کی کسی اور کے کام آ جائے
اک دیا ایسا بھی رستے میں جلا کر رکھنا

Dhaka University Institutional Repository

فطرتؔ واسطی

(۱۹۱۰ء -)

نام سید شمیم احمد فطرت۔ تخلص واسطی۔ والد سید نیاز احمد عارف بلگرامی مشہور عالم اور ادیب تھے۔ فطرت واسطی کی پیدائش ۱۹۱۰ء لکھنؤ میں ہوئی۔ فطرت دسمبر ۱۹۴۸ء میں ہجرت کر کے سابق مشرقی پاکستان آئے۔ اور سلہٹ کے سرکاری کالج میں اردو لکچرر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی!

فطرتؔ کے والد نیاز احمد کی ادارت میں "شاہکار" ایک ماہنامہ گورکھپور سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوتا تھا۔ فطرتؔ اس کے مدیر معاون تھے [۲]

اردو ارباب محفل میں فطرتؔ واسطی شاعر اور مقالہ نویس کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے اس کا اعتراف سلیم اللہ فہمی اور ڈاکٹر اعجاز حسین نے بھی کیا ہے۔

فطرتؔ نے ناطق لکھنوی، علامہ اقبال، جوشؔ اور محسن کاکوروی کا گہرا اثر لیا ہے۔ ان کی شاعری روایتی طرز کی پابند ہے۔ یہی جدید ترقی پسند شاعری کی معترف۔ وہ ادب میں زندگی کے حقائق کی عکاسی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ ایک انفرادی درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کو تمثیل نگاری کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ "شیاما" ان کا پیکرِ حُسن ہے۔ ان کی یہ رومانی شاعری انسان کے شدید جذبات و احساسات کی عکاسی کرتی ہے۔

فطرت بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں۔ ان کی نظم "شیاما کے انتظار میں" شیاما کو دور سے دیکھ کر۔ "ابتک نہ آئی شیاما"، رومانیت اور تمثیل نگاری پر مبنی ہے۔ جہاں انسان کے رومانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے حقائق سے کام لیا ہے۔ فطرت کا یہ طرز خاص اپنی نوع میں آپ ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ حدیثِ حُسن کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

سلیم اللہ فہمی، فطرت کی رومانی نظموں کی خصوصیات کے متعلق لکھتے ہیں:

---

[۱] رسالہ "قلم کار" ڈھاکا۔ ص ۱۵ [۲] مشرقی بنگال میں اردو ص ۱-۳

Dhaka University Institutional Repository

"فطرت واسطی کی رومانی نظموں میں بڑا حُسن ہے ۔۔۔ بہت کم کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے ان کا رجحان مختلف ہے ۔ یعنی اسلامی اور قومی۔ میرے خیال میں فطرت حقیقی شاعر ہیں۔ ان سے آج بھی بہترین توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں"[1]!

مسعود شہریار اپنی کتاب "مشرقی پاکستان کا وسیع تر جائزہ" میں فطرت کے شاعرانہ تفکّر کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"قیام پاکستان کے بعد فطرت واسطی نے رومانی نظمیں کم کہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ زندگی کے اس دور سے گزر چکے ہیں جہاں ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ فطرت واسطی کا رجحان اب مختلف ہے۔ یعنی اب وہ اسلامی اور قومی موضوعات کو اپنی نظم میں جگہ دیتے ہیں"[2]!

شاعری کے علاوہ تنقید نگاری میں بھی ان کا درجہ کماحقہ بہتر ہے۔ ان کے ناقدانہ مضامین کا مجموعہ "مضامین فطرت" ۱۹۷۲ء میں شائع شائع ہوا۔ پاکستانی دور میں ان کے لکھنے کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔

نمونۂ کلام یہ ہیں:

مجھ سے قریب ہو کر پھر بھی ہے دور شیاما
میرا غرور شیاما، دل کا سرور شیاما

ملنے کا لطف ہی کیا جبتک نہ گفتگو ہو
کس طرح اک نظر میں تکمیلِ آرزو ہو

میری نظر کا کعبہ یہ سرزمیں ہے لیکن
اس عام جلوہ گہ میں خلوت نہیں ہے ممکن

---

[1] مسعود شہریار۔ مشرقی پاکستان کا وسیع تر جائزہ۔ لاہور۔ ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۱

[2] اقبال عظیم۔ مشرقی بنگال میں اردو۔ ص ۳۰۴

[3] شعبۂ اردو، "قلم کار" ڈھاکا، ص ۱۵

Dhaka University Institutional Repository

مزدور کی اس فضا کو خلوت بناؤں کیونکر
شیشہ کو ہر نظر سے پاریب بچاؤں کیونکر

سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران فطرت نے سیاسی نظمیں تخلیق کئے جس میں انہوں نے قوم کو طنز کے حربے لگائے ہیں۔ مثلاً "مسلم کانفرنس" کے عنوان سے "افغانستان" کی زبانی وہ یوں گویا ہوئے۔

مسلماں ہوں کب سے مگر بے یقیں ہوں
میں اَلْفَقْرُ فَخْرِی کا قائل نہیں ہوں
ضیائے ہدایت نہ راس آئی مجھ کو
جہاں سے چلا تھا میں اب تک وہیں ہوں
غلام اس کا ہوں جو میرا پیٹ بھر دے
میں افغاں ہوں، دل سے کسی کا نہیں ہوں

فطرت واسطی نے "اردو بنگلا بنجے پوڑو" کے عنوان سے ایک کتابچہ بھی لکھا جو اہل زبان اردو و بنگلا کو قریب تر کرنے کی کوشش تھی۔[1] فطرت کی تخلیقات سے یہ آگاہی ہوتی ہے کہ ۱۹۴۷ء بعد ان کی ادبی خدمات مختصر سہی لیکن مقصد کے تحت لکھی گئیں۔ انہیں اپنی زبان، قوم اور وطن بڑا پیارا تھا۔

فطرت واسطی کے دوست احباب کا کہنا ہے کہ ان کا انتقال ۱۹۶۱ء کے بعد سلہٹ میں ہوا۔ وہ اس وقت سلہٹ سرکاری کالج کے پروفیسر تھے۔

---

[1] اقبال عظیم۔ مشرقی پاکستان میں اردو ص ۳۰۴

Dhaka University Institutional Repository

سید شبیر علی کاظمی

(۱۹۱۵ء)

سید شبیر علی کاظمی کا شمار تقسیم ہندوستان کے بعد سابق مشرقی پاکستان میں ہجرت کر کے آنے والے اردو ارباب قلم میں ہوتا ہے۔ ان کی ولادت ۱۱ر جولائی ۱۹۱۵ء کو سنبھل ضلع مراد آباد (یوپی) میں ہوئی۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے ایم۔ اے اور بی۔ ٹی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ حالات سے مجبور ہو کر وہ سابق مشرقی پاکستان آئے۔ راجشاہی گورنمنٹ کالج میں ۱۶ر مئی ۱۹۴۹ء کو اردو لیکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا[1]۔ اردو درس و تدریس کے علاوہ شعری و نثری تخلیقات کی طرف بھی ان کا طبعی رجحان مائل رہا۔ لیکن شعر ضمناً کہتے تھے۔ وہ اردو زبان و ادب کو بنگالی حلقے میں متعارف کرانے کے قائل تھے۔ اس غرض سے انہوں نے بنگلہ زبان میں بھی واقفیت حاصل کی تھی۔ "بنگلہ اردو کے مشترک الفاظ" کے عنوان سے ان کی ایک بہترین تالیف رائٹر گلڈ اشاعت اسٹریچن روڈ کراچی سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ اس پر ماہر لسانیات ڈاکٹر شہید اللہ نے گراں قدر تبصرہ لکھا ہے[2]۔ اس کے علاوہ مصنف نے متعدد مضامین بھی سپرد قلم کئے۔ جو مؤقر رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔

نمونۂ نثر:

..... عوامی ادب کے متعلق میرا ذاتی خیال ہے کہ چلتا پھرتا لٹریچر ہے جو لوگوں تک سینہ بہ سینہ پہنچتا رہا ہے۔ عوام سے مراد دیہاتی جو تعلیم یافتہ نہیں ہوتے مگر اپنی جدا کلچر رکھتے ہیں اور اس کی ترجمانی اپنے ادب سے کرتے ہیں اس ادب کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اور یہ سب کے سب گاؤں اور دیہاتوں میں بسنے والوں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ کبھی کبھی مجموعی کوشش بھی ایسے ادب کی خالق بن جاتی ہے۔ لیکن بہت ہی کم انسانی فطرت عمل اور ردعمل کے تحت جذبات کو جنم دیتی ہے۔ عوام کے جذبات خواص سے ہٹے نہیں ہوتے ان کا پیرایہ بیان غیر مہذب سہی لیکن دلوں کی دھڑکنوں کا احساس ہوتا ہے[3]۔"

---

[1] مشرقی بنگال میں اردو۔ ص ۳۴۷

[2] ماہنامہ "ہم قلم" کراچی ستمبر ۱۹۶۳ء

[3] شبیر کاظمی۔ "اردو کا عوامی ادب" ششماہی "قلم کار" ڈھاکا۔ جنوری ۱۹۶۱ء ص ۴۸

Dhaka University Institutional Repository

یونس احمر

(یکم جنوری ۱۹۲۳ء)

مکمل نام محمد یونس۔ قلمی نام یونس احمر۔ پیدائش یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو بمقام حاجی لین کلکتہ میں ہوئی۔ والد کا نام مرحوم محمد اسمٰعیل تھا۔ دبستان اردو میں یونس احمر کی پہچان۔ ایک ممتاز مترجم و معتبر صحافی کی حیثیت سے ہے۔

ان کی ابتدائی تعلیم مکتب دارالہدیٰ کلکتہ میں ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں پاک سرکس ہائی اسکول سے میٹرک ۱۹۴۰ء میں رپن کالج کلکتہ انٹرمیڈیٹ ۱۹۴۲ء میں سینٹ زیویرز کالج کلکتہ سے بی۔ اے اور ۱۹۵۰ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کی ڈگری لی۔

ان کی ملازمت مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں ۱۹۴۷ء سے اردو و انگریزی کے استاد کی حیثیت سے شروع ہوئی۔ اسی سال آل انڈیا ریڈیو کلکتہ میں کنٹریکٹ پر انہیں "مزدور منڈلی" پروگرام پیش کرنے کے فرائض بھی سونپے گئے۔ دس منٹ کا یہ پروگرام روزانہ پیش ہوتا تھا۔[1]

۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقدہ بھیمڑی (بمبئی) میں شرکت کی جرم میں ریڈیو کا کنٹریکٹ ختم کر دیا گیا تو وہ اپنی روزی روٹی کی کفالت کے لئے درس و تدریس کے علاوہ کلکتے کے اردو صحافت سے بھی منسلک ہو گئے۔ وہ کلکتہ کے اخبارات، روزانہ ہند، آزاد ہند اور عصر جدید میں وقفے وقفے سے کام کرتے رہے اور ۱۹۵۱ء میں کلکتہ سے ڈھاکا منتقل ہو گئے۔

اسی سال دسمبر میں انہیں ریڈیو پاکستان ڈھاکا میں ملازمت مل گئی۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد کے ہمراہ لانچ میں انہوں نے مشرقی پاکستان کے تمام ساحلی علاقوں کا دورہ کیا۔ فروری ۱۹۵۲ء میں یونس احمر کا ڈھاکا سے کراچی تبادلہ ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد ناگزیر وجوہ کی بنا پر یونس احمر ڈھاکا آ گئے۔ اور روزنامہ "پاسبان" اور "انقلاب" سے وابستہ ہو گئے۔ مارچ ۱۹۵۶ء میں ابوالاثر حفیظ جالندھری ڈھاکا آئے۔ ان دنوں وہ وزارت امور اقتصادیات کے تحت "ویلیج ایڈ پبلسٹی" کے ڈائرکٹر تھے۔ حفیظ جالندھری کی خواہش پر یونس احمر کا تقرر اس محکمے میں ہو گیا۔ اور وہ دوبارہ کراچی چلے گئے۔ کراچی سے "پاک سرزمین" کے نام سے رسالے کا اجرا ہوا۔ تو ابن انشا اور یونس احمر پرچے کی ادارت اور طباعت کے انچارج ہو گئے۔ ۱۹۵۹ء میں پبلک سروس کمیشن نے یونس احمر کو ریڈیو پاکستان کی بیرونی نشریات کے لئے بطور "ٹاکس افیسر" منتخب کر لیا۔ چنانچہ فروری ۱۹۷۷ء تک وہ یہاں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان کی میتالی سروس میں بحیثیت پروگرام مینیجر ان کا راولپنڈی تبادلہ ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان کی یہ سروس بنگلادیش کے لئے مخصوص

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں یونس احمر نے اپنی ادبی خدمات معہ مختصر سوانح ارسال کیں۔ مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۹۳ء۔

137
Dhaka University Institutional Repository

تھی۔ جنوری ۱۹۷۹ء میں یونس احمر آزاد کشمیر ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ اور ۱۹۸۰ء میں ریڈیو پاکستان اسلام آباد کے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں انسٹرکٹر کے عہدے پر مامور رہنے کے بعد ۱۹۸۳ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے!

دوران تعلیم یونس احمر کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ ان کا پہلا مضمون ماہنامہ "مدرس" دہلی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے متعدد افسانے اور ترجمے برصغیر کے مؤقر رسائل جدید اردو، نقاش، عالمگیر (کلکتہ)، نیرنگ خیال، ادب لطیف، خیام، نقوش، سویرا (لاہور) افکار (بھوپال) ساقی، شاہراہ (دہلی) ماہِ نو (کراچی) میں شائع ہوتے رہے۔

بہ قول یونس احمر، انہوں نے جن بلند مرتبت شخصیتوں سے فیض اٹھایا اور ان کے اثرات قبول کئے ان میں خاص طور پر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، قاضی نذر الاسلام، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، نیاز فتحپوری، پرویز شاہدی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، جمیل مظہری، آرزو لکھنوی، رضا علی وحشت، شاہد احمد دہلوی، بدھادیو بوس، ہیرن مکرجی، گوپال ہلدار، مانک بنرجی، پربودھ کمار سانیال، بھوتی بھوشن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اور جن اکابر و مشاہیر کی تخلیقات سے انہوں نے اپنے علم و مطالعہ میں اضافہ کیا۔ ان میں گورکی، شکسپیئر، ٹامس ہارڈی، ٹالسٹائی، میخوف، سارتر، ٹیگور، قاضی نذر الاسلام، علامہ اقبال، غالب، میر، فیض، سروجنی نائیڈو اور حافظ شیرازی وغیرہ شامل ہیں۔

یونس احمر شروع ہی سے ترقی پسند نظریات کے حامی رہے۔ وہ زندگی کی قدروں کو اہمیت دیتے ہیں۔ انسانی ہمدردی ان کا ایمان ہے اور اسی احساس نے انہیں ایک فطری ادیب کے سانچے میں ڈھالا انہیں اس حقیقت پر اعتبار ہے کہ انسان اپنے ماحول کے ساتھ اپنے آپ کو بدلتے رہنے کی کوشش کرتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا ادب تعصب اور تنگ نظری سے خال خال ہے۔

انہوں نے قاضی نذر الاسلام کی گیتوں سے متاثر ہو کر بنگلا سیکھی۔ کلکتہ میں "نوجگ" کے دفتر میں نذر الاسلام سے ملاقات کی[۲] انکے پیکر کو دیکھکر محفوظ ہوئے۔ یونس نے انکی ان گنت نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ اور ان کے ادبی کارناموں سے متعلق مضامین بھی سپرد قلم کئے۔

یونس احمر کی ترجمہ نویسی پر روشنی ڈالتے ہوئے افسر ماہ پوری رقمطراز ہیں:

---

[۱] یونس احمر۔ ماضی کے تعاقب میں" (خود نوشت) فضلی سنز پرائیوٹ لمیٹڈ اردو بازار کراچی۔ طبع اوّل ۱۹۹۱ء ص ۱۰

[۲] ایضاً

Dhaka University Institutional Repository

"یونس احمر کو اپنی ادبی زندگی کے آغاز ہی سے بنگالی زبان و ادب سے بے پناہ دلچسپی و وابستگی پیدا ہو گئی تھی۔ اور رفتہ رفتہ انہوں نے اس میدان میں ایسا امتیاز و اختصاص حاصل کیا کہ یہی ان کی پہچان بن گئی[1]۔"

قیام پاکستان کے بعد اردو بنگالی تخلیقات اردو میں منتقل کرنے میں جن مشاہیر ادب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں سلیم اللہ فہمی، احسن احمد اشک، احمد سعدی، رفیع احمد فدائی، سعد میر، نعیم البصیر کے نام نمایاں ہیں۔ یونس احمر کا شمار بھی اسی مؤقر جماعت کے صف اوّل میں ہوتا ہے۔ ان ترجمہ نگاروں میں معیار کے لحاظ سے احسن احمد اشک اور مقدار کے اعتبار سے یونس احمر کے نام نمایاں ہیں۔

یونس احمر کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

طغیان: (قاضی نذرالاسلام کے آٹھ افسانوں کا ترجمہ) اردو بازار دہلی ۱۹۴۵ء

طغیان، میں آٹھ تراجم افسانوں کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں: "ماجھی ایسا گیت نہ گا" "رم جھم"، "سلاخوں کے پیچھے" "آپ بیتیاں" "شعلے اور پھول" "جنا"، "مہر نگار"، "خلا (بیربہوم)" یونس احمر کے یہ ترجمے ایک حد تک کامیاب ہیں۔ کتاب کے اختتام پر صادق الخیری نے "نذرالاسلام اور ان کے افسانے" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں نذرل کی شخصیت اور اس کا ذہنی ارتقاء اور ان کی رومانی اور انقلابی نظریئے کی ترجمانی کی ہے۔

وہ تین: (بنگلا افسانوں کے تراجم) ۱۹۵۳ء

انتخاب کلام شعرائے بنگال: (تراجم) ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی۔ ۱۹۵۴ء

اس انتخاب میں چھ سو سال کے سامان بنگالی شعراء کی شعری نگارشات کو براہ راست بنگلا سے اردو میں منتقل کیا۔ اس میں شاہ محمد صغیر، سید سلطان، قاضی دولت الاول، اور لالن شاہ جیسے ابتدائی شاعروں سے لیکر، کیقباد، بیگم صوفیہ کمال، فرخ احمد، سید علی احسن جیسے معاصر شعراء شامل ہیں۔

---

[1] ماضی کے تعاقب میں" ص ۲۱

Dhaka University Institutional Repository

گلڈ پبلشنگ ہاؤس لاہور - ۱۹۶۱ء

کھنڈر : (مترجم ناول) بی بھوتی بھوشن بندوپادھیائے کے بنگلا ناول "پوتھر پانچالی" کا اردو ترجمہ

لال چادر (ناولٹ)

سید ولی اللہ کے بنگلا ناول "لال سالو" کا اردو ترجمہ - یہ ترجمہ انہوں نے ۱۹۵۸ء میں کیا تھا۔

قاضی نذرالاسلام (زندگی اور فن) ناشر، نذرل اکیڈمی کراچی - باراول ۱۹۶۷ء

قاضی نذرل اسلام کی حیات اور شاعری سے متعلق اردو میں یہ بڑی مفید کتاب ہے اس میں مصنف نے نذرل کی شاعری کا پس منظر، ان کی حیات اور شاعرانہ تفکر کی توضیح پیش کرنے کے بعد ان کے ہم عصر شعراء کے تاثرات بھی قلمبند کئے ہیں۔ اردو شاعر مجاز سے نذرل کے رجائی و باغیانہ اشعار کا موازنہ مع مثالوں کے کیا ہے اختتام میں نذرل کے تصانیف کی فہرست پیش کی ہے۔ اردو طبقے میں نذرل کو متعارف کرانے کی یہ ایک کامیاب سعی ہے۔

زوال سلطنت مغلیہ : ۱۹۶۸ء

تاریخ ادبیات - مسلمانان پاکستان و ہند : ۱۹۷۳ء

گیارہویں و بارہویں جلدوں میں بنگلا ادب سے متعلق بیشتر مقالے یونس احمر نے تحریر کئے ہیں۔

سانگس آف لو اینڈ اسٹرگل : ۱۹۸۴ء فارغ بخاری کی اردو نظموں کا انگریزی ترجمہ۔

ماڈرن اردو پوئٹس : (زیر ترتیب) جدید اردو شعراء پر انگریزی مضامین کا مجموعہ

ماضی کے تعاقب میں : (خودنوشت) فضلی سنز پرائیوٹ لمیٹڈ اردو بازار کراچی طبع اول ۱۹۹۱ء

۲۷۱ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف مصنف کی آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ یہ بیسویں صدی کی آخری نصف صدی کا آئینہ کہا جا سکتا ہے جس میں عصری سماجی و سیاسی واقعات عیاں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جو واقعات و واردات وقوع پذیر ہوئے اور جو شخصیتیں ان واقعات و

Accession No 2340

Dhaka University Institutional Repository

واردات کے پس پشت تھیں۔ الفاظ میں ان کا مرقع ایک ماہر مصوّر کی طرح کھینچا ہے۔ اس تصنیف میں اردو اور بنگلا ادب اور ادیبوں سے متعلق یونس امر نے اپنی یاد کے حوالے سے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور معلومات سے پُر بھی۔ ان کا مقام اس تصنیف میں ایک مالی کے مانند ہے۔ جو باغ کی سیر کراتا ہے یونس احمر نے اس کتاب میں اپنے کو ہیرو بنا کر پیش نہیں کیا۔ اور نہ مجرم بننے کی سعی کی۔ واقعات کے بیان میں صداقت بدرجہ اتم موجود ہے۔

یونس احمر کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے اختر پیامی لکھتے ہیں۔

"یونس احمر نے زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے دیس بدیس کی خاک چھانی ہے اور ان کا ادبی سرمایہ آنے والی نسلوں کے لئے نشان راہ ہے"۔[۱]

یونس احمر ادب برائے زندگی کے حامی ہیں۔ ان کی تمام تر ادبی تخلیقات مقاصد سے پُر ہیں۔ وہ اردو و بنگلا دونوں ادب میں اپنی خدمات کی بنا پر قابل قدر ہیں۔

نمونۂ نثر: ۔۔۔۔ "نذرل کی شاعری زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ ان کے یہاں مظلوم انسانیت کا مفہوم ساری کائنات کی انسانیت ہے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ میں اس دن مطمئن ہوں گا جب ساری دنیا سے ظلم و جور کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ واقعہ بھی ہے کہ نذرل ہمیشہ ساری کائنات کے مظلوموں کے حلق میں امرت رس ٹپکاتے۔ وہ چاہتے تھے کہ ذات پات، اونچ نیچ، امیری و غریبی کا فرق ہمیشہ کے لئے مٹ جائے"۔

یونس احمر کو ابتدائی دور میں شعر و شاعری سے بھی شغف رہا۔ اصناف شاعری میں انہوں نے نظم و غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی مگر ان کی بنیادی تفکر کو نظم میں اجاگر ہونے کا موقع ملا۔ ان کی شاعری کا بنیادی تصور انسانی ہمدردی ہے۔ یونس احمر کی نظم "مزدور کے آنسو" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں کہی اور "نقاش" کلکتہ (۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء) میں شائع ہوئی۔

آہ یہ دنیا جہنم بن گئی میرے لئے
اہل زر کے واسطے ہے یہ بہشت رنگ و بو
مدتوں تڑپا کیا میں درد کی تکلیف سے
مدتوں چوسا کئے ہیں اہل زر میرا لہو
مدتوں بار غلامی سے رہا سر میرا خم
مدتوں مزدور و بیکس کی رہی دولت عدو (مزدور کے آنسو)

---

[۱] سہ ماہی "روشنائی"، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲ء ص ۱۵۵

Dhaka University Institutional Repository

جمیل عظیم آبادی

(۷ جنوری ۱۹۲۶ء)

مکمل نام محمد جمیل احسن، قلمی نام جمیل عظیم آبادی۔ والد کا نام مولوی محمد یوسف تھا۔ جمیل کی پیدائش ۷ جنوری ۱۹۲۶ء کو عظیم آباد (پٹنہ) میں ہوئی۔ ۱۹۴۷ء۔ اے۔ کام، بی۔ کام اور ایل۔ ایم۔ بی تک تعلیم حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد سابق مشرقی پاکستان آکر سکونت اختیار کی۔ ۱۹۷۱ء کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔

دبستان اردو میں جمیل کی پہچان ایک معیاری شاعر کی حیثیت سے ہے۔ ان کی شاعری میں روایت اور جدت کا امتزاج ہے۔ انہوں نے غزل، نظم، دوہے، سانیٹ، گیت وغیرہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن ان کی شاعرانہ جوہر کو دوہوں میں کھل کر نمایاں ہونے کا موقع ملا۔ نظم گوئی میں وہ نظیر اکبر آبادی، حالی، آزاد، علامہ اقبال اور جوش سے متاثر ہیں۔ جمیل کی غزلوں میں حسن و عشق کے حسین بیان کے پہلو بہ پہلو فکری عناصر بھی نمایاں ہیں۔

جمیل کی شاعری تفنن طبع نہیں تنقید حیات ہے۔ جمیل اپنے شاعرانہ طرز تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"..... میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ شاعری کو میں ذریعۂ ابلاغ سمجھتا ہوں اور اسی لئے راست بات کہنے کا قائل ہوں۔ تاکہ عوام میرے شعروں کے مفہوم تک پہنچ جائیں۔ اور الہام کے چکر میں نہ پڑیں میں روزمرہ کے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہوں" [1]

جمیل کی شاعری کو ان کے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ ان کی نظموں میں موجودہ حالات زمانہ کی عکاسی اور سامراجی ظلم و استبداد کی مزمت ہے۔

"زندگی"، "مزدور"، "آدمی"، "بیروت جل رہا ہے" ان کی مفید نظمیں ہیں۔ جمیل کے دوہے علمی، اخلاقی اور فکری مضامین سے بھرپور ہیں۔ جمیل کا اسلوب نگارش عام فہم، صاف ستھرا اور بڑا دلنشین ہے۔ انہوں نے دوہے کے قدیم ہندی بحر میں اردو تفکر کو پیش کی ہے۔ دوہوں میں ہندی الفاظ کا استعمال سلیقے سے کیا ہے۔ ان کے دوہے قدیم جام میں ہندی اور اردو کا دو آتشہ ہے۔

---

[1] جمیل عظیم آبادی "گیان درپن" (دوہے) ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۸۵ء ص ۲۵

Dhaka University Institutional Repository

مثال :- بپھرا ساگر، چڑھتی ندی، نیّا نا پتوار
اللہ کو تم ہانک لگاؤ، ہو جاؤ گے پار

میرے نبیؐ کی شان نہ پوچھو، ایشور کے اُپہار
جس پر آشیرباد ہو ان کی، اس کا بیڑا پار

شورشِ درد سے دن رات سسکتا مزدور
جستجوئے رہِ منزل میں بھٹکتا مزدور
زیب و زینت کے محافل سے جھجکتا مزدور
اپنی محنت کے پسینے میں مہکتا مزدور

شدتِ کرب سے بے جان نظر آتا ہے
پیکرِ درد، وہ انسان نظر آتا ہے

(مزدور)

جمیلؔ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :

دل کی کتاب : (غزلوں کا مجموعہ) ۱۹۸۴ء
گیان دریا : (دوہے اور گیتوں کا مجموعہ) ۱۹۸۵ء ایجوکیشنل پریس کراچی۔
وحدت و مدحت : (حمد و نعت کا مجموعہ) ۱۹۸۷ء
آب و سراب : (نظموں کا مجموعہ) ۱۹۹۳ء
طلسمِ خیال : (قطعات اور نظمیں)

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر وفا راشدی

(یکم مارچ ۱۹۲۶ء-)

اصل نام عبدالستار خان۔ قلمی نام وفا راشدی۔ پیدائش یکم مارچ ۱۹۲۶ء کو کلکتہ میں ہوئی۔ والد مرحوم کا نام گلزار احمد خاں راشدی تھا[1]

وفا راشدی نے ۱۹۴۲ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے میٹرک اور ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ تقسیم ہندوستان کے نتائج پر ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا آئے اور ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۵۰ء میں لاہور چلے گئے۔ سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کی ۱۹۸۰ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی اسی یونیورسٹی سے لی۔ مقالے کا عنوان تھا "اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ"، ۱۹۹۴ء میں پاکستان اردو اکاڈمی نے اسے کتابی شکل میں شایع کیا۔

مختلف سرکاری اداروں اور تعلیمی اداروں میں تقریباً پچاس سال نہایت محنت، نیک نامی کے ساتھ ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۹۲ء میں ہارٹ اٹیک کے سبب انجمن ترقی اردو پاکستان سے بحیثیت سینئر اسکالر از خود ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس کے بعد سے اب تک اپنے قائم کردہ تعلیمی و ادبی اداروں کے فرائض انجام دے رہے ہیں[2]

ڈاکٹر وفا راشدی دنیائے ادب کے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر پھیلی ہوئی ان کی ادبی زندگی میں تسلسل اور توازن کے ساتھ خلوص اور لگن کے نقوش ان کے قاری کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ادب کے حوالے سے ان کا تعارف تذکرہ نگار، محقق اور نقاد کی حیثیت سے ہے۔ لیکن ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ انہوں نے طالب علمی کے دور ان پانچویں جماعت سے شعر کہنا شروع کیا۔ میٹرک تک اسکول کے استاد رضا مظہری (جمیل مظہری کے چھوٹے بھائی) سے اصلاح لیتے تھے اسکے بعد وحشت کلکتوی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ ڈھاکا آنے کے بعد عندلیب شادانی سے استفادہ حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کلکتے کے ہر چھوٹے بڑے مشاعرے میں اپنا کلام سنا کر داد و دہش کے مستحق بنے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۹ء تک ڈھاکا، مدناپور، جیسور، مرشد آباد، چاٹگام، سلہٹ، کھلنا، بمبئی، لاہور، کراچی، حیدر آباد اور اندرون سندھ کے مشاعروں میں شعر کہہ کر داد وصول کی۔ ۱۹۶۲ء تک برابر شعر کہتے رہے۔ ابتدائی دور میں شوقیہ افسانے بھی لکھے جو اس وقت کے معیاری رسائل میں شائع ہوئے۔ رفتہ رفتہ ان کا طبعی رجحان تحقیق و تذکرہ نگاری کی طرف مائل ہو گیا اور وہ ایک

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں وفا راشدی نے اپنے بارے میں تفصیلی معلومات مع مختصر سوانح فراہم کیں۔ ۱۳ جولائی ۱۹۹۵ء۔

[2] ایضاً

Dhaka University Institutional Repository

کامیاب مصنف کی حیثیت سے دنیائے ادب پر چھا گئے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء سے نومبر ۱۹۴۹ء تک ان کا قیام ڈھاکے میں رہا۔ ان کے کل جواہر پاروں میں تقریباً نصف حصے کا تعلق متحدہ بنگال کی تاریخ و اردو ادب سے ہے۔ سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران ان کی ادبی سرگرمیوں میں چند اہم خدمات کی نشاندہی ضروری سمجھتی ہوں جو حسب ذیل ہیں۔

انجمن دائرۂ ادب: انہوں نے ۱۹۴۸ء میں انجمن دائرہ ادب ڈھاکا قائم کیا۔ عندلیب شادانی اس کے صدر اور وفا راشدی اس کے بانی اور سرگرم رکن و معاون سکریٹری تھے۔ افسر ماہ پوری اس کے پہلے سکریٹری رہے۔ اس انجمن کا قابل یادگار واقعہ یہ ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور جگر مرادآبادی نے دائرہ ادب کے خاص اجلاس میں شرکت کی۔ اس کے بعد بابائے اردو اور صدر انجمن ترقی اردو پاکستان نے سابق مشرقی پاکستان میں اردو کی تبلیغ کے سلسلے میں مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ اس دوران اور تا آخر وفا راشدی ہم سفر رہے۔

فکرستان ایجنسی: وفا راشدی نے فکرستان ایجنسی کے نام سے ۱۹۴۷ء میں ایک بک ایجنسی کی یہاں یہاں داغ بیل بھی ڈالی تھی۔ جس کے ماتحت پاک و ہند کے اردو رسائل اور کتب سرکاری دفتروں اور اداروں تک پہنچائے جاتے تھے۔ اس زمانے میں زیادہ تر دفتروں اور کتب خانوں میں وفا راشدی کے تعاون سے رسالے اور کتب فراہم کئے گئے!

مکتبۂ اشاعت اردو: کلکتہ/ڈھاکا — پہلے ۱۹۴۶ء میں کلکتے میں مکتبہ اشاعت اردو کی بنیاد رکھی گئی۔ بعد ازاں جب وفا راشدی ڈھاکا پہنچے تو یہ ادارہ بھی ڈھاکا منتقل ہو گیا۔

وفا راشدی کی تصنیفات و تالیفات:

جہانِ رنگ و بُو: (تدوین) مکتبۂ ندیم۔ پٹنہ

ٹیگور۔ نذرالاسلام۔ ورڈزورتھ۔ کیٹس۔ بائرن۔ شیلے وغیرہ کی مشہور نظموں کے منظوم تراجم کا مجموعہ۔ اسے وفا راشدی نے مرتب کیا۔

پیام نو: مکتبہ اشاعت اردو ڈھاکا ۱۹۴۷ء

۱۹۴۷ء میں تحریک آزادی سے متعلق قومی اور ملّی نغموں کا مجموعہ ہے جس میں برصغیر

Dhaka University Institutional Repository

کے ہر صوبے کے ممتاز شعراء کی بلند پایہ قومی و ملکی نظمیں ہیں۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہر شاعر کی خود نوشت سوانح عمری بھی شامل ہے۔

بنگال میں اردو ۔ مکتبۂ اشاعت اردو حیدر آباد سندھ۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء

۲۹۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دبستان اردو کے محقق کے لئے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں انہوں نے بنگال میں ڈھائی سو سال کے اردو شعر و ادب کی تاریخ کو آسان اور عام فہم زبان میں ایک کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ تنقیدی تصنیف نہیں ہے۔ متحدہ بنگال میں ابتدا سے ۱۹۵۵ء تک اردو نظم و نثر کی مختصر مگر جامع تاریخ ہے۔ اردو ادب کے محققین کے لئے ایک روشن منارہ ہے۔

چاند تارے ۔ مکتبہ اشاعت اردو حیدر آباد (سندھ) ۱۹۵۸ء

پانچ اہل قلم (جس میں وہ خود بھی شامل ہیں۔) کے چند مقالوں، افسانوں غیر ملکی ترجموں اور شاعری پر مبنی ہے۔

اردو میں قومی شاعری ۔ سندھ یونیورسٹی حیدر آباد۔ ۱۹۶۶ء

کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ مصنف کی تحقیق و تذکرے کی پہلی کاوش کہی جا سکتی ہے۔ جسے انہوں نے بڑی عرق ریزی سے تصنیف کیا ہے۔

سنہرا دیس ۔ ادارہ مطبوعات پاکستان ۱۹۶۴ء

سنہرا دیس، وفا راشدی کا یادگار کارنامہ ہے۔ یہ سابق مشرقی پاکستان (بنگلادیش) کی تاریخ ادبیات، اہم مقامات، مشاہیر و اولیائے کرام کے بارے میں ایک گراں قدر دستاویز ہے۔ اس کتاب کا بنگلا ترجمہ بھی اسی ادارے کے ماتحت انجام پایا۔ سنہرا دیس کی اہمیت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی ادبی حیثیت اور تاریخی حقیقت کے تناظر میں ایوب خان کی حکومت نے ۱۹۶۶ء میں وفا راشدی کو بہترین مصنف کی حیثیت سے انعام و اکرام سے نوازا اور توصیفی سند بھی عطا کی۔

خالدہ ایک نیا آہنگ (تحقیق و تنقید) مکتبہ فانوس، لاہور ۱۹۷۲ء

Dhaka University Institutional Repository

عبدالعزیز خالد کے فن اور آہنگ پر وفا راشدی کی تحقیق اور تنقید کا مفید نمونہ ہے۔ اس میں خالد کی شخصیت کے تناظر میں ان کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

کیفیاتِ غالب : آئینۂ ادب لاہور - ۱۹۷۲ء

کیفیات غالب میں غالب کی شخصیت اور ان کے کلام کا تجزیہ پیش کیا گیا۔ یہ کتاب اردو طلبا، کے مفاد کے پیشِ نظر لکھی ہے۔

آہنگِ ظفر (تدوین) مکتبۂ اشاعت اردو کراچی - ۱۹۸۲ء

یہ ظفر ہاشمی کے پچیس سال (۱۹۵۶ء تا ۱۹۸۱ء) پر محیط کلام ایک خوبصورت انتخاب ہے۔

حیاتِ وحشت : الجوکیشنل پریس کراچی - ۱۹۸۲ء

۱۹۲ صفحات کی یہ کتاب "حیات وحشت" وحشت کی زندگی، شخصیت، فن، نثر، نظم اور دیگر علمی و ادبی خدمات کے تحقیقی و تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔ اس میں مصنف نے پہلے اس علمی ادبی اور تاریخی پس منظر کو اجاگر کیا جو علامہ کے ذہنی و ادبی ارتقاء میں کارفرما رہا۔ پھر وحشت کی ذاتی زندگی اور شخصیت کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد ان کے نثر و نظم کی جملہ اصناف پر ناقدانہ بحث کی ہے۔ دیگر خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ مصنف نے مولانا الطاف حسین حالی سے لیکر عندلیب شادانی تک سترہ ۱۷ باکمال شعراء و ادباء کا وحشت کے متعلق تاثرات بھی قلمبند فرمایا ہے اور ان مشاہیر فن کے خطوط بھی نقل کئے جس سے وحشت کی علمی و ادبی صلاحیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور اس دور کے ادبی ماحول کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ اس کتاب پر مقدمہ رئیس امروہوی نے لکھا ہے۔

مہران نقش : مکتبہ اشاعت اردو کراچی - ۱۹۸۶ء

اس میں سرزمین سندھ پر اسلامی حکومت کا عروج و زوال، حکومت برطانیہ کا آغاز، سندھ میں اردو زبان و ادب کا عہد بہ عہد فروغ پر روشنی ڈالی ہے نیز سندھ میں فارسی ادب کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد حضرت لعل شہباز قلندرؒ، قیصر بیدلؒ وغیرہ کے علاوہ چند برگزیدہ

Dhaka University Institutional Repository

علمی و روحانی شخصیتوں کی مختصر سوانح عمری پیش کی ہے۔ اس کی تصنیف میں مصنف نے بڑی تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے۔

سحر حلال : مکتبہ اشاعت اردو کراچی - ۱۹۸۶ء

یہ شہاب الدین رحمت اللہ کے کلام کا انتخاب ہے۔ وفا راشدی نے مرتب کیا۔

اُردو کی ترقی میں اولیاء سندھ کا حصہ : مغربی پاکستان اردو اکاڈمی لاہور - ۱۹۹۴ء

یہ وفا راشدی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس میں مصنف نے اولیاء سندھ کے اردو زبان و ادب سے منسلک خدمات کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد ناقدانہ تبصرہ پیش کیا ہے۔

میرے بزرگ میرے ہمعصر : (تذکرہ و تحقیق) ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۹۵ء

یہ کتاب چھتیس ۳۶ مشاہیر ادب کے کارناموں اور شخصیت کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔ اس پر وفا راشدی نے اپنے ہم عصر بزرگوں پر قلم اٹھایا ہے۔ اس میں جن شعراء و ادباء کا تذکرہ پیش کیا ہے۔ ان کے حوالے سے شخصیات کے رہائشی شہروں اور ماحول کی تہذیبی کا مرقع پیش کرتی ہے۔ خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد، عندلیب شادانی، ناطق لکھنوی جمیل مظہری، سلیم اللہ فہمی، رحمت اللہ شہاب وغیرہ کے تذکروں سے متحدہ بنگال کے علاوہ سابق مشرقی پاکستان و مغربی پاکستان (موجودہ بنگلا دیش اور پاکستان) کی قومی، سیاسی، ادبی و سماجی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ تصنیف بنگلا، پاک و بھارت میں نصف صدی پر پھیلی ہوئی سیاسی، قومی و تہذیبی رجحانات کی بھی ترجمان ہے۔ اردو ادب اور تاریخ کے محققین کے لئے یہ کتاب مشعل راہ کہی جا سکتی ہے۔

غیر مطبوعہ تصانیف :

تذکرہ علمائے سندھ :

کلکتے کی ادبی داستانیں :

سندھ میں اردو نعتیہ شاعری :

Dhaka University Institutional Repository

مقالاتِ راشدی (کتابوں پر تنقید و تبصرہ)

نقشِ وفا (مرقع غزلیات و منظومات)

مذکورہ غیر مطبوعہ تصانیف کے عنوانات ہی سے اس کی نوعیت اور نفس مضامین واضح ہے۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد گرانقدر مضامین برصغیر کے مؤقر جریدوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وفا راشدی بسیار نویس مصنف ہیں۔ اردو ادب پر ان کے احسانات ناقابل فراموش ہیں۔ وفا راشدی کی سب سے بڑی خوبی انسانی ہمدردی اور حب الوطنی ہے۔ "وفا" صحیح معنوں میں صفات وفا سے ملبوث ہیں۔ وہ جس سرزمین میں رہے اس سے وفا ہی کی۔ اس کی خاک کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ صحیح معنوں میں ادب کو زندہ رہنے کے لئے ایسے ہی خادم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا حصہ بنگال اور سندھ میں منقسم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی معلومات، تجربات، مشاہدات یعنی ہر صفات پر بنگال اور سندھ کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کا عکس نمایاں ہے۔ ان کی ادبی نگارشات پر یہی تجربات کارفرما ہیں۔ وفا راشدی کو اردو ادب سے جنون کی حد تک عشق ہے۔ تحقیق و تنقید ان کا پیشہ بھی ہے اور نشہ بھی۔ ان کا قلم تعصب سے پاک ہے یہ ان کی وسیع النظری کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ ان کی ادبی خدمات سے بنگال اور سندھ کی اسلامی تاریخ، تہذیب و تمدن پر بھی بالواسطہ روشنی پڑی ہے اور گمنامی میں پڑے ہوئے اردو و فارسی فن اور فنکار بھی منظر عام پر آئے ہیں۔ وفا کی تصنیفات زیادہ تر تحقیق و تذکرہ نگاری پر مشتمل ہے۔ ان کے یہاں تنقید کا مقدار کم صحیح با اصول ہے۔ ادب نوازی میں ان کی تحقیق و جستجو قابل داد ہے۔ وفا کا انداز بیان مولوی عبدالحق سے مماثل ہے۔ وہ ایک باشعور نثر نگار ہیں۔ ان کا طرز نگارش ادیبانہ ہے۔ عبارت آرائی سے اجتناب برتتے ہیں۔ سچائی اور حقیقت نے ان کے اسلوب کو پایہ داری بخشی ہے۔

وفا راشدی اردو ادب کے ان چند اہل قلم میں سے ہیں جنہوں نے ادبی تاریخ میں اپنا مقام متعین کر لیا ہے اردو شعبۂ ادب کے تخلیق و تحقیق میں ان کے کارنامے یکساں اہمیت اور افادیت کے حامل ہیں۔ وفا راشدی کی کاوشوں نے انہیں صرف اردو اب میں نہیں بلکہ سندھ اور بنگال کی تاریخ میں بھی حیات ابدی عطا کی ہے۔

نمونۂ نثر:

۔۔۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ابتدائی دور میں شاعری اور مشاعروں کی نسبت سے کلکتہ کے کئی ارباب ذوق سے دوستی تھی جن میں مولانا رضا علی وحشت کو اولیت حاصل تھی

Dhaka University Institutional Repository

مولانا آزاد کا سن پیدائش ۱۸۸۸ء اور وحشت کا سال پیدائش ۱۸۸۱ء ہے۔ اس طرح آزاد وحشت سے عمر میں سات سال چھوٹے تھے۔ لیکن علمی و ادبی حلقوں میں یکساں مقبول تھے۔ دونوں کے دوستانہ تعلقات تھے ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے تھے۔" خوش قسمتی سے خاکسار نے ان دونوں بزرگو کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ دونوں کی صحبتوں سے فیضیاب ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔ اس ناچیز نے وحشت کو آزاد کے بالی گنج والے مکان میں، مولانا آزاد کو وحشت کے ویلسلی والے گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے۔"

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر حنیف فوق

۲۶ دسمبر ۱۹۲۶ء

مکمل نام حنیف فوق قریشی۔ قلمی نام حنیف فوق۔ تخلص فوق۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۲۶ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ والد محمد کریم اللہ بغرض تجارت بھوپال میں رہائش پذیر تھے۔ حنیف فوق نے میٹرک شاہ جہاں ہائی اسکول بھوپال سے، انٹرمیڈیٹ کا امتحان مسلم کالج کانپور سے پاس کیا۔ یہاں اردو و فارسی امتیازی نمبر حاصل کرنے پر ایس ایس مشران طلائی تمغے سے نوازا گیا۔ بی اے آنرز اردو اور ایم۔ اے (اردو) کا امتحان لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۴۹ء میں پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء کے ہندو مسلم فسادات سے دل برداشتہ ہو کر سابق مشرقی پاکستان تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ایما سے شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر ان کا تقرر ہو گیا۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں اس وقت کے ادبی ماحول سے فائدہ اٹھا کر بغیر کسی راہنما کے ۱۹۶۲ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ پیش کیا اور کامیاب ہو گئے۔ دی سوشیل انالائسز آف اردو پوئٹری 1957 - اینڈ آفٹر۔ (اردو شاعری کا سماجی تجزیہ ۱۹۵۷ء اور اس کے بعد) ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان کے ممتحن تھے۔ ۱۹۵۰ء سے قیام بنگلہ دیش تک شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ ۱۹۷۲ء میں کراچی ہجرت کر گئے۔ یہاں جامعہ کراچی کے شعبہ اردو سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۳ء میں حکومت پاکستان نے ڈپوٹیشن پر انقرہ یونیورسٹی (ترکی) بھیج دیا۔ جہاں ۱۹۸۱ء تک شعبہ اردو اور مطالعہ پاکستان کے پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور اردو زبان و ادب کی تدریس میں مشغول رہے۔ اسی دوران حنیف فوق نے ترکی زبان پر عبور حاصل کیا۔ اور ایک کتاب اتاترک۔ اردو جاپائین لاردا" (اتاترک۔ اردو تحریروں میں) ترکی زبان میں تحریر کی اور دوسری کتاب انگریزی زبان میں لکھی جس کا عنوان تھا۔ "اقبال اور مغربی افکار کا ورثہ"۔ یونیورسٹی سے شائع ہوئیں۔ ۱۹۸۱ء ترکی سے کراچی واپس آ کر جامعہ کراچی میں اردو درس و تدریس میں دوبارہ منسلک ہو گئے۔ بحیثیت پروفیسر ۱۹۸۶ء میں اسی شعبے سے ریٹائر ہوئے[1]۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی شعبۂ اردو کے درس و تدریس سے ان کا تعلق رہا۔ اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے ریسرچ کی رہنمائی میں مشغول رہے[2]۔ ان کی رہنمائی میں شوکت اللہ خان نے "اردو شاعری میں ظرافت نگاری" سید محبوب شاہ نے "سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدوں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ" اور سید سعید احمد نے "اردو زبان و ادب کی ترقی میں کانپور کا حصہ" کے موضوعات پر ڈاکٹریٹ

---

[1] سید سعید احمد۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں کانپور کا حصہ" (تحقیقی مقالہ) سید اینڈ سید پبلشرز کراچی۔ اپریل ۲۰۰۱ء

[2] میرے سوالنامے کے جواب میں حنیف فوق نے اپنے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کیں ۱۵ دسمبر ۲۰۰۱ء

Dhaka University Institutional Repository

کی اسناد حاصل کیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے ریسرچ کی ان کی رہنمائی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ علاوہ ازیں اردو ڈکشنری بورڈ میں چیف ایڈیٹر کے فرائض بھی انجام دیئے۔[1]

ڈاکٹر حنیف فوق کا شمار اس عہد کے نہایت معتبر صاحبانِ علم و دانش میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ممتاز نقاد اور مقبول شاعر کی حیثیت سے شہرت پا چکے ہیں۔ ان کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ۱۹۴۲ء سے ہوا اور نثر نگاری میں پہلا مضمون "ادب میں شخصیت" کے عنوان سے "نگار" لکھنو نے مارچ ۱۹۴۷ء میں شائع کیا۔ فوق کا بنیادی میدان تحقیق و تنقید ہے۔ اس میدان میں وہ اپنے ہم عصروں میں صف اول میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ادبی نقاد کی حیثیت سے حنیف فوق کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فن کی پختگی اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ ان کے یہاں بڑے صحت مندانہ رجحانات بھی ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے مغربی علوم سے مفاد حاصل کیا ہے۔ انقلاب بنگلادیش سے قبل ان کی تخلیقات میں سابق مشرقی پاکستان کی ادب و ثقافت سے متعلق فکری عناصر کی نشاندہی ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "دھانوں کی وادی میں" بہترین مثال ہے۔ حنیف فوق ترقی پسند شعراء و ادباء کے ہمنوا ہیں۔ وہ لسانی اور مقامی تعصب سے یکسر بیگانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی رہے وہاں کے مقامی فنکاروں کا تاثر لیا۔ یہاں رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری نے انہیں متاثر کیا۔ جب ترکی گئے تو اُغلو فواد کی رباعیات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اختر سعید کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے ان کا یہ قول ملاحظہ فرمائیے:

"..... ڈھاکا میں مجھے بنگالی ادیبوں کے ارتباط سے بہت فائدہ ہوا۔ گویا ایک نئی جہت کے دروازے کھل گئے۔"[2]

حنیف فوق ایک باشعور نقاد ہیں۔ ان کی تنقید سائنٹیفک ہے۔ وہ تنقید کے جدید تر اصولوں سے بخوبی واقف ہیں فوق اس ادب کو ترجیح دیتے ہیں جس سے زندگی کے مسائل بھی حل ہوتے ہیں ادب کی روح بھی تازہ رہے۔ ان کا یہ نصب العین ان کے تخلیقات میں کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ اردو تنقید کو بھی بنگالی زبان و ادب سے جوڑنے کی سعی کر رہے تھے۔ اس ضمن میں ان کی تنقیدی مضامین "اردو کے بنگالی تراجم"، "مشرقی پاکستان میں اردو ادب ادیبوں کے مسائل" اور "اردو ادب میں بنگالی ثقافت کے عناصر" پاکستان میں اردو ادب کے چند گوشے قابل ذکر ہیں۔ حنیف فوق کی تنقیدی گہرائی

---

[1] اردو زبان و ادب کی ترقی میں کانپور کا حصہ۔ ص ۲۲۳

[2] اختر سعیدی۔ روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۶ مارچ ۲۰۰۶ء

Dhaka University Institutional Repository

گیرائی، تجزیہ، تحلیل، تحسین سب ہی اوصاف ہیں۔ ان کا انداز بیان ایسا ہے جیسا ایک مدبر نقاد کا ہونا چاہیئے۔
فوق اپنی تنقید کے باب میں خود رقمطراز ہیں۔

"میری تنقید اقدار کی تنقید ہے۔ نظریاتی تنقید ہے جو بظاہر فلسفیانہ تصور کے ساتھ ہے۔
میں ان لکھنے والوں میں سے ہوں جنہوں نے مغربی افکار اور مغربی ادب کو پڑھا ہے لیکن
اُگلا نہیں ہے۔ نقالی نہیں کی ہے۔ ان سے استفادہ بھی کیا ہے اور اختلاف بھی۔"

نقاد کے علاوہ شاعر کی حیثیت سے بھی کادر جہ مقبول ہے وہ نظم و غزل دونوں اصناف پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔
آپ کی شاعری برصغیر کے تمام مؤقر جرائد جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ فنون، لاہور۔ ادب لطیف کراچی۔ قرنگ خیال میں آپ کی غزلیں چھپتی رہتی ہیں۔ فوق غالب کے بہت بڑے مداح ہیں۔ وہ غالب کو سرتاج شاعری سمجھتے ہیں۔ فکری اعتبار سے ان کے یہاں اقبال بڑے ہیں۔ ہم عصروں میں فیض، ندیم، ناصر کاظمی، جمیل الدین عالی اور احمد فراز کو پسند کرتے ہیں۔

فوق کی تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہے

مشعلِ قدریں: دبستان مشرق ڈھاکا۔ اشاعت اول ۱۹۶۸ء

یہ فوق کی ۲۲ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے انہوں نے ڈھاکا یونیورسٹی کے علمی روایات کے انتساب کیا ہے۔ مجموعہ کے مضامین میں حنیف فوق کی عملی تنقید کی صلاحیت اور عمرانی تنقید سے وابستگی کا شعور نمایاں ہے۔ اس مجموعہ میں غالب، داغ، فیض اور مجاز کے بارے میں سائنٹیفک تنقید کے نمونے ملتے ہیں۔

متوازی نقوش: نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی۔ طبع اوّل ۱۹۸۹ء

یہ مجموعہ حنیف فوق کے ۳۲ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جو مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے۔
جدت۔ بحوالہ انسان"، "عالمی تہذیبوں میں مسلمانوں کا حصہ (ادب میں)"
محمد اردو کہیں یا محمد پاکستان"، "میر انیس اور رحلۂ امعین"، "عالمی تہذیب، عصر حاضر
کے تقاضے اور ادب" وغیرہ منتخب مضامین ہیں۔ مصنف نے ادبی زبان میں ہر مسئلہ کو عالمانہ
اور مدلل طریقے سے سمجھا کر پیش کیا ہے۔ (انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ بار اول دسمبر ۱۹۸۲ء)

Dhaka University Institutional Repository

چراغِ شناسائی ترجمہ رباعیات فواد۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔ بار اوّل ۱۹۸۵ء

فواد بابرم اوغلو کے رباعیات کو اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ نیز ترک رباعی گو فواد کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

جاجائین لاردا (اتاترک اردو تحریروں میں) الفرہ یونیورسٹی۔

اقبال اور مغربی افکار کا ورثہ (انگریزی)

نمونہ نثر:

"..... یہ بات اہم ہے کہ اردو نثر نگاروں نے بنگال میں ایک نئی تہذیبی دنیا کی دریافت کی ہے۔ جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے حد درجہ تازگی اور دلکشی کی حامل ہے۔ امید ہے بنگال کی ثقافت اردو ادب کی محفل میں نئے چراغ روشن کرتی رہے گی۔"

لہ اردو ادب میں بنگالی ثقافت کے عناصر۔ ناول نگاری میں۔ متوازی نقوش۔

Dhaka University Institutional Repository

محمد عثمان رمز

(۱۹۲۹ء)

خاندانی نام محمد عثمان۔ تخلص رمز ہے۔ ولادت ۲۶ جولائی ۱۹۲۹ء کو الہ آباد (انڈیا) میں ہوئی۔ والد کا نام محمد سلطان انصاری تھا۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے ایم اے پر تعلیم مکمل کی۔ شعروشاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ شاعری میں حضرت تابش دہلوی اور حضرت نوح ناروی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ رمز شروع ہی سے جماعت اسلامی کے حامی ہیں۔ ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۴۹ء سے ہوا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد سابق مشرقی پاکستان آئے اور اس سرزمین کو اپنا وطن بنایا۔ ۱۹۷۱ء کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔ رمز کو شعر و شاعری کے علاوہ مضمون نگاری کا بھی شوق تھا۔ ان کے مضامین پاک و ہند کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں[1]

محمد عثمان رمز ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ ان کا لائحہ عمل فلسفہ اسلام ہے۔ وہ اپنا مضمون "میرا تصورِ ادب" میں دعوٰی کے ساتھ لکھتے ہیں "میں ادب میں جس نظریئے کا قائل ہوں وہ یہ ہے۔

ایک خدا ۔ ایک انسان ۔ ایک سماج"

شاعری میں رمز اپنے نظریئے کو تشبیہ اور کنایہ کے پیرایے میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے نفس مضمون کو براہ راست نہیں بلکہ علامتی پیکروں میں پیش کیا ہے۔ مثلاً آئینہ، پتھر، ہاتھ وغیرہ ان کی شاعری میں انسان کے مختلف قدروں کی علامت ہیں۔ علم عروض کے پیمانے کو انہوں نے شاعری میں کہاں تک نبھایا ہے۔ اس کی توضیح سے راقمہ قاصر ہے۔ نفس شاعری کے لحاظ سے ان کے اشعار مفید ہیں۔ ان کا فکری رجحان انسانی زندگی کے نیک پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے

بہ قول رمز ان کی بیاض مع کتابوں کے ۱۹۷۱ء کے ہنگامہ کے دوران بنگلہ دیش میں برباد ہو گئی۔ ۱۹۹۰ء میں ان کی ایک نئی بیاض بے خیالی میں کراچی میں کھو گئی۔ ان کا شعری مجموعہ "زخم تنہائی" ۱۹۹۰ء سے غالباً ۱۹۹۷ء تک کے کلام پر مشتمل ہے[2] جو ۱۹۹۷ء افریشیا پرنٹنگ پریس ناظم آباد کراچی سے چھپ کر شائع ہوا۔

(نمونۂ کلام اگلے صفحہ پر)

---

[1] "زخم تنہائی" (شعری مجموعہ) ۱۹۹۷ء کراچی

[2] " " "

Dhaka University Institutional Repository

شرک سے شکل بگڑ جاتی ہے
آئینہ دیکھو تو تنہا دیکھو
رات عیبوں کو چھپا دیتی ہے
دن میں انسان کا سایہ دیکھو

ریگِ صحرا نہیں، سراب نہیں
زندگی خواب ہے، عذاب نہیں
خود فراموشی اور خود سوزی
ان سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں

جو دکھاوے کے واسطے ہو گی
ایسی نیکی میں کچھ ثواب نہیں
اپنے سائے سے بات کرتا ہے
رمز کا بھی کوئی جواب نہیں

دو حصوں میں بٹنے کی بس اتنی سزا یاد
شیشے کی ادا یاد، نہ پتھر کی ادا یاد
اس شہرِ پُر آشوب کے حالات کو پڑھ کر
میں نے شبِ تنہائی میں کیا کیا نہ کیا یاد

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر اظہر قادری

(۱۹۲۹ء-)

مکمل نام ظہیر الدین محمد یحییٰ۔ قلمی نام اظہر قادری۔ تخلص اظہر۔ ۱۵ جولائی ۱۹۲۹ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے[1] والد، کیپٹن قمر صدیقی وحشت کے چہیتے شاگرد تھے۔ اظہر قادری کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۵ء میں بی۔ اے اور ۱۹۵۰ء میں ایم۔ اے کی سند ملنے پر ڈھاکا آگئے۔ سینٹ گریگوریز کالج (ڈھاکا) ہولی کراس کالج (ڈھاکا) ڈھاکا یونیورسٹی (جزوقتی) میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ انہوں نے پاکستان کونسل ڈھاکا میں بنگالیوں اور دیگر غیر بنگالیوں کو اردو پڑھانے کے فرائض بھی انجام دیئے۔ نیز سابق مشرقی پاکستان میں بننے والی کئی فلموں کے گانے اور مکالمے بھی تحریر کئے۔ انقلاب بنگلہ دیش کے بعد کراچی ہجرت کر گئے۔ موصوف ان دنوں کراچی یونیورسٹی اور رجاح یونیورسٹی میں جزوقتی ملازمت کر رہے ہیں۔ انہیں اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی غیر معمولی دستگاہ حاصل ہے۔

اردو ارباب قلم میں اظہر قادری کا تعارف تنقید نگار، شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ مگر ان کا بنیادی میدان تحقیق و تنقید ہے۔ اظہر کا رجحان ترقی پسند ہے شاعری میں وہ فیض احمد فیض سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کے حقیقی جذبات کے علاوہ زندگی کے مسائل کی بھی ترجمانی ملتی ہے۔ شاعری میں انہوں نے نظم، غزل اور رباعی پر طبع آزمائی کی ہے۔ اظہر قادری کی غزلیں جدید ہونے کے باوجود روایت سے منحرف نہیں۔ یعنی ان کا طرز نگارش روایتی اور تخیل جدید ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی کے مسائل سے بھی بحث ہے اور تغزل کی شان بھی باقی ہے۔ نظموں میں ان کا طرز بیان علامتی ہے۔ انداز بیان صاف، سادہ، سلیس اور دلکش ہے۔ ان کی نثری نگارشات مختلف جرائد میں بکھری ہوئی ہیں۔

نمونہ غزل:

لا سکے حرف شکایت عشق میں لب پر نہ ہم
ہر ستم اس نے کیا ہم پر بہ انداز کرم
دشت میں ترسا کئے ہم لوگ اک اک بوند کو
شہر میں برسا کئے ہر شام کو ابر کرم

---

[1] اظہر قادری۔ نگار فن کے محرکات، ناشر حلقہ آہنگ نو کراچی ۱۹۷۲ء ص ۴

* کیپٹن قمر صدیقی ۱۹۵۰ء میں فورتھ ایسٹ بنگال رجمنٹ ڈھاکا مشرقی پاکستان کے اہم افسر تھے۔ یہاں وہ فوج کی دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ فوج کے شعبہ تعلیم کے افسر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے

Dhaka University Institutional Repository

کیوں پریشاں آپ کی زلفیں ہوا اسکے حال پر
کیوں فدا کے واسطے ہو آپ کو اظہر کا غم

اظہر کی نظم "روشنی کا ساتھ دو" سے چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں:

روشنی تاریخِ انسانی کا باب پر وقار
روشنی ہر عہد کے انساں کے دل کی آرزو
روشنی انساں کے چہرے کا جمال
روشنی تہذیب کی شائستگی
روشنی ایوب کا صبرِ جمیل
روشنی مریم کی عصمت
روشنی اعجاز عیسیٰ کا ظہور
روشنی شہرِ مبارک علم کا
روشنی دروازہ شہرِ علم کا
روشنی کرب و بلا میں پرچم ابنِ علی

روشنی سے پیار ہے تم کو اگر
روشنی کا ساتھ دو
تیرگی کو مات دو

ادبی حلقوں میں اظہر قادری نقاد کی حیثیت سے مقبول ہیں اظہر قادری کی ادبی تصنیفات میں ان کی تنقیدی نگارشات کو ادبی و علمی حیثیت سے اہم کہا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے ان کا تعلق انسان سے ہے اور تنقید ایک ایسا وسیلہ ہے جس میں انسان کے گوناگوں اقدار سے بحث ہو سکتی ہے انسان کے بلند و بالا قدروں کی وضاحت اور برائیوں پر مزاحمت ان کا نصب العین ہے۔ ان کے کل تنقیدی و طنزیہ مضامین اسی ضمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اظہر کے تنقیدی و طنزیہ مضامین

Dhaka University Institutional Repository

کے موضوعات علمی، اقتصادی اور معاشی ہیں۔ شفیق احمد شفیق نے اظہر قادری کی تنقید نگاری پر حسب ذیل رائے پیش کی ہے۔

"..... اظہر قادری تنقید کے جدید سائنٹفک اصولوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ادب، سیاست اور فلسفہ میں ان کا اپروچ قابلِ رشک ہے۔ عالمی ادب اور فلسفے کے مطالعہ نے ان کے اندر گہرائی پیدا کر دی ہے۔"[1]

بحیثیت مجموعی اظہر قادری کی تنقید علمی اور تعمیری کہی جا سکتی ہے۔ تنقید کرتے ہوئے ان کا قلم تعصب اور جانبداری سے پاک رہتا ہے۔ ان کی تنقید ادب کے ساتھ انسانی زندگی کا رشتہ جوڑتی ہے۔

تنقید کے بعد ان کی دیگر نثری خدمات افسانہ نویسی اور ناول نگاری ہے۔ اظہر قادری کے افسانے ہمارے ماحول کے سچے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ افسانوں میں ان کی زبان صاف، شگفتہ اور عام فہم ہے۔ ان کے افسانے افکار (کراچی) اور جمالستان (دہلی) پاسبان ڈھاکا وغیرہ میں شائع ہوتے رہے

افسانوں کے علاوہ انہوں نے ایک طنزیہ ناول بھی لکھا ہے۔ "جو کتے کی آپ بیتی" کے نام سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہو چکا ہے

ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

رضا علی وحشت — مکتبہ ادب جدید ڈھاکا دسمبر ۱۹۵۵ء

اس میں وحشت کلکتوی کے مختصر حالاتِ زندگی، ان کے کردار اور شاعری پر ناقدانہ روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں صفحہ ۴۵-۷۹ کلام کا انتخاب ہے۔

ایک کتے کی آپ بیتی (طنزیہ ناول) — ایشیا کتاب کار ڈھاکا ۱۹۶۸ء

کتاب کا موضوع قیام پاکستان سے قبل دوسری جنگ عظیم سے متاثر واقعات سے ہیں اس اس میں انہوں نے سرمایہ دارانہ نظام پر طنز کے کوڑے بھی لگائے اور انسانی برادری کے عام مفاد کی حمایت بھی کی۔ اس میں ان کی شگفتہ بیانی قابل داد ہے۔

فکر و فن کے محرکات (تنقید) — مصنف۔ پروفیسر اظہر قادری، مرتب: شفیق احمد شفیق۔ ناشر: آہنگ کراچی ۱۹۸۲ء

---

[1] شفیق احمد شفیق۔ "اظہر قادری" ادراک ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۹۱ء ص ۶۱

Dhaka University Institutional Repository

۱۶۰ صفحات پر مشتمل یہ اظہر قادری کی تنقیدی و فکری مضامین کا مجموعہ ہے۔ نوعیت کے لحاظ سے اسے تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔ فکر و نظر، شخص و عکس، نقد و نگاہ، ان عنوانات کے تناظر میں مضامین ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ان میں ہند و شعراء بارگاہِ رسول میں، فکر و فن کے بنیادی محرکات، جوش ایک تجزیاتی مطالعہ، ارمغان عالی وغیرہ پر ایک نظر، اچھے مضامین ہیں۔

زیر طبع : "ادب اور سائنس" (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

رباعیات :

اس کے علاوہ اظہر قادری کے گرانقدر انگریزی و اردو تنقیدی مضامین مؤقر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان مضامین کے موضوعات اردو، فارسی، انگریزی ادب سے منسلک ہیں۔

اظہر قادری نے سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران رفیع احمد فدائی اور شفیق احمد شفیق کے ساتھ مل کر "سب رنگ" نام کا ایک ہفتہ وار جریدہ بھی نکالا تھا۔ ماہنامہ "جام نو" کراچی کے ادارۂ تحریر سے وابستہ رہے۔ سہ ماہی "ترسیل" (انٹرنیشنل) کے سرپرست کی حیثیت سے شریک ہیں۔

نمونہ نثر : ..... ہندوستان میں قدم جمانے کے بعد انگریزوں نے پہلے کلکتہ کو اپنی حکومت کا مرکز قرار دیا اور کلکتہ ایک عرصہ تک ہندوستان کا مرکز رہا۔ اور اس لئے اس کا اثر بنگال کے مختلف اضلاع پر پڑا۔ انگریزوں کی آمد سے جدید خیالات زندگی سے متعلق نئے نقاط نظر کلکتہ سے نکل کر ہندوستان کے مختلف اضلاع تک پھیل گئے۔ بنگال میں کلکتہ کے بعد مرشد آباد اور ڈھاکا سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔[۲]

---

[۱] فکر و فن کے محرکات "چہرہ نما" ص ۴

[۲] "ساقی" مشرقی پاکستان نمبر ص ۳۳۷

Dhaka University Institutional Repository

اختر بیامی

(یکم فروری سنہ ۱۹۳۰ء -)

اصل نام سید سعید اختر، معروف اختر بیامی، والد کا نام سید سیف الدین تھا۔ یکم فروری ۱۹۳۰ء کو موضع حسین آباد ضلع بہار میں پیدا ہوئے۔ گیا ہری داس سیمنری اسکول سے فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس کرنے کے بعد کلکتہ مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی بعد ازاں رائچی کالج سے معاشیات میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد ملک کے نامساعد حالات سے مجبور ہو کر سابق مشرقی پاکستان آگئے اور جیسور کے ایک اسکول میں بطور استاد ذمہ داری سنبھالی۔ کچھ دنوں تک نیو گورنمنٹ اسکول ڈھاکا میں بھی مدرس رہے۔[1]

اردو ارباب قلم میں اختر بیامی کی پہچان ایک شاعر اور صحافی کی حیثیت سے ہے۔ صحافت ان کا پسندیدہ پیشہ اور شاعری نشہ ہے۔ اختر بیامی کو بچپن ہی سے شعر و ادب کا ماحول ملا تھا ان کے دادا شاہ محمد ہاشم حسین آبادی صاحب دیوان شاعر تھے۔ موصوف کے گھریلو ماحول نے ان کے شاعرانہ اور صحافیانہ ذوق کو جلا بخشی اور وہ ایک مقبول شاعر و صحافی بننے میں کامیاب ہو گئے۔ اختر بیامی بنیادی طور پر صحافی ہیں۔ ان کی صحافت نگاری کا آغاز کلکتہ میں قیام کے دوران ہفتہ وار "منزل" (کلکتہ) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوا۔ موصوف کچھ دنوں تک "ساتھی" پٹنہ سے بھی منسلک رہے۔ ڈھاکا آنے کے بعد "مورننگ نیوز" (انگریزی اخبار) میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر خدمت انجام دی۔ سنہ ۱۹۷۲ء کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔ وہاں بھی صحافت نگاری ان کا ذریعہ معاش ہے پہلے مورننگ نیوز کراچی میں کچھ عرصہ کام کرنے بعد روزنامہ "ڈان" میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔ اب ریٹائر ہونے کے بعد جز وقتی طور پر اسی اخبار سے منسلک ہیں۔ آغاز ہی سے ان کا پیشہ صحافت ہے شعر و شاعری ان کا مشغلہ رہا ہے۔[2]

"تاریخ" اور "کلس" (اشاعت اول پٹنہ ۱۹۹۹ء) کے عنوان سے ان کی نظموں کے دو مجموعے پٹنہ سے انکے بھائی جابر حسین نے شائع کروایا۔

اختر بیامی سہ ماہی "روشنائی" کے لئے انٹرویو دیتے ہوئے احمد زین الدین کو اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں:

"۔۔۔۔ میں نے مختلف موضوعات پر نظمیں ضرور لکھیں مگر میری شاعری کا محور سیاسی تھا۔ موجودہ دور کے قارئین کے لئے وہ نظمیں ممکن ہے ناقابل فہم ہوں۔ گرچہ جب لکھی تھیں اور شائع ہوئی تھیں ان میں بڑی آب و تاب تھی۔"[3]

---

[1] [2] سہ ماہی "روشنائی"، جولائی۔ ستمبر سنہ ۲۰۰۰ء صہ ۱۵۹ - ۱۶۰ -

[3] ایضاً ص ۱۶۹

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر حنیف فوق ان کی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"۔۔۔ اختر پیامی کی شاعری کا ایک حصہ تو وہ ہے جو سابق مشرقی پاکستان میں ہجرت سے پہلے زمانہ طالب علمی میں ادبی و سیاسی فعالیت کے دور میں لکھا گیا۔ دوسرا حصہ سابق مشرقی پاکستان میں ہجرت کے بعد لکھا گیا۔ یہ حصہ ادبی فعالیت اور ترقی پسندانہ تصورات کے ساتھ ساتھ سابق مشرقی پاکستان کی فضا، ماحول، حُسن اور رنگ کا امانت دار ہے[1]"

سید محمد ابو الخیر کشفی اختر پیامی کی شاعری کا ناقدانہ تجزیہ کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

"۔۔۔ اختر پیامی کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو "ڈرامائیت" بھی ہے "تاریخ" انکی تمثیلی نظم ہے۔ ہم اسے منظوم ڈرامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔۔۔[2]"

ان کے ڈرامائی پہلو کی مزید وضاحت کے لئے کشفی مزید لکھتے ہیں۔

"اختر پیامی کی کئی مختصر نظموں میں ڈرامائی کشمکش کے عناصر موجود ہیں "ایک حصار فریب" "نظر کھینچ کر" "سالگرہ" "انسان" "مدت" "جوئے نیا" وغیرہ، ان سب نظموں میں کشمکش اور نقاط نظر کی جنگ ہے۔ ڈرامہ دو یا زیادہ افراد کا مکالمہ نہیں ہے۔ ڈرامہ مختلف نقاط نظر، زندگی کے اسالیب اور فکری رویوں کے ٹکراؤ سے جنم لیتا ہے کئی نظموں میں یہ ڈرامائی عنصر "میں" اور "آپ" دو کرداروں کے ملنے اور ٹکرانے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ اسلوب اختر صاحب کو بہت پسند ہے اور ایک حد تک ان کی شناخت بھی[3]" پھیلی ہوئی ہے۔[4]

اختر پیامی کی شاعری ۱۹۴۰ء سے تقریباً ۱۹۶۰ء تک پھیلی ہوئی ہے۔ تیس[30] سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا وہ خاموش ہیں۔ وہ سابق مشرقی پاکستان کے شعر و ادب کی محفل میں جتنی تیزی سے اُبھرے اتنی ہی تیزی سے اس حلقے سے کنارہ کش ہو کر صحافت میں گم ہو گئے۔

بحیثیت مجموعی اختر پیامی کا شمار ترقی پسند شعرا میں ہے۔ آغاز ہی سے ان کا رجحان ترقی پسندی کی طرف مائل رہا۔ لیکن انہوں نے روایت سے انحراف نہیں کیا۔ ان کی شاعری میں روایت اور جدیدیت کا اچھا امتزاج ہے۔ ان کے کلام کسے بندھے

---

[1] سہ ماہی روشنائی ۲۰۰۷ء ص ۱۷۶
[2] ایضاً ص ۱۸۷

Dhaka University Institutional Repository

اصول شاعری یا ردیف وقوافی بحور واوزان کے پابند نہیں۔ غزل ونظم دونوں اصناف شاعری پر انہوں نے طبع آزمائی کی لیکن ان کا شاعرانہ جوہر نظم میں نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی مختلف نظموں کے لئے مختلف موافق اسالیب اختیار کئے جو انہیں کا حصہ ہے۔ انہوں نے شعر کہہ کر اپنے دل کو جذبات کے بوجھ سے ہلکا نہیں کیا بلکہ اس کی تہہ میں ظلم واستبداد، سماجی ناانصافی کا شکوہ نرم روی سے کیا۔ نظم ہو یا غزل ہر جگہ انہوں نے مقصدیت کو اول درجہ دیا ہے۔ ان کی شاعری انسانی ہمدردی کا نغمہ الاپتی ہے۔ اختر اپنی شاعری میں ایک پرسکون مستقبل کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شاعرانہ خیالات کو وقتاً فوقتاً تمثیلی پیرائیہ نگارش میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے جو قاری کے لئے پُرلطف بھی ہے اور پر اثر بھی۔ اس ضمن میں ان کا رنگ انفرادی ہے۔ ان کی نظم "تاریخ" تمثیل نگاری کی اچھی مثال ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ابلیس : یہ زمیں جلوہ گہہ زیست نہیں ہے آدم
کیا اسی دشت کو رنگین بناؤ گے تم
کیا یہیں فکر کی قندیل جلاؤ گے تم

آدم۔ میرے جنت کے رفیق!
اُف یہ دنیا ہے کہ دوزخ پہ کوئی طنز لطیف
میں یہاں سانس نہیں لے سکتا
.... ابلیس کے چہرے پہ مسکراہٹ ہے .....

ابلیس : میرے آدم مگر اس دہر کے آئینے میں
جور اور ظلم کی سطوت کے نشاں اور بھی ہیں

(تمثیلی نظم "تاریخ")

Dhaka University Institutional Repository

دنیا بدل رہی ہے نگاہیں اٹھائیے
اس ارتقائی دور سے آنکھیں ملائیے
آپس کے تفرقوں کو ابھی بھول جائیے
مل مل کے صبحِ نو کی سیاہی مٹائیے
ہر سانس اب جھنجھوڑ کے چونکا رہی ہے آج
(رہبروں کے نام!)

تنہائیوں کے کوہ گراں سے اتر کے ہم
آبادیوں میں شعر سنانے کو آئے ہیں
ارزاں کرے نہ کوئی متاعِ سخن کہ ہم
لفظوں کا اعتبار بڑھانے کو آئے ہیں

میں نے تاریخ کا ہر دور بدلتے دیکھا
میں نے تہذیب کو ہر موڑ پہ چلتے دیکھا
آپ نے مجھ کو کسی دور میں دیکھا ہوگا
زندگی ایک نئی راہ پہ چلتے چلتے
اپنی منزل پہ پہنچ جائے گی
اور بغاوت کا یہ امڈا ہوا سیلاب عظیم
آج ایٹم کے بھی طاقت سے نہیں رک سکتا

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر ہارون الرشید

- ۱۹۳۷ء

اصل نام ہارون الرشید۔ تخلص ہارون۔ پیدائش ۱۹۳۷ء میں کلکتہ کے ایک مفلوک الحال مذہبی گھرانے میں ہوئی۔ والد کا نام سید غلام حسین تھا۔ آزادئ ہند و پاک کے دوران ہندو مسلم فسادات سے متاثر ہو کر ۱۹۵۰ء میں ان کے والد معہ اہل و عیال مشرقی پاکستان آئے۔ اور ڈھاکے کو اپنا مسکن ثانی بنایا۔ ہارون الرشید کو بچپن ہی سے حصول تعلیم کا ذوق و شوق تھا۔ بہ قول موصوف وہ اپنے خاندان کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ڈھاکا بورڈ سے ۱۹۵۲ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں آئیڈیل پرائمری اسکول ڈھاکہ میں انہیں ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت نے ان کی مالی کفالت کو کچھ بحال کیا تو ۱۹۵۶ء میں جگن ناتھ کالج ڈھاکا میں رات کی شفٹ میں آئی۔ اے کی تعلیم کے لئے داخلہ لیا اور امتحان میں کامیاب ہوئے انہوں نے ۱۹۵۸ء میں اسی کالج سے بی۔ اے اور شعبۂ اردو وفارسی ڈھاکہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء میں ایم۔ اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بحیثیت اردو لیکچرر ان کا تقرر پہلے ہالی کراس کالج میں ہوا پھر جگن ناتھ کالج میں منتقل کر دیئے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں حکومت نے اس کالج کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس طرح ان کی ملازمت سرکاری ہو گئی۔ ۲۳ سال تک موصوف نے اسی کالج میں تدریسی فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۸۵ء میں کراچی ہجرت کر گئے اور نو وہاں مختلف ادبی سرگرمیوں سے منسلک ہیں۔[1]

۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۵ء تک تقریباً ۳۵ سال کی مدت بنگلا دیش میں گزاری۔ ہارون الرشید کی شعری و ادبی شعور کی نشو و نما اسی سرزمین بنگلہ دیش میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ہی سے انہوں نے شعر گوئی شروع کر دی تھی لیکن انہیں کبھی مشاعرے سے دلچسپی نہیں رہی۔ ان کی نظمیں پہلے بچوں کے رسالوں میں اور بعد میں معیاری رسالوں میں شائع ہوئیں۔

ڈھاکا یونیورسٹی میں تعلیم کا عرصہ (۱۹۵۸ء - ۱۹۶۰ء) ان کی شعر گوئی کے لئے شباب کا زمانہ زمانہ تھا۔ اس دور کا کلام "دلِ بیدار" کے نام سے مرتب کر چکے ہیں۔ جو غیر مطبوعہ ہے۔ ان کا طبعی رجحان کبھی بھی عشقیہ یا رومانی طرز پر مائل نہیں ہوا۔ وہ فطری طور پر ایک مذہبی انسان ہیں۔ اور ہر جگہ ان کی نگارشات میں مذہبیت غالب رہتی ہے۔ لیکن انہوں نے ملّا یا واعظ بننا پسند نہیں کیا۔ وہ صرف انسان کی اونچی قدروں کی وضاحت کرتے ہیں۔

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں ہارون الرشید نے اپنے بارے میں کل تفصیلات فراہم کیں (۱۸/ اپریل ۲۰۰۱ء)

Dhaka University Institutional Repository

"مصنف کا مضمون "اسلام پسند تنقید میں" انہوں نے اپنے لائحہ عمل کا "ماحصل" پیش کیا ہے۔ ہارون کی رائے میں اسلامی ادب جہاد بالقلم ہے۔

اپنے لہو کی آگ میں : (ناول) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

طوبیٰ : حمد، نعت، منقبت کا مجموعہ ہارون اکیڈمی۔ سنہ ۱۹۹۵ء کراچی صفحات ۱۱۲

سرگذشت آصف : (مرحوم آصف بنارسی کی سوانح اور کلام پر مشتمل تصنیف) صفحات ۸۵
ناشر مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ سنہ ۱۹۸۳ء

غیر مطبوعہ :

(۱) اردو کا دینی ادب :

(۲) محفل جو اجڑ گئی :

(۳) متاعِ درد : (سقوط ڈھاکا کے حوالے سے شعری مجموعہ)

(۴) دلِ بیدار : (شعری مجموعہ)

(۵) زمزمۂ توحید :

(۶) حرفِ یقین وغیر

ان کی مطبوعہ کتابیں سوائے شعری مجموعہ "طوبیٰ" کے سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران شائع ہوئیں غیر مطبوعہ شعری مجموعہ "دل بیدار" اور "متاع درد" بھی لکھی گئیں۔

نمونہ نظم : تجھ سے قربت کا ہمیشہ رہا احساس مجھے
تجھ کو دیکھا نہیں پر تجھ سے محبت کی ہے
ایسے لمحاتِ مقدس کو بھلا دوں کیسے
جب تری یاد نے اس دل کی رفاقت کی ہے

نمونہ نثر : ..... انسانی زندگی اور تہذیب و تمدن کو مذہب و اخلاق نے جو عظمت و وقار بخشا ہے

Dhaka University Institutional Repository

ہارون الرشید راقمہ کے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"میرا ذہن کبھی یہ بات قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکا کہ ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے سمجھتے ہوئے اپنے فکر و عمل یا تحریر و تقریر میں غیر اسلامی رویہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔"

دوسری بات یہ ہے کہ ایک انسان کو بحیثیت انسان کے غیر متعصب اور روادار ہونا چاہیئے۔ اسکے دل میں سارے انسانوں کے لئے ہمدردی اور محبت کے جذبات ہوں۔ ہر مصیبت زدہ اور پریشان حال انسان کے لئے اس کا دل تڑپ اُٹھے۔ یہاں تک کہ جانوروں کے لئے بھی کسی قسم کا ظلم و ستم وہ برداشت نہ کر سکے۔ میری زندگی، شاعری اور تنقید نگاری پر ان خیالات کا گہرا اثر ہے۔"

پروفیسر ہارون الرشید کا شمار اسلام پسند ادیبوں میں شامل ہے۔ ان کے کل شعری و نثری تخلیقات مذہب اسلام کے محور پر رواں دواں ہیں۔ وہ ادب میں حسن و پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں۔ ہارون ایسے ادب سے اجتناب کرتے ہیں جو بداخلاقی اور بدکرداری کا محرک ہو۔ زندگی کو زہد و تقویٰ کے پیمانے پر تولنا ان کا نصب العین ہے۔ نثر کے علاوہ شعر گوئی سے بھی شغف حاصل ہے۔ ان کا انداز بیان صاف، سلیس اور پر اثر ہے۔ ہارون الرشید کا اصل میدان تحقیق و تنقید ہے۔ ان کی تحقیق و تنقید بھی اسلامی اور اخلاقی تفکر سے وابستہ ہے۔ اس سلسلے میں وہ مولانا الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی سے متاثر ہیں۔ وہ فنکار کی خامیوں کو دوستانہ لہجے میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کے بیان میں انتہا پسندی نہیں۔ ہر مسئلے کو سمجھا کر مدلل بیان کرتے ہیں۔ ان کا بیان عام فہم ہے۔

ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :

"اردو ادب اور اسلام" : (اردو شاعری کا جائزہ اسلام کی روشنی میں) جلد اوّل۔ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور

" " " " : (اردو ادب کا جائزہ اسلام کی روشنی میں) جلد دوئم " " " "

صفحات ۳۵۴ - اشاعت اوّل فروری ۱۹۷۱ء

اس کتاب کو مصنف نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں نثر۔ ناول۔ مختصر افسانہ طنز و مزاح۔ تنقید۔ مصنف کے تمام مضامین اسلامی ادب کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کوشش کی ہے۔ انکے خیال میں ترقی پسند ادب گمراہی کا مترادف ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

"مصنف کا مضمون "اسلام پسند تنقید میں" انہوں نے اپنے لائحہ عمل کا "ماحصل" پیش کیا ہے۔ ہارون کی رائے میں اسلامی ادب جہاد با قلم ہے۔

اپنے لہو کی آگ میں : (ناول) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

طوبیٰ : حمد، نعت، منقبت کا مجموعہ ہارون اکیڈمی۔ سنہ ۱۹۹۵ء کراچی صفحات ۱۱۲

سرگذشت آصف : (مرحوم آصف بنارسی کی سوانح اور کلام پر مشتمل تصنیف) صفحات ۸۵

ناشر مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ سنہ ۱۹۸۳ء

غیر مطبوعہ :

(۱) اردو کا دینی ادب :

(۲) محفل جو اجڑ گئی :

(۳) متاعِ درد : (سقوط ڈھاکا کے حوالے سے شعری مجموعہ)

(۴) دلِ بیدار : (شعری مجموعہ)

(۵) زمزمۂ توحید :

(۶) حرفِ یقین وغیر

ان کی مطبوعہ کتابیں سوائے شعری مجموعہ "طوبیٰ" کے سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران شائع ہوئیں غیر مطبوعہ شعری مجموعے "دل بیدار" اور "متاع درد" بھی لکھی گئیں۔

نمونہ نظم : تجھ سے قربت کا ہمیشہ رہا احساس مجھے
تجھ کو دیکھا نہیں پر تجھ سے محبت کی ہے
ایسے لمحاتِ مقدس کو بھلا دوں کیسے
جب تری یاد نے اس دل کی رفاقت کی ہے

نمونہ نثر : ..... انسانی زندگی اور تہذیب و تمدن کو مذہب و اخلاق نے جو عظمت و وقار بخشا ہے

Dhaka University Institutional Repository

اس کے پیش نظر مذہب و اخلاق کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر شعر و ادب میں اخلاق و مذہب کے دائمی اور آفاقی قدروں کو جگہ دی جائے۔ تو ان کی عظمت و تقدس میں بھی یقیناً اضافہ ہو گا۔ لیکن اس میں فنکارانہ چابکدستی کی بھی ضرورت ہو گی۔ اس لئے کہ فنکار کا کام بھی بنیادی طور پر تخلیق حُسن ہے۔ ایک عظیم شاعر جب اخلاق و مذہب کے لازوال آفاقی قدروں کو اپنی شاعری میں سموتا ہے۔ تو اس کی شاعری الہامی شاعری کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ جس پر شاعری "جز است از پیغمبری" کا مقولہ صادق آتا ہے۔ ہمارے ادب میں اس کی بہترین مثال اقبال کی شاعری ہے۔ لیکن معمولی درجے کا شاعر اپنے ساتھ اخلاق و مذہب کو بھی لے ڈوبتا ہے۔[1]

غزمطبوعہ تازہ غزل سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ہو گئی شام زندگانی کی
لو گھڑی آئی شادمانی کی
آخر شب ہوا نزول کرم
درد نے دل کی میزبانی کی
زندگی یوں گزر گئی جیسے
اک جھلک ہو کسی کہانی کی
کس کا اب انتظار ہے ہارون
ہو گئی شام زندگانی کی

---

[1] ہارون الرشید۔ "کچھ شعر و ادب کے بارے میں" انتخاب (رسالہ) سیدپور نومبر ۱۹۸۶ء صـ۵۷

Dhaka University Institutional Repository

سید ولی عالم شاہین

(۱۹۳۸ء)

مکمل نام سید ولی عالم شاہین۔ تخلص شاہین۔ ۱۱ جنوری ۱۹۳۸ء کو موضع غازیپور ضلع مونگیر (بہار) میں پیدا ہوئے ۱۹۶۰ء میں بہار یونیورسٹی سے شماریات میں ایم۔ ایس سی کیا۔ اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد چھ ماہ تک حکومت ہند ادارۂ نیشنل سیمپل سے منسلک رہے۔ پھر مارواڑی کالج بھاگلپور میں تقریباً چار سال (۶۱-۱۹۶۳ء) شعبۂ شماریات میں لکچرر رہے۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۶۴ء کو ڈھاکے آئے۔ یہاں آنے کے بعد پاکستان ٹی بورڈ کے شعبۂ شماریات میں افسر اعلیٰ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ فروری ۱۹۶۶ء سے آدم جی جوٹ ملز لیمٹیڈ کے صدر دفتر میں ماہر شماریات کے فرائض انجام دیتے رہے[1]۔ ان دنوں امریکہ میں مقیم ہیں۔ اور شعر گوئی سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ سے ایک ادبی رسالہ (انگریزی میں) نکالتے ہیں جس کا مواد اردو ادب سے تعلق رکھتا ہے۔

شاہین غازیپوری ایک معیاری نظم نگار ہیں۔ ان کی شاعری پر فیض احمد فیض کا اثر ہے۔ نظم کے علاوہ انہوں نے غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی نگارشات سویرا (لاہور) افکار (کراچی) ماہ نو (کراچی) پاسبان ڈھاکا آجکل (دہلی) شاعر (بمبئی) سب رس (حیدرآباد) سیپ (کراچی) میں شائع ہوتی رہیں

"رگ ساز" ان کی ۵۵ نظموں ۳۴ غزلوں اور چند منظوم ترجموں کا انتخاب ہے۔ اس کا پیش لفظ نظر صدیقی نے لکھا۔ تعلیمی اعتبار سے شاہین کا رشتہ سائنس سے ہے۔ شعر و شاعری انہوں نے تسکین ذوق کے لئے کی۔ گرچہ وہ بڑے شاعر نہیں تو جھوٹے بھی نہیں کہے جا سکتے۔ ان کی شاعری قابل قبول ہے شاہین کی شاعری ماورائی نہیں۔ اس میں روزمرہ زندگی کا عکس ہے۔ شاہین نے اپنی ذاتی زندگی کے تجربات مشاہدات اور رومانی کیفیات سے نظموں کو مزین کیا ہے۔ بطور نمونہ ان کی نظم "سرشام" ملاحظہ فرمائیں۔

سسکتے کھیت یہ سوکھی ندی یہ ویرانے : یہ شام کتنی فسردہ ہے کوئی کیا جانے
افق کے پار سے مہتاب بھی نہ نکلے گا : اداس اداس سی راہوں پہ نور برسانے
تمام دن کے تھکے سے طیورِ آوارہ : قطار باندھ کے اڑتے چلے بسیروں تک
خبر نہیں دلِ بیتاب کتنی دوری ہے : غموں کی شام کے آغاز سے سویروں تک

---

[1] شاہین غازیپوری "رگ ساز" شعری مجموعہ۔ ستارۂ پاکستان پریس ڈھاکا۔ ۱۹۶۷ء ص سرورق

Dhaka University Institutional Repository

احمد زین الدین

(۲۲ جولائی ۱۹۳۹ء)

خاندانی نام زین الدین احمد صدیقی۔ قلمی نام احمد زین الدین۔ ولادت ۲۲ جولائی ۱۹۳۹ء (مطابق میٹرک سرٹیفکیٹ) ضلع غازیپور (یو پی) انڈیا میں ہوئی۔ اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ ۱۹۵۱ء سابق مشرقی پاکستان آئے اور ڈھاکے کو اپنا مسکن بنایا۔ انہوں نے ڈھاکے میں میٹرک، انٹرمیڈیٹ (ڈھاکا بورڈ) اور بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۱ء میں قیام بنگلہ دیش سے چند ماہ قبل کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کی سند لی۔[1]

اپنی مالی کفالت کو پوری کرنے کی خاطر طالب علمی کے دوران ہی سے ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔ شاہین اسکول ڈھاکا میں جز وقتی تدریسی فرائض انجام دینے لگے۔ اس کے علاوہ پاکستان آبزرور گروپ کے فلمی ہفت روزہ "چترالی" روزنامہ "پاسبان" میں کام کرنے کے علاوہ ریڈیو سابق مشرقی پاکستان کے فوجی پروگرام میں نیوز ریڈر اور مترجم کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ فکاہیہ کالم بھی لکھے اور انگریزی سے اردو میں خبریں بھی ترجمہ کرتے رہے۔ شعبۂ اردو و فارسی (ڈھاکا یونیورسٹی) کا مجلہ "جوئبار" کی مجلس ادارت میں رکن رہے۔ یہاں قیام کے دوران "انجمن ادب" ڈھاکا "بزم اردو" ڈھاکا سے وابستہ رہے۔ ان کی ادبی سرگرمیاں کراچی میں بھی ہنوز جاری ہیں۔

احمد زین الدین کا اصل میدان افسانہ نگاری ہے۔ افسانہ نگاری سے انہیں دلی لگاؤ ہے۔ انہوں نے افسانہ ذوق کی تسکین کے لئے لکھا۔ بقول احمد زین الدین، سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران انہوں نے زیادہ کہانیاں لکھیں جہاں کی سرزمین شعری ادب کے لئے ساز گار ہے۔[2]

احمد زین الدین کی ادبی زندگی کا آغاز کالج میں طالب علمی کے دوران ہوا۔ ان کی پہلی کہانی ۱۹۶۷ء میں "نصرت" لاہور میں شائع ہوئی۔ ان کی کہانیاں اس وقت کے موقر رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ وہ افسانہ نگاری میں احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، منٹو، مرزا ادیب، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس وغیرہ کے افسانوں سے متاثر ہیں۔ ہمعصر افسانہ نگاری میں نواب محی الدین، شہزاد اختر، ام عمارہ، علی حیدر ملک، ذاکر عزیزی کی کہانیوں نے ان کے ذہن کو جلا بخشی ہے۔

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں احمد زین الدین نے تمام معلومات فراہم کیں مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء

[2] "دریچے میں سجی حیران" ص ۱۷۸ - ۱۸۶

Dhaka University Institutional Repository

احمد زین الدین سابق مشرقی پاکستان کے بدلتے ہوئے رجحانات کو اپنانے کے قائل ہیں۔ وہ جدید افسانہ نگار ہیں۔ سماج پر ان کی نگاہ عمیق اور دل حساس ہے۔ انہوں نے جو دیکھا۔ سمجھا اور محسوس کیا اسے تجزیہ کرنے کے بعد مصور کی طرح صفحۂ قرطاس پر محفوظ کرتے گئے۔ زین الدین کا قوت مشاہدہ گہرا اور تجربہ اچھا ہے۔ انہیں کہانیاں لکھنے کا شعور ہے۔ زبان و بیان پر قادر ہیں۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ "دریچے میں بجی حیرانی" جنوری ۱۹۹۷ء اوکھائی پرنٹنگ پریس کراچی سے طبع ہو کر شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں احمد زین الدین کے کل سولہ افسانے شامل ہیں۔ ان میں کچھ افسانے بیانیہ اور کچھ تجریدی ہیں۔ ان افسانوں میں فنی لوازم بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں بنگلادیش کی دیہاتی زندگی کے رنگ نمایاں ہیں۔ "تیرگی کے دھاگے" ان کا ایک اہم افسانہ ہے۔ اس میں مصنف نے پٹ سن کے کاشتکاروں کی زندگی اور ان کے معاشی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ اس کہانی میں منافع خور بیٹسن کے بیوپار کی لالچ کے نتائج میں کاشتکاروں کی مالی کفالت کی نشاندہی کی ہے۔ "زرد موسم کی صلیب" مختصر تاثراتی افسانہ ہے۔ سائبیریا سے ترک سکونت کرنے والے پرندوں کے حوالے سے ہجرت، تحفظِ انسان اور امن عالم کو درپیش خطروں اور اندیشوں کے حالات بڑی خوبی سے اس کہانی میں ابھارا ہے۔

احمد زین الدین فطری افسانہ نگار ہیں۔ ان کا ادبی رجحان جدید ہے۔ ان کی نگاہ انسانی قدروں پر جمی رہتی ہے۔ زمان و مکان کے تناسب میں زمانہ کے بدلتے ہوئے رفتار کے مطابق غور و فکر کرتے ہوئے مستقبل کی طرف پیش قدمی کو بہتر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے سابق مشرقی پاکستان کی اقتصادی حالات کو اپنی دوربین نگاہوں سے دیکھا، سمجھا اور اسے افسانوی شکل میں اسی طرح پیش کیا کہ زندگی کے مختلف النوع پہلو اجاگر ہو گئے۔ افسانہ نگاری اور دیگر مصروفیتوں کے علاوہ احمد زین نے اپنے دوست غلام محمد کے افسانوں کا مجموعہ مرتب کر کے تین حصوں میں "ترشنا"، "زنگلیاں ریشم کی" اور "لہو قطرہ قطرہ" بالترتیب ناموں سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ کراچی سے سہ ماہی "روشنائی" (ادبی رسالہ) کا اجرا کیا جس کے متواتر کئی شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔

نمونۂ نثر:

"۔۔۔۔ یہ بیوپاری ہم سے کم دام پہ پاٹ خریدتے ہیں اور شہر لیجا کر دُگنے اور گنے داموں میں بیچتے ہیں اس طرح ہماری محنت کا پورا پھل بھی نہیں ملتا۔ یہ بیوپاری جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہمارا خون چوس رہے ہیں۔ ہم دن بھر کام کرتے ہیں، بارش میں بھیگتے ہیں۔ اور طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہیں، پھر بھی ہماری بہت ساری خواہشیں سسکتی ہی رہ جاتی ہیں۔ آخر ہم کب تک ان کا ظلم سہتے رہیں گے۔"

Dhaka University Institutional Repository

خورشید احمر

(۱۹۴۰ء)

خاندانی نام خورشید احمر۔ تخلص۔ احمر۔ ولادت ۱۹۴۰ء میں کان پور بھارت میں ہوئی۔ والد عبدالمغیر ریلوے میں ملازمت کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء سابق مشرقی پاکستان آگئے۔ اور پارتی پور میں رہائش اختیار کی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈھاکا کو اپنا مسکن بنایا۔ ۱۹۷۳ء میں قیام بنگلہ دیش کے بعد وہ کراچی ہجرت کر گئے۔ خورشید احمر بنگلہ دیش کے نامور مصور قمرالحسن کے بھانجے ہیں۔ خورشید احمر شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی اردو میں ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد فارسی میں اسی یونیورسٹی سے سند لی[1]۔ خورشید احمر کی تخلیقات اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی مقبول ہیں۔ وہ بیک وقت نثر نگار، شاعر اور صحافی و مترجم کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

خورشید احمر طالب علمی کے زمانے ہی سے اردو انجمن (شعبہ اردو و فاسی) ڈھاکا یونیورسٹی کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے سرگرم کارکن رہے۔ قائد اعظم کالج سید پور میں تحصیل علم کے "یونیٹی" انگریزی اخبار سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ پارتی پور سے سابق مشرقی پاکستان کے شمالی اضلاع سے متعلق کالم لکھا کرتے تھے۔ بعد ازاں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے روزنامہ "پاسبان" ڈھاکا، روزنامہ "سرفراز" روزنامہ "وطن" ڈھاکا سے وابستہ رہے۔ انہوں نے ہفت روزہ "الفتح" کراچی کے لئے بھی کالم لکھے۔[2]

خورشید احمر کو فن تراجم پر اچھی دستگاہ حاصل ہے۔ بہ قول وفا راشدی "انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے مزاج شناس ہیں۔ تراجم اور صحافت کے علاوہ خورشید کی شعری صلاحیت فطری ہے۔ ان کی شعری و ادبی نگارشات تقریباً نصف صدی کا احاطہ کرتی ہے۔ اس طویل عرصے میں انہوں نے دو تغیرات (تقسیم ہندوستان۔ قیام بنگلہ دیش) و حوادث کو قریب سے دیکھا، سمجھا اور اس پر تنقید کرتے ہوئے نثری و شعری جامہ پہناتے رہے۔ ان کی شاعری کو مذکورہ تجربات و مشاہدات کا ماحصل کہا جاسکتا ہے۔ خورشید کی شاعری رومانی، جذباتی، قومی سماجی، سیاسی عصری موضوعات پر محیط ہے۔ شعر گوئی میں میں فیض احمد فیض سے گہرے طور پر متاثر تھے۔ انہوں نے اپنا شعری مجموعہ فیض احمد فیض کے نام انتساب کیا ہے "شہر چراغاں" خورشید احمد کی حمد، نعت، منقبت، نظم، سانیٹ اور غزلیات پر مشتمل ۱۷۵ صفحات کا خوبصورت مجموعہ ہے۔

خورشید کی شاعری کا بنیادی موضوع "انسان اور معاشرہ" ہے ان کا طبعی رجحان ترقی پسند ہے خورشید نے روایتی

---

[1] خورشید احمر "شہر چراغاں (شعری مجموعہ) صولت پرنٹرز ناظم آباد کراچی۔ سنہ ۲ء ص ۱۳

[2] ایضاً ص ۱۸

Dhaka University Institutional Repository

شاعری سے رشتہ برقرار رکھ کر شاعری کو جدید اصناف کے تناسب سے اسلوب استعمال کئے۔ خورشید کے حمد و نعت میں پاکیزہ عقیدت کا اظہار قاری کے دل کو متاثر کرتا ہے۔ اس میں غلو نہیں حقیقت ہے۔ ان کی غزلوں میں تفکر کے ساتھ تغزل کی نغمگی ہے۔ خورشید احمر کی نظمیں شخصیات اور واقعات کی ترجمان ہیں۔ طرز بیان بہترین، پر لطف اور پر اثر ہے۔ "زندگی اب بھی خوبصورت ہے" "فاصلہ" لے ارض لاہور، عہد طفلی، ابراہیم لنکن ان کی اچھی نظمیں ہیں۔

نمونہ اشعار :

شمع کے گرد پتنگوں کا طواف
دیکھ کر اپنا نسب یاد آیا

چار تنکے جوڑ

چار تنکے جوڑ کر ہم نے بنایا تھا جو گھر
وہ ہوا نذر ہوا، اس روشنی کے شہر میں

غلبہ ہو نیند کا بھی اگر، جاگتے رہو
اے صاحبانِ فکر و نظر جاگتے رہو
خورشید اپنی ذات کی تکمیل کے لئے
روشن رکھو چراغ ہنر جاگتے رہو

لے ابراہم لنکن حقوق انساں

زیست کا گیسوے خمدار سنوارا تو نے
نیگرو قوم کی غیرت کو ابھارا تو نے
خفتہ جذبات محبت کو پکارا تو نے
نسل انساں کو دیا بڑھ کے سہارا تو نے

(ابراہم لنکن)

Dhaka University Institutional Repository

علی حیدر ملک

(۱۹۴۴ء)

نام علی حیدر ملک۔ ولادت ۱۷ اگست ۱۹۴۴ء موضع ملاٹھی ضلع گیا (بھارت) والد کا نام مظہر العلیم تھا۔ علی حیدر ملک نے اعلیٰ اعزاز کے ساتھ پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے سابق مشرقی پاکستان آ گئے اور کھلنا میں سکونت اختیار کی کھلنا سٹی کالج میں ان کا تقرر اردو لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ گورنمنٹ گرز کالج کھلنا میں جز وقتی مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ اردو درس و تدریس کے علاوہ کھلنا کی اردو ادبی سرگرمیوں سے بھی منسلک رہے۔ انہوں نے کھلنا میں "مجلس فکر نو" کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن نے اس زمانے میں بڑی مفید ادبی خدمات انجام دی۔ بنگلادیش کے ادبی حلقے میں ان کا تعارف اردو معلم، افسانہ نگار، مترجم اور ناقد کی حیثیت سے ہے۔ موصوف قیام بنگلہ دیش کے بعد کراچی ہجرت کر گئے۔ وفاقی گورنمنٹ کالج کراچی میں اردو کے استاد نگراں کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ان کی تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہیں۔

دبستان مشرق 'مجلس فکر نو' کھلنا۔ ستارہ پاکستان پریس ڈھاکہ۔ اشاعت اول ۱۹۷۰ء :
(سابق مشرقی پاکستان کے ادیبوں، شاعروں کی تخلیقات کا انتخاب)

دبستان مشرق، سابق مشرقی پاکستان کے مختلف النوع شعری و نثری تخلیقات کا مجموعہ ہے۔
۴۹۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بنگلہ دیش اردو ادب کے ذخیرے میں ایک اہم اضافہ ہے۔
علی حیدر ملک دبستان مشرق، کے پیش لفظ (سنگ بنیاد) میں رقمطراز ہیں۔

"دبستان مشرق" مشرقی پاکستان کے لکھنے والوں کے رجحان و میلان کا اندازہ ہو سکے گا ہم اس خیال کے پیش نظر یہ مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔"

بے زمیں بے آسماں : ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۸۶ء :
یہ علی حیدر ملک کے تیئس ۲۳ طبع زاد افسانوں کا مجموعہ ہے۔

افسانہ اور علامتی افسانہ ناشر، شعبہ تصنیف و تالیف و فاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی فروری ۱۹۹۳ء :
۱۶۸ صفحات کی یہ کتاب ان کی ۲۶ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کے کل مضامین

---

۱ علی حیدر ملک۔ "بے زمیں بے آسماں" (تعارف) ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۸۶ء

Dhaka University Institutional Repository

افسانے اور فکشن سے متعلق ہیں ۔ مصنف نے افسانہ، کہانی اور علامتی افسانوں کے متعلق ترقی پسند نقطہ نظر سے تنقید کی ہے ۔ اس میں علامتی افسانہ 'کب' کہاں اور کیسے؟ علامتی افسانہ، کمزوریاں اور جعلسازیاں" وغیرہ افسانوی ادب کے لئے مفید کہے جاسکتے ہیں۔

اردو ٹائپ اور ٹائپ کاری : (زیر ترتیب)

یہ اردو ٹائپ کاری سے متعلق مفید کتاب ہے ۔

علی حیدر ملک کے طبع زاد افسانے معیاری ہیں وہ ایک باشعور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں معاشرہ کے مختلف مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی ہے ۔ کردار نگاری میں بھی علی حیدر ملک کی فنکاری اچھی ہے ۔ لیکن ان کے افسانوں میں عصری حالات کی عکاسی اور مقامی رنگ کی غمازی نہیں ہے ۔ وعموماً کرشن چندر کی طرح حقیقت نگاری کی روایت میں افسانہ لکھتے ہیں۔ ان کا افسانہ "مقام" ایک مقبول افسانہ ہے جس کا پلاٹ معاشی بدحالی اور نفسیاتی الجھاؤ پر رکھا گیا ہے ۔" جھوٹے سچے خواب" "اندر کا جہنم" "بے زمیں بے آسماں" ان کے اچھے علامتی افسانے ہیں ۔

نمونہ افسانوی نثر :

" صبر کی بھی آخری حد ہوتی ہے ۔ اسے کیا خبر کہ میں یہاں کس طرح دن گزار رہی ہوں" چند ثانیے رکنے کے بعد وہ پھر بڑے تیز لہجے میں بولنے لگی ۔

مقام ! مقام !! مقام !!

میں کہتی ہوں اگر مقام ہی بنانا تھا تو پھر شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔ مجھے عذاب میں مبتلا کرنے کے لئے؟ میں بھی عورت ہوں کوئی مورت نہیں ۔ آخر میں کب تک اس کا انتظار کرتی رہوں گی ۔ مجھے ایسا جیسے میرے سینے پر کسی نے زوروں سے ایک گھونسہ مارا ہو ۔"[1]

علی حیدر ملک افسانہ نگار کے علاوہ ایک معیاری نقاد کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں ۔ تنقید میں بھی ان کا نقطہ نظر ترقی پسندانہ ہے ۔ علی حیدر ملک کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ اچھا ہے ۔ ان میں تحقیق کی اچھی صلاحیت ہے ۔ تنقید کرتے ہوئے وہ ہر بات کو تحقیق کی روشنی میں سمجھا کر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ناقدانہ بیان ایسا ہے جیسا ہونا چاہیئے ۔

---

[1] دبستانِ مشرق ۔ علی حیدر ملک "مقام" ص ۲۷۰

Dhaka University Institutional Repository

نمونہ تنقیدی نثر :

"مرزا ایک حد درجہ پیچیدہ شخصیت کے مالک تھے اس لئے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے کافی عرق ریزی اور نفسیات کے علم سے پوری آگاہی کی ضرورت ہے اور یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے غالب پر کام کیا ہے وہ نفسیات سے یا تو یکسر نابلد ہیں یا پھر بہت معمولی شدھ بدھ رکھنے والے لوگ ہیں۔ حالانکہ غالب وہ شاعر ہے جس کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلی اور بڑی ضرورت علم نفسیات سے بھرپور واقفیت ہے پھر یہ کہ ایک ایسے حیوان ظریف کی باتوں کو اس کی اردواجی زندگی کے سلسلے میں حرف بہ حرف درست کیسے قرار دیا جا سکتا ہے جو خدا اور بادشاہ وقت سے لے کر خود اپنی ذات کا مذاق اڑانے اور اس پر بھبتی کسنے سے کبھی چوکتا ہو!"

طبع زاد افسانوں کے علاوہ علی حیدر ملک دوسری زبان میں شائع شدہ افسانوں کے ترجمے بھی کرتے ہیں ان کی تراجم صلاحیت بھی اچھی ہے۔ مصنف نے امرلال ہنگوری کا سندھی افسانہ کا ترجمہ "گلہائے رنگا رنگ" کے نام سے کیا ہے۔

صحافت نگاری میں بھی علی حیدر ملک کی اچھی صلاحیت ہے۔ صحافت میں ان کی خدمات حسب ذیل ہیں :

سابق نائب مدیر۔	سہ ماہی "عزم نو" کراچی
سابق نائب مدیر۔	ہفت روزہ "قوم" کھلتا
سابق معاون مدیر۔	ماہنامہ "قومی زبان" کراچی
سابق کالم نگار انٹرویو اور تبصرہ نگار۔	روزنامہ "جسارت" کراچی
سابق مدیر اعزازی	ماہنامہ "علامت" کراچی
ادبی کالم نویس	ہفت روزہ "اخبار جہاں کراچی
کمپیئر و براڈ کاسٹر	ریڈیو پاکستان

لہ "دبستان مشرق" علی حیدر ملک ص ۱۰۵

Dhaka University Institutional Repository

حصیر نوری

(۱۹۴۶ء)

خاندانی نام محمد حصیر خاں، معروف حصیر نوری، تخلص حصیرؔ۔ اور نوری کینت ہے۔ ولادت ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو قصبہ غوثیہ کلاں شاہ آباد (ہندوستان) میں ہوئی۔ والد کا نام نور الہدیٰ خان تھا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد سابق مشرقی پاکستان آئے۔ حصیر کے والد ملازمت کے اس سلسلے میں ایشرڈی، پھر کیوٹ کھالی (یمن سنگھ) میں مقیم رہے۔ اس دوران حصیر نوری نے پہلے ایشرڈی پھر کیوٹ کھالی (یمن سنگھ) سے تعلیم حاصل کی۔ حصیر ۱۹۸۲ء میں پاکستان ہجرت کر گئے۔

صحیح معنوں میں حصیر کی پہچان بنگلہ دیش میں اردو کے ایک بے لوث خادم کی حیثیت سے ہے۔ حصیر زمانہ طالب علمی ہی سے شعر و شاعری کے پہلو بہ پہلو اردو ادبی سرگرمیوں سے منسلک رہے۔ وہ ۱۹۶۷ء میں "بزم ادب" کیوٹ کھالی (یمن سنگھ) کے ایک اہم رکن تھے۔ اس بزم کی بنیاد عبدالحمید خاں اور یاسؔ مراد آبادی نے رکھی تھی۔ حصیر بزم ادب کی سرپرستی میں منعقدہ تمام ادبی نشستوں اور مشاعروں کی روداد اس وقت کے اردو اخباروں میں شائع کرواتے تھے۔ حصیر ۲۵ مئی ۱۹۷۵ء کو حلقہ نکرو دانش ڈھاکا کی ایک ذیلی شاخ (محمد پور) کے سکریٹری رہے۔ ان کی صحافتی و تالیفی خدمات حسب ذیل ہیں :

تماشہ (قلمی پرچہ) ۱۹۷۵ء ڈھاکا

مدیر حصیر نوری، نگراں حافظ دہلوی۔ اس کے آٹھ شمارے شائع ہوئے اس کی اشاعت میں قاسم انیس اور شمیم احمد شمیم (مرحوم) کا تعاون بھی یادگار ہے۔

روشنی - لیتھو آرٹ پریس۔ ڈھاکا۔ ۱۴۰۰ھ

اس رسالے کے مرتب الحاج محمد افسر شمسی اور معاون حصیر نوری ہیں۔ رسالہ دینی، اخلاقی و اصلاحی مضامین کا مرقع ہے۔ کل صفحات ۸۰ ہیں۔

قصۂ پارینہ (مرتب) ۶۴ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ "قصۂ پارینہ" (مشاعروں کی روداد) مرتب کر کے حصیر نوری نے شائع کیا۔

"دیدۂ تر" (تدوین) نیو آفسیٹ اینڈ پیکیجز۔ ڈھاکا ۱۹۷۷ء

---

۱ "بحر و شرر" (شعری مجموعہ) حلقہ نکرو دانش ڈھاکا فروری ۱۹۷۷ء ص ۱۹۵

Dhaka University Institutional Repository

بنگلہ دیش میں اردو ادب کے بے لوث خادم اور شاعر شمیم احمد شمیم ۱۸ دسمبر ۱۹۷۶ء کو ایک حادثہ میں جاں بحق ہوئے تو یہاں کے شعراء ادباء نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق شعری و نثری پیرائے میں رنج و غم کا اظہار کیا۔ حصیر نوری نے ان تعزیتی نگارشات کو دیدۂ تر کے نام سے مرتب کیا۔ یہ کتاب ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں رئیس امروہوی، حافظ دہلوی، نوشاد نوری وغیرہ کے شعری و نثری تخلیقات شامل ہیں۔

بوئے شمیم : (تدوین) حلقہ فکر و دانش ڈھاکا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۸۰ء

شمیم احمد شمیم کی تیسری برسی کے موقع پر شعراء ادباء کے اظہار رنج و غم پر مشتمل نگارشات کو کو حصیر نوری نے "بوئے شمیم" کے نام سے مرتب کر کے چھپوایا۔ یہ کتابچہ ۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتابچہ حلقہ فکر و دانش کی کی سرپرستی میں شائع ہوا۔

بحیثیت مجموعی حصیر نوری کو اردو ادب سے گہری انسیت ہے۔ وہ بنگلہ دیش کے اچھے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں روایتی اسکول کی پابندی ہے۔ کسی کسی شعر میں حقائق زندگی کا اظہار بھی ملتا ہے۔

نمونہ کلام :

ان اہل فن سے اب تو الجھنا فضول ہے
دانستہ جرم کر کے جو کہتے ہیں بھول ہے
میرے خلوص کا مرے آگے حصول ہے
کانٹا سمجھ رہا تھا جسے میں میں پھول ہے
ستم کا آغاز کرنے والو ستم کی کیا انتہا نہیں ہے
ستمگرو یہ نہ سمجھو دل میں ہمارا کوئی خدا نہیں ہے
حصیر اردو ادب کے گیسو اگر پریشاں ہوئے تو غم کیا
سنوار دینگے ہمارے شانے یہ حوصلہ تو دبا نہیں ہے

Dhaka University Institutional Repository

شفیق احمد شفیق

(۱۹۴۹ء)

اصل نام شفیق احمد۔ تعلیمی نام شفیق احمد شفیق ۔ ۶ جولائی ۱۹۴۹ء کو کلکتے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالرشید تھا۔ بچپن ہی میں والد کے ہمراہ ڈھاکہ آ گئے۔ بی۔ اے۔ بی ایڈ، ایم۔ اے اردو تک تعلیمی سند حاصل کی۔ قیام بنگلہ دیش کے بعد کراچی ہجرت کر گئے۔ بنگلا، پاک و ہند کے ادبی حلقے میں ان کا تعارف شاعر، تنقید نگار اور صحافی کی حیثیت سے ہے۔ صحافت، درس و تدریس ان کا پیشہ ہے۔

ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

ادراک (تنقید) ایجوکیشنل پریس کراچی۔ اشاعت اول ۱۹۹۱ء۔
۱۳۵ صفحات پر مشتمل یہ ان کی تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

پس لفظ آئینہ (شعری مجموعہ) ڈان پرنٹنگ پریس ناظم آباد کراچی۔ اشاعت اول ۱۹۹۸ء

زیر ترتیب

سنگ اور اتگ (شعری مجموعہ)

ستون[1] چند اساتذہ کی شاعری کا تجزیہ۔

دشتِ بے اماں (شعری مجموعہ)

اردو ادب مشرقی پاکستان میں (تنقید و تحقیق)

تنقید کے سات رنگ سات افسانہ نگاروں کے فن کا تجزیہ

لٹریچرز انگریزی میں مختلف نکرو فن کا تجزیاتی مطالعہ

مائی ویوز آن ویوز انگریزی میں کتابوں پر تبصرے

شفیق احمد شفیق سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران شاعری، صحافت و مضمون نگاری سے منسلک رہے۔ ان کی بیشتر ادبی نگارشات کے موضوعات یہاں (بنگلہ دیش) کے ماحول سے اخذ کیے گئے ہیں۔ بنگلہ دیش کے اردو شعراء میں ان کا شمار اچھے شعراء میں ہوتا ہے وہ شعر گوئی میں کسی کے مقلد یا متاثر نہیں۔ ان کا فکری رجحان ترقی پسند نظریات کا حامل ہے۔

---

[1] پس لفظ آئینہ، تعارف

Dhaka University Institutional Repository

شفیق اپنا شعری مجموعہ "پس لفظ آئینہ" میں عرض حال لکھتے ہوئے اپنے بارے میں رقمطراز ہیں :

"میں نے زندگی کو جس طرح محسوس کیا، دیکھا، سمجھا اور برتا ہے، ان تمام احساسات اور عمل ردعمل کو "پس لفظ آئینہ" میں منعکس کرنے کی کوشش کی ہے۔"[1]

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ شفیق کی شاعری میں ان کی ذات اور اردگرد کے ماحول کی عکاسی ہے۔ شفیق نے نظم و غزل دونوں اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔

نمونۂ غزل :

درجہ سکوں نہ ہوسکی زلف سیہ کی شام بھی
راہ جنوں میں دوستو آیا ہے وہ مقام بھی
رات کسی کی بزم میں ذکر وفا کا تھا شفیق
جانے کہاں سے آگیا اہل جنوں کا نام بھی

شفیق شاعری میں ردیف و قافیہ کے التزام کو اہمیت نہیں دیتے ان کے یہاں مقصدیت کو برتری حاصل ہے جو زندگی سے قریب ہو۔

دھندلی دھندلی سے تا حدِ نظر
کوئی چہرہ جو وفاؤں کا اجالا بخشے
کوئی سورج جو اندھیروں کی ردا چاک کرے
کوئی پیکر جو محبت کی ضیا پھیلائے
کیسی تشکیک و دلآزاری کی رت چھائی ہے
کوئی چہرہ، کوئی سورج نہ ہے پیکر ہر سو

نقاد کی حیثیت سے شفیق کا درجہ معیاری ہے شفیق کی ادبی صلاحیت ان کے تنقیدی مضامین میں اجاگر ہے وہ تنقید کرتے ہوئے بات صاف صاف لکھتے ہیں : ان کے بیان میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ مگر ان کی تنقید وقتاً فوقتاً تاثراتی اور نظریاتی تنقید کے زمرے میں آجاتی ہے کیونکہ انہوں نے زیادہ تر ان فنکاروں یا فن پاروں پر اظہار خیال کیا ہے جن سے وہ کسی

---

[1] پس لفظ آئینہ ، عرض حال

Dhaka University Institutional Repository

نہ کسی انداز سے متاثر ہوئے ہیں۔ مثلاً ان کی کتاب "ادراک" میں انہوں نے نظر صدیقی، ایوب جوہر اور اظہر قادری پر جو رائے ظاہر کی ہے یہ تاثراتی کہی جا سکتی ہے لیکن دیگر مضامین میں انہوں نے ادبی تخلیق کے معنوی حُسن کو پیش نظر رکھ کر ان کا تجزیہ کرنے کی کما حقہ کوشش کی ہے۔ جو ایک اچھے اور غیر جانبدار نقاد کا اصول ہے۔ ان کے مضامین "غلام عباس" "وزیر آغا کی انشائیہ نگاری" وغیرہ اس ضمن کے ہیں۔ ان کا انداز بیان سیدھا، سادہ اور عام فہم ہے۔ شفیق میں تنقید کا مادہ اچھا ہے ان کی ناقدانہ صلاحیت قابل قبول ہے۔

شاعری اور تنقید کے علاوہ ان کا دیگر اہم میدان صحافت ہے۔ صحافت ان کا پیشہ ہے۔ سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران ڈھاکا سے شائع ہونے والا روزنامہ "پاسبان" "وطن" اور "ہماری آواز" میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ ہفت روزہ جریدہ (ڈھاکا) میں "بنگال کے اردو فنکار" کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ جو قیام بنگلادیش کے قبل تک مسلسل جاری رہا ہے۔ "اجڑے ہوئے میکدے کے رندان" کے زیر عنوان ان کے مضامین مسلسل دو سال تک جام نور کراچی میں شائع ہوتے رہے۔ ہفت وار رسالہ "نگہت" کراچی اور ادبی رسالہ "مجلس" لاہور کے لئے، ڈھاکا میں قیام کے دوران نامہ نگار کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں بھی خوش اسلوبی سے حصہ لیتے رہے۔ "ادارہ لوح و قلم" کے روح رواں تھے ان کی نگرانی میں اس ادارے کے ماتحت قیام بنگلادیش کے بعد فوراً ایک ادبی نشست ان کے مکان ستھرا پور ڈھاکا میں منعقد ہوئی تھی۔ جو اردو ادب سے ان کے والہانہ عشق کا سچا ثبوت ہے۔

بہ حیثیت مجموعی میرا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ شفیق احمد شفیق کا نام ان کی ادبی خدمات کی بنا پر بنگلہ دیش کے دبستان اردو میں قابل یادگار رہے۔

نمونہ نثر:

"۔۔۔ انشائیہ نگاری کے باب میں جہاں وزیر آغا کی بہت سی باتوں سے مجھے اتفاق ہے وہاں ان کی کچھ آراء کو تسلیم کرنے میں تامل بھی ہے۔ اپنے تازہ ترین انشائیوں کے مجموعے "سمندر اگر میرے اندر گرے" کے پیش لفظ میں انہوں نے بعض مقامات پر سخن فہمی کے بجائے طرفداری کا شیوہ اختیار کیا ہے۔

لہ اردو مجلس، ص ۵۱

Dhaka University Institutional Repository

محمد عبدالجلیل بسمل

نام محمد عبدالجلیل۔ تخلص بسمل۔ والد کا نام محمد تبارک حسین تھا۔ آبائی وطن صوبہ بہار دربھنگہ ہے[1]۔ دربھنگہ کے مدرسے سے تعلیم مکمل کی۔ تقسیم ہندوستان کے بعد سابق مشرقی پاکستان آگئے[2]۔ شاعری اور مقالہ نویسی مشغلہ تھا۔ ان کے ذوق تحقیق و جستجو نے اس مشغلے سے بڑا مفید خدمت لیا۔ انہوں نے "سلہٹ میں اردو" ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ایک تحقیقی کتاب لکھی اور اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہ گئے۔ قیام بنگلہ دیش کے بعد بسمل پاکستان چلے گئے[3]۔

عبدالجلیل بسمل کو ملازمت کے دوران سابق مشرقی پاکستان کے مختلف اضلاع میں رہنے کا موقع ملا۔ بسمل خود لکھتے ہیں کہ انہوں نے زندگی کے بیشتر ایام تقریباً نو سال سلہٹ میں گزارے اور اس وقفے میں انہیں سلہٹ کے اہل ذوق اور اہل زبان سے مل کر اردو زبان کی ترویج و ارتقاء کے لئے بڑی مفید خدمت انجام دینے کا موقع ملا[4]۔

زبان اردو سے انہیں فطری لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ اس دور کے تقاضے کے مطابق یعنی پاکستان کے دونوں حصوں (موجودہ پاکستان اور بنگلہ دیش) کے لوگوں میں باہمی اتفاق رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ بنگالی نژاد اردو تخلیق کاروں کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کیا جائے۔ بسمل زبان دوست اور وطن دوست انسان تھے۔ سرکاری ملازمت کے دوران بنگلادیش کے جس علاقے میں رہے انکی دوربین نظر زبان اردو اور اس کی ہر ممکن ترویج و ترقی پر مرکوز رہی۔ السٹڈی میں ناظم الدین اردو ریلوے ہائی اسکول کے بانی اور سکریٹری رہے۔ سلہٹ میں سرکاری ہائی اسکولوں میں اردو سیکشن کا افتتاح بسمل کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا۔ سلہٹ کے مقامی لوگوں کی اردو نوازی سے متاثر ہو کر ان کے تعاون سے اردو انجمن مکتب کا قیام اور انجمن ترقی اردو کے مختلف شعبوں کو آگے بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی[5]۔ ان کی کتاب "سلہٹ میں اردو" سلہٹ میں حضرت شاہ جلال رح (۱۱۹۸ء ۔ ۱۳۴۴ء) سے لیکر دور پاکستان تک کے تمدن و تہذیب اور علم و ادب کی ایک جامع تاریخ ہے۔ کتاب انجمن پریس کراچی سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ بسمل نے ۶۸ (اڑسٹھ) ادبی شخصیتوں اور ان کی اردو فارسی تصانیف کا تذکرہ بڑی تحقیق و جستجو کے بعد پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ مزید پانچ شخصیتوں کو شامل تذکرہ کیا ہے۔ جنہوں نے اردو یا فارسی میں کوئی تخلیقی کام تو انجام نہیں دیا لیکن اردو کی ترویج اشاعت کے لئے کوشاں رہے مثلاً الحاج مولانا انجم الحق چودھری

---

[1] عبدالجلیل بسمل "سلہٹ میں اردو" انجمن پریس کراچی۔ ۱۹۸۱ء ص ۸

[2] شعیب عظیم صاحب کا بیان، ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۹ء [3] بسمل۔ سلہٹ میں اردو ص ۱۷۔

Dhaka University Institutional Repository

حکیم مولانا بشیر الحق چودھری، الحاج محمد عبدالحق وغیرہ ۔

بنگلہ دیش میں اردو ادب کی تاریخ میں تحقیق و تنقید کرنے والوں کے لئے بسمل کی کتاب "سلہٹ میں اردو" کلیدی حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ تاریخی اور افادی دونوں حیثیت سے معتبر ہے ۔

بسمل کی دوسری تحقیقی کتاب "شیخ سید جلال مجرد کینائی کی مختصر سوانح ۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں ستارۂ پاکستان پریس ڈھاکا سے شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے تاریخی واقعات پیش کرتے ہوئے تحقیقی دلائل سے کام لیا ہے۔ جب بھی سلہٹ کی تاریخ لکھی جائے گی، بسمل کی دونوں کتابیں، "سلہٹ میں اردو" اور "تذکرۂ شیخ سید جلال مجرد کینائی" بڑی کارآمد ثابت ہوں گی۔

نثر میں ان کا اسلوب بیان صاف، شفاف اور مبالغہ آرائی سے پاک ہے۔ وہ تنقید سے کم اور تحقیق سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ نمونہ نثر یہ ہے ۔

"زبان و ادب کی تاریخ قوم کے تمدن و تہذیب کی عکاس ہوتی ہے ۔ سلہٹ کو اردو سے جو لگاؤ رہا ہے وہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یہاں کے عوام اردو سمجھتے تھے۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی انیسویں صدی کے نصف اوّل تک فارسی کا رواج رہا۔ اس کے بعد تعلیم، تحریر، تقریر، بحث، مکالمہ، خطبہ، فتویٰ، وعظ نصیحت، تصنیف و تالیف وغیرہ میں اردو استعمال ہونے لگی۔"

بسمل نے شاعری بھی کی ہے لیکن ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ انہوں نے نظم، قطعات، غزل وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے وہ شعر میں فن تاریخ گوئی سے بھی واقف تھے۔ ذیل میں جناب مجد الدین چودھری مرحوم (سابق صدر انجمن ترقی اردو سلہٹ) کی وفات پر بسمل کی لکھی ہوئی نظم سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

خاک داماں دیکھئے تار گریباں دیکھئے — چشم حیراں دیکھئے زلف پریشاں دیکھئے
شور بلبل دیکھئے حزن گلستاں دیکھئے — سوختہ گل دیکھئے برگ پریشاں دیکھئے
بوڑھے بچے مرد و زن اور نوجواں ماتم کناں — کس طرح روتے ہیں سلہٹ کے مسلماں دیکھئے
سال ترسٹھ مئی کی تھی تیئیس[۲۳] جب وہ چل بسے — عالم فانی سے سوئے باغ رضواں دیکھئے
عاشق تعلیم قرآں و حدیث احمدی — خوب بسمل نے کہی تاریخ شایاں دیکھئے

---

۱ بسمل۔ سلہٹ میں اردو ص ۶۰-۲۵۹

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر معزالدین

پروفیسر معزالدین کا تعارف اچھے معلم اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے ہے۔ وہ ۱۹۶۰ء جگناتھ کالج ڈھاکا میں شعبۂ اردو و فارسی کے صدر تھے۔ بعد میں ان کا تبادلہ شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی میں ہو گیا۔ انہوں نے لندن یونیورسٹی سے لسانیات میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ اور شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے ڈاکٹر عندلیب شادانی کی رہنمائی میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی سند لی۔ تحقیقی مقالے کا عنوان تھا۔ "قائم چاندپوری ــــ حیات اور کارنامے"[1] ان کا دوسرا مفید کارنامہ "رہنمائے سخن" ہے۔ جو قرآن منزل بابو بازار ڈھاکا سے شائع ہوئی۔ اس پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے پیش لفظ ۵ر جون ۱۹۶۶ء کو لکھا ہے۔ فن عروض و بدیع و بیان کے متعلق ایک مختصر مگر جامع تالیف ہے۔ یہ اردو شعر و ادب کے طالب علموں کے لئے کارآمد ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے سابق مشرقی پاکستان میں پہلی کتاب ہے۔ یہ اب تک شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی میں آنرز و ایم۔ اے کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر معزالدین نے متعدد مضامین بھی سپرد قلم کئے۔ جو اس وقت کے معیاری رسائل "ساقی" "ماہِ نو" "خاور" "ندیم" وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ موصوف نے ڈھاکا یونیورسٹی شعبہ جرنلزم میں بھی کچھ عرصے تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان چلے گئے اور وہاں کے مختلف علمی اداروں سے منسلک رہے کیمبرج یونیورسٹی (U.K) میں اردو کے اعزازی پروفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ ان دنوں اسلام آباد (پاکستان) میں سرسید کالج سے منسلک ہیں۔[2] اسلوب بیان ادیبانہ ہے۔ قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔

نمونۂ نثر ..... نذرل کو عام طور سے بنگلہ ادب کا باغی شاعر کہا جاتا ہے مگر میرے خیال میں وہ باغی سے زیادہ حقیقت پسند شاعر ہے۔ "چیر اسُندر" یعنی ابدی حُسن کی تلاش نے اسے انسانی سطح پر لا کھڑا کیا ہے جہاں اس نے زندگی کو آئینہ وار دیکھا ہے، جہاں اس نے زندگی کو قریب سے بے نقاب دیکھا ہے۔ جہاں خود غرضی اور ریاکاری کا جال بچھا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اس جہانِ جیل میں فریب و معاصی کے سوا رکھا ہی کیا ہے"۔ وہ اس عدم مساوات اور ظلم و قید کے طلسم کو توڑ کر انسان کو بحیثیت انسان دیکھنا چاہتا ہے اور یہی اس کی شاعری کی روح ہے۔"

---

[1] معزالدین کا یہ غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ ڈھاکا یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ [2] پچیسویں سالہ یادگار۔ ص ۸۹

Dhaka University Institutional Repository

سیّد رشید احمد رشید

نام سید رشید احمد۔ تخلص رشید۔ حکیم ناطق لکھنوی جن کا تفصیلی بیان پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے، سید رشید احمد کے والد تھے۔ رشید احمد ۱۹۵۱ء میں سابق مشرقی پاکستان آئے اور چاٹگام کو اپنا مسکن بنایا۔ موصوف کو بچپن ہی سے شاعرانہ ماحول ملا تھا۔ شعری و ادبی صلاحیت ورثے میں ملی تھی۔ ان کو اپنے والد حکیم ناطق لکھنوی کی تلامذی کا شرف بھی حاصل رہا۔ رشید احمد اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کا پیشہ وکالت تھا۔

بہ قول اقبال عظیم "رشید صاحب ایک خوش فکر شاعر، ایک باخبر نقاد اور ایک کامیاب مقرر تھے"[1] سلیم اللہ فہمی ان کی شاعرانہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سید رشید احمد معیاری غزل کہتے ہیں۔ انداز فکر ترقی پسند اور اسلوب بیان قدیمانہ ہے"[2]

رشید احمد کی علمی و ادبی نگارشات مختلف معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ انہوں نے نظیر صدیقی کے ساتھ اپنے والد کا دیوان (دیوان ناطق) مرتب کیا۔ اور حکیم ناطق کی شاعری پر تبصرہ بھی لکھا۔

نمونۂ غزل :

تری صراحی سے آج ساقی دو تیز شعلے اُبل رہے ہیں
کہ انجمن میں تمام ساغر چراغ کی طرح جل رہے ہیں
مزاج گردوں سمجھنے والو یہ رستخیز زمیں کو دیکھو
قدم کے نیچے ہر ایک ذرہ میں سو شرارے مچل رہے ہیں
رشید ہنگامے حرف کوشی یہ دیکھ کر مسکرا رہا ہوں
کہ اس کو جاسوس لکھ رہے ہیں کہ اس سے دشمن دہل رہے ہیں

بحیثیت مجموعی روایتی شاعری میں ان کی صلاحیت پختہ تھی۔ انگریزی تعلیم نے ان کی جدت فکر جلا بخشی اسی بنا پر وہ جدید شاعری کے رجحانات سے بیزار نہیں تھے۔ رشید احمد لکھنو کے شاعرانہ ماحول میں پروان چڑھے لہٰذا ان کی نگاہ زبان پر رہتی تھی۔ وہ صرف صحت مند جدت کو قابل قبول سمجھتے تھے۔ چاٹگام کے اردو ان حلقے پر ان کا بڑا تاثر رہا۔ وہ وہاں کی ادبی سرگرمیوں سے بھی وابستہ رہے۔

---

[1] "مشرقی بنگال میں اردو" اقبال عظیم ص ۳۵۹ [2] ششماہی "قلم کار" ۱۹۶۱ء ڈھاکا ص ۱۸

Dhaka University Institutional Repository

مسعود شہریار

اردو ادبی حلقے میں مسعود شہریار صحافی، افسانہ نگار اور مقالہ نویس کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں، پیشہ وکالت ہے[1]۔

مسعود شہریار قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے سابق مشرقی پاکستان آئے اور ڈھاکا کو اپنا مسکن بنایا۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو تک تعلیم حاصل کی۔ حصول تعلیم کے پہلو بہ پہلو ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء تک سابق انجمن اردو مشرقی پاکستان کے اہم رکن کی حیثیت سے منسلک رہے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایل۔ ایل۔ بی اور پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مقالے کا عنوان تھا "مشرقی پاکستان میں اردو ادب کا وسیع تر جائزہ" یہ مقالہ ۱۹۶۹ء میں جنگ کے دوران لکھا گیا اور ۱۹۷۹ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آیا۔ سابق مشرقی پاکستان کی اردو دبستان سے متعلق مسعود کی یہ کتاب اپنے نوع کی پہلی اور اور جامع کوشش ہے اس میں انہوں نے سابق مشرقی پاکستان میں اردو زبان و ادب کے آغاز کی نشاندہی کرنے کے علاوہ یہاں کے تئیں ادبی رجحانات کو بھی اجاگر کرنے کوشش کی ہے۔ مسعود کی تحقیق و تنقید اردو زبان و ادب کا بنگلا ادب سے رشتہ جوڑتی ہے۔ وہ سابق مشرقی پاکستان میں اردو کے پرسکون مستقبل کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ مسعود کی تنقید جدید اور سائنٹیفک کہی جا سکتی ہے مسعود کی تنقید میں ان کے استاد ڈاکٹر حنیف فوق کی صحت مند تنقید کا تاثر ہے۔ میرا یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اس کتاب کی بدولت مسعود کو دبستان بنگلہ دیش میں حیات ابدی مل گئی۔ دیباچے میں انتظار حسین نے کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے صحیح رائے پیش کی ہے:

> "اصل میں اس کتاب کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ہم نے اردو ادب کے ایک اسکول کو تو فراموش ہی کر رکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے ادبی مطالعہ کے نامکمل ہونے کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ مسعود شہریار صاحب اردو ادب کے ایک ایسے اسکول کو ہمارے سامنے لائے ہیں جو اپنے ماضی و حال کے ساتھ اب تک ہماری نظروں سے بالعموم اوجھل رہا۔"[2]

مسعود شہریار کے افسانے اور تنقیدی مضامین وقتاً فوقتاً مؤقر رسالوں میں شائع ہوتے آ رہے ہیں۔

نمونۂ نثر ۔۔۔۔ فورٹ ولیم کالج نے بنگال میں اردو شاعری کی کوئی خدمت نہیں کی۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہو سکی۔ علاوہ ازیں اس ادارے کا بنگال کے اردو نثری ادب پر بھی کوئی خاص اثر نہیں آتا۔ سچ تو یہ ہے کہ بنگال کے اور علاقوں میں اردو نثر پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی[2]

---

[1] مسعود شہریار "مشرقی پاکستان میں اردو ادب کا وسیع تر جائزہ" (پس اظہار) [2] مسعود شہریار، ص ۴۰

Dhaka University Institutional Repository

صلاح الدین محمد

نام صلاح الدین محمد۔ والد محمد عبدالشکور اور ماں سلمٰی خاتون تھیں۔ صلاح الدین محمد کی پیدائش ضلع پٹنہ صوبہ بہار میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ سابق مشرقی پاکستان آئے اور اسے اپنا وطن ثانی بنایا۔ ۱۹۵۶ء میں شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۲ء کے نامساعد حالات سے مجبور ہو کر ڈھاکا کو خیرباد کہا۔ اور لاہور ہجرت کر گئے۔

صلاح الدین محمد کا گھرانہ اردو ادبی خدمات کی وجہ سے قابل ستائش ہے۔ صلاح الدین کی چھوٹی بہن ام عمارہ اور اہلیہ بانو اختر شہود سابق مشرقی پاکستان کی نامور افسانہ نگار تھیں۔ ایک ہی خاندان کی یہ تینوں ادبی شخصیتیں ترقی پسند ادبی تحریک کے حامیوں میں ہیں۔

صلاح الدین محمد کو طالب علمی کے زمانہ ہی سے شعر و شاعری کا شغف حاصل تھا۔ ان کی نظمیں ماہنامہ "دلربا" (ڈھاکا) ششماہی قلم کار" (ڈھاکا) روزنامہ "پاسبان" (ڈھاکا) "ماہ نو" (کراچی وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ صلاح الدین محمد سخن گوئی اور صحافت کے ساتھ ساتھ سابق مشرقی پاکستان کی ادبی سرگرمیوں سے بھی وابستہ رہے۔ انجمن ادب ڈھاکا (ترقی پسند انجمن) اور مشرقی پاکستان رائٹرز گلڈ کے سرگرم رکن رہنے کے علاوہ یونین آف ایسٹ پاکستان جرنلسٹ کے صدر رہنے کا شرف بھی حاصل رہا۔ روزنامہ مورننگ نیوز (انگریزی اخبار) کے سینئر سب ایڈیٹر انچارج تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۹۵۲ء میں تحریک بنگلا (زبان) (مشرقی پاکستان) سے گہرے طور پر وابستہ تھے۔ وہ اردو کے ساتھ بنگلا کو بھی سرکاری زبان بنانے کے حامیوں میں تھے۔

صلاح الدین کی شاعرانہ صلاحیت اچھی ہے۔ ان کی نظر عمیق اور دل حساس ہے۔ نظموں میں فکری رجحان اجاگر ہے جس میں ہماری روزمرہ زندگی کے مختلف موضوعات مثلاً سماجی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کی غمازی کے علاوہ بنگلہ دیش کے قدرتی مناظر کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ شاعری میں وہ فیض اور میراجی سے متاثر ہیں۔ صلاح الدین کی شاعری کو علامتی شاعری

۱۔ پچھتر سالہ یادگار میگزین شعبہ اردو و فارسی، ڈھاکا یونیورسٹی۔ ص ۱۰۴

۲۔ بہ زبانی شعیب عظیم (ڈھاکا میں مقیم اردو محقق) بتاریخ ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء

Dhaka University Institutional Repository

کہی جا سکتی ہے۔ ان کا طبعی رجحان نظم گوئی کی طرف مائل ہے۔ انہوں نے رمز و کنایہ کے پردوں میں باتیں کہی ہیں۔ ان کے اشعار میں ردیف و قافیہ کا التزام کم رہتا ہے۔ جا بجا ابہام کی خامیاں ہیں لیکن مرکزی خیال اور بیان کی دلنشینی نے ان خامیوں کو پس پردہ ڈال دیا ہے۔ سنہرا ادیس، لب اظہار، عوام وغیرہ ان کی اچھی نظمیں ہیں۔

صلاح الدین محمد کی سابق مشرقی پاکستان کی زمین سے یہ وابستگی دراصل انسانوں سے گہرے لگاؤ کا پرتو اور ان کی انسان دوستی کا ثبوت ہے

سنہرا ادیس سے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

مچلتی سیال سمیں لہریں ندی کی آغوش میں رواں ہیں
فضاؤں میں جلترنگ کے نقرئی چھنا کے بکھر رہے ہیں
سدا سہاگن زمیں آغوش میں جواں سال سبز بیلیں
سنہرے خوشوں کی دھان کھیتی
سنہرے ریشوں کے سبز پودے
شہابی اندلس کے نخلے کو نپل
پھوار کی بھیگی لوریوں پر
ہوا کے نرم و لطیف جھونکوں میں تھرتھراتے۔
سُریلے نغمے سُنا رہے ہیں

Dhaka University Institutional Repository

ادیب سہیل

بنگلادیش کے اردو ادب کی تاریخ میں ادیب سہیل ترقی پسند ادبی تحریک کے حامیوں میں نظر آتے ہیں۔ ان کا تعارف شاعر، مضمون نویس اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں۔

ادیب سہیل تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان آئے اور اسے اپنا مسکن بنایا۔ پیشہ کے لحاظ سے موصوف سابق مشرقی پاکستان ریلوے میں اکاؤنٹ آفیسر تھے۔ اور اس سلسلے میں ان کی رہائش سید پور میں رہی۔ ۱۹۶۷ء کے اواخر میں جب صلاح الدین محمد نے ادارۂ فیچر سنڈیکیٹ کی بنیاد رکھی تو انہوں نے ریلوے سے طویل چھٹی لے کر اس سنڈیکیٹ میں اردو فیچر رائٹر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی[1] اس کام میں تقریباً دو سال سے زیادہ عرصہ تک منہمک رہے۔ سابق مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران ادیب سہیل نے مشرقی بنگال سے متعلق بھرپور شاعری کی۔ انقلاب بنگلادیش کے بعد ناموافق حالات سے مجبور ہو کر ۱۹۷۴ء میں کراچی ہجرت کر گئے۔ وہاں جاتے ہی انہیں ریلوے راولپنڈی بھیج دیا[2]

ان دنوں ریلوے سے ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن ان کی ادبی سرگرمیاں جاری ہیں۔ ماہنامہ قومی زبان" کے ایڈیٹر ہیں فکری وفنی ہیئت سے ان کی شاعری سرور بارہ بنکوی، اختر پیامی، صلاح الدین محمد، عطاء الرحمٰن اور نوشاد نوری وغیرہ کی شاعری سے مماثلت رکھتی ہے جنہوں نے بالواسطہ یا براہ راست میراجی، ن۔م۔ راشد اور فیض احمد فیض کے کلام کا اثر لیا۔ نظم ہو یا نثر ان کا نصب العین انسانی ہمدردی ہے۔ ان کی شاعری انسانی زندگی کے حقائق کی ترجمان ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بنگلادیش کی تہذیب و تمدن اور یہاں کے دلفریب مناظر کی عکاسی بھی کی ہے۔ ادیب سہیل کو شاعری کے علاوہ فن راگنی سے بھی والہانہ عشق ہے۔ فن موسیقی سے متعلق ان کا مطالعہ گہرا ہے۔ ان کی شاعری میں فن راگنی اور شاعری کا امتزاج ہے اور اس خصوصیت میں

---

[1] سہ ماہی "روشنائی" کراچی۔ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۰ء ص ۲۱۴

* پاکستان فیچر سنڈیکیٹ کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ مشرقی پاکستان (بنگلادیش) سے متعلق مختلف موضوعات پر، مغربی پاکستان کے انگریزی، اردو اخبارات کے لئے فیچر لکھے۔ شروع میں اردو شعبے میں ادیب سہیل اکیلے تھے۔ پھر کام کی زیادتی کی وجہ سے نوشاد نوری اور شہزاد اختر اردو شعبے سے وابستہ ہو گئے۔

[2] سہ ماہی "روشنائی" جولائی تا ستمبر ۲۰۰۰ء ص ۲۱۵

Dhaka University Institutional Repository

وہ انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔

مسعود شہریار ان کی نظم گوئی کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ادیب سہیل نے مختلف راگنیوں پر مختلف نظمیں لکھیں جن میں وہ ہندی الفاظ کا استعمال بخوبی کرتے ہیں۔ ان سلسلے میں ان کی نظم "تان سین" کا نام خصوصی طور پر لیا جا سکتا ہے۔ اس میں ادیب سہیل نے تان سین کی پیدائش، بچپن، جوانی اور پھر اس کی تعلیم اور فن کو بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا ہے!"

ادیب سہیل نے نظم اور غزل کے علاوہ دوہے بھی لکھے لیکن ان کا اصل میدان نظم نویسی ہے جس میں انکے جوہر کھلتے نظر آتے ہیں۔ ادیب سہیل کا طرز کلام سادہ اور رواں ہے۔ ان کی اکثر نظمیں معرّیٰ ہیں۔ البتہ ہندی کے نامناسب الفاظ کے استعمال سے کہیں کہیں فنی پختگی میں خامی نظر آتی ہے۔ لیکن بیان کی دلنشینی نے اسے پس پردہ ڈال دیا ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے انوکھی خصوصیت شاعری اور موسیقی کا امتزاج ہے۔ اور اسی مخصوص طرز نے ان کی شاعری کو ایک انفرادی حیثیت بخشی ہے موسیقی سے متعلق انہوں نے مضامین بھی لکھے۔ ان کے مضامین مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے آرہے ہیں جن میں ماہنامہ "دلربا" ڈھاکا[2]، ششماہی "قلم کار" ڈھاکا۔ سہ ماہی "فنون" لاہور۔ سہ ماہی "روشنائی" کراچی، ماہنامہ "افکار" کراچی۔ "قومی زبان" کراچی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں

نمونۂ کلام :

نوکا، چاند، ندی کی لہریں اور بھٹیالی راگ
اگنی بان چلاتی ہے یہ شیتل شیتل آگ
پدما تیرے کنارے دیکھا میگھ کا اصلی روپ
تیری ہی آغوش میں جانا کیا ہے ملّار کی آگ
یہ بنگال سنہرا بندھو گیت اور پیار کا دیس
ندی نالے چاہت چھلکیں نے سے بھوٹے راگ

---

[1] مسعود شہریار ص ۲۰۸

[2] ماہنامہ "دلربا" ڈھاکا۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۳ء تک شائع ہوتا رہا۔ ۱۰ بنگال کی ایک راگنی کا نام

Dhaka University Institutional Repository

جیون تٹ پر ہریا کی آئی یوں بھی سہیل
جب ملہار بھی من کو اپنے لاگا دیپک راگ

ادیب کی شاعری قاری کو دعوت فکر دیتی ہے۔ انسانی زندگی پر ان کی نگاہ گہری ہے۔ وہ آدمی کو صفات آدمی دیکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ یہ دنیا مثلِ جنت کے آرام گاہ ہو۔ جیسا کہ ادیب ان اشعار میں کہتے ہیں۔

آدمی اپنا مرتبہ بھول بیٹھا ــ کراں در کراں ہے
آدمیّت کی تعمیر منشا ہے اس کی
کائنات اس لئے اس کو بخشی گئی ہے
تاکہ ہر لمحہ صرف اس کا ہو، اس کو تمثالِ بنانے کی خاطر۔

ان کا شعری مجموعہ "بکھراؤ کا آخری حرف" ۱۹۹۶ء میں سعد پبلی کیشنز ناظم آباد کراچی سے شائع ہوا ــ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں اڑتیس ۳۸ نظمیں اور سترہ ۱۷ غزلیں ہیں۔ نظموں میں "بکھراؤ کا آخری حرف" خاک سے کٹا ہوا شخص" "ہم جہاں ہیں وہاں سے ہم بھی" "سمندر اور قطرے" وغیرہ تاریخ کے حوالے سے لکھی ہیں۔ ان میں دو ہجرتوں کا کرب اور انقلاب بنگلا دیش کے نتائج میں قتل و غارت گری کی غمسازی ہے۔ "سمندر اور قطرے" ادیب سہیل کی مشہور نظم ہے جس کا زمانہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک ہے۔ اس نظم میں ادیب سہیل نے تہذیبی، لسانی اور ثقافتی و سیاسی وجوہ پر روشنی ڈالی ہے جس کی بنا پر قطرے سمندر کا حصہ نہ بن سکے۔ رمز و کنایہ کے پردے میں ساری باتیں کی ہیں۔ میرے خیال میں اس نظم کو مہاجرین کا مرثیہ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔

ان کی غزلیں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی ترجمان ہیں۔

مثال : آئے تھے کس حوصلے سے پیڑ کے سائے میں ہم
کیا کہیں کس کس طرح قاتل وہی سائے ہوئے

تجربہ کہتا ہے میرا یہ عزیزو تم سے :: رہنا جس مٹی پہ اس مٹی کا ذرہ ہو نا

ادیب سہیل نے وقتاً فوقتاً شوقیہ افسانے بھی لکھے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بھی اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے جو دیکھا اور محسوس کیا اسے افسانہ کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ "بھولی بھالی صورت والے ان کا دلچسپ افسانہ ہے

Dhaka University Institutional Repository

جو "دلربا" جنوری۔ فروری ۱۹۶۴ء) میں شائع ہوا۔

نثر میں ادیب سہیل کا طرز تحریر صاف ستھرا اور رواں ہے۔ ان کے مضامین کا موضوع زیادہ تر فن موسیقی ہے۔ مثلاً "عظیم موسیقار استاد بڑے غلام علی خاں" "رقص ۔ اور مشرقی پاکستان کے رقاص" "موسیقی کا دہلی گھرانہ" "پاکستان اور ہندوستان میں" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نمونۂ نثر:

"چند سال سے ڈھاکا میں "جاگو آرٹ سرکل" قائم ہوا ہے اس کے روح رواں گوہر جمیل ہیں۔ یہ بھی بلبل چودھری کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نوجوان آدمی ہیں شوق اور لگن سے کام کر رہے ہیں۔ جہاں شوق اور لگن ہو وہاں کامیاب مستقبل کی توقع بھی کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے بھی کئی اچھے موضوعات کو رقص کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ جس میں "انارکلی" اور طبل جہاد نسبتاً کامیاب ہیں۔"

Dhaka University Institutional Repository

انور فرہاد

انور فرہاد سابق مشرقی پاکستان میں ۱۹۶۰ء کی دہائی میں نمایاں ہونے والے ان نوجوان ترقی پسند شعراء میں تھے جنہوں نے فیض احمد فیض کی پیروی کی۔ اس گروہ میں اصغر راہی، عمران فرحت، ہدایت نور، احمد الیاس، خورشید احمر کے نام خاص طور پر لئے جاسکتے ہیں۔ مسعود شہریار انور فرہاد کا تعارف پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"انور فرہاد نئی پود میں سب سے کم سن شاعر ہیں۔ یہی کوئی پچیس ۲۵ چھبیس ۲۶ کا سن ہوگا۔ اور حیرت انگیز صلاحیت نظر آتی ہے۔ یہ نظم و غزل دونوں ہی میں ہیت و موضوع کے نئے نئے تجربے ملتے ہیں۔ فرہاد خالص مشرقی پاکستانی شاعر ہے۔ یہیں اس کی شاعری نے جنم لیا۔ پلی، بڑھی، جوان ہوئی لہذا بنگالے کی مٹی کی خوشبو اور رچاؤ اس نوجوان کی شاعری میں رچی بسی ہے۔"[1]

فرہاد کی شاعری میں آپ بیتی اور جگ بیتی کا حسین امتزاج ہے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ انہوں نے جمہوری زندگی کی پامالی کا شکوہ کیا ہے لیکن مایوس نہیں ہوئے۔ فرہاد کی شاعری کا حوالہ بنگال کی آب و ہوا اور مٹی ہے۔ ان کی شاعری میں بنگال میں واقع ہونے والے حادثات و واقعات کی غمازی بھی ملتی ہے اور حسن بنگالہ کی عکاسی بھی۔ میرا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فرہاد کی زبان اردو اور جذبات بنگالی ہیں۔ زبان اور محاورے پر ان کو عبور حاصل ہے۔ جا بجا مناسب جگہ پر ہندی الفاظ کے استعمال نے اشعار کو دلکش بنا دیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لہراتے بل کھاتے آنچل، کالے ناگ سے گیسو
شرمیلی آنکھوں سے جھانکے اس بنگال کا جادو
سب الھڑ دوشیزاؤں کے دہکے دہکے گال
اے ساتھی دہکے دہکے گال
ہرا بھرا بنگال اے ساتھی ہرا بھرا بنگال

چاند کا درد، ماجھی، مجھ کو آواز دے، چاند گہن، رسوائیوں کا کفن ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ قیام

---

[1] مسعود شہریار۔ ص۔ ۲۴۷

Dhaka University Institutional Repository

بنگلا دیش کے بعد انور فرہاد پاکستان ہجرت کر گئے۔ وہاں بھی وہ اردو ادب نوازی سے منسلک ہیں۔ فرہاد کی نظم "ماجھی" سماجی ناانصافی اور انسان کی سخت کوشی کی آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں ان کی طرز نگارش بنگلا دیش کے قومی شاعر قاضی نذرالاسلام کی طرز سے مماثلت رکھتی ہے۔

ماجھی

گو موجوں کا ہے ریلا
اور کشتی ایک اکیلی
پر ماجھی ہے البیلا
ہر دکھ کو ہنس کر سہنا
ماجھی کی شان یہی ہے
موجوں سے لڑتے رہنا
ماجھی کو خوب یقیں ہے
موجیں منہ زور ہیں لیکن
کشتی کمزور نہیں ہے
ہاں یہ منجدھار ہے ماجھی
طوفاں سے لڑتے رہنا
چپّو تلوار ہے ماجھی [1]

---

* بنگلا میں ملّاح کو "ماجھی" کہتے ہیں

[1] "آب و گل"، ڈھاکا دسمبر ۱۹۶۰ء (مدیر سرور بارہ بنکوی) ص ۱۹

Dhaka University Institutional Repository

گلنار آفریں

اصل نام گلنار آفریں۔ تخلص گلنار۔ ان کی پیدائش خاندانِ ریاستِ ٹونک (محمود آباد) میں ہوئی! نواب متین اللہ خاں المعروف لسان الملک واثق ٹونکی کی صاحبزادی ہیں۔ گلنار کے بڑے بھائی ادیب واثقی (مرحوم) پاکستان کے مشہور شاعر تھے۔[۲] گلنار کی علمی و ادبی تربیت اپنے والد کے زیرِ سایہ گھر کے ادبی ماحول میں ہوئی۔ ان کے شوہر ناصر حسین زیدی کا تعلق خانوادہ محمد حسین سے ہے۔ وہ تقسیم ہندوستان کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ مشرقی پاکستان آئیں۔ اور انقلاب بنگلہ دیش سے قبل پاکستان چلی گئیں۔[۱]

گلنار آفریں کا امتیاز شاعرہ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ یہاں کی ادبی محفل میں وہ شاعرہ کی حیثیت سے مقبول تھیں۔ ڈھاکا میں قیام کے دوران ان کی نگارشات کا آغاز ۱۹۶۶ء سے ہوا۔ شاعری میں انہوں نے حمد، نعت، غزل، نظم وغیرہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کا اصل میدان نظم گوئی ہے۔ ان کی نظمیں رومانی، قومی و ملی ہونے کے علاوہ ذاتی رشتہ داروں سے منسلک ہوتی ہیں۔ انہوں نے نظموں میں روایتی مضامین کو جدید طرز کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی ہے۔ نظموں میں "زیرِ تنہائی" "اعتراف" اور "بکھرا نغمہ الجھا گیت" وغیرہ رومانی ہیں۔ اور "کراچی تہہ خاک" "امن کی بات کرو" "میری آواز سنو" وغیرہ میں ان کا جذبۂ قومیت اجاگر ہے۔ "مریم" "ماں" اور "مامتا" وغیرہ میں ان کا موضوع قرابت داری ہے۔ گلنار آفریں کا شاعرانہ رجحان جدید ہے۔ ان کی شاعری زندگی کی ترجمان ہے۔ انہوں نے ہجر و وصال کی روایتی اسلوب کے علاوہ قرابت کے رشتوں کی عظمت نیز قومیت کے مقدس جذبے کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے عظیم شخصیتوں مثلاً علامہ اقبال وغیرہ پر نظمیں لکھیں۔

مثال کے طور پر ان کی نظم "شاعرِ مشرق" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ترا کلام حکیمانہ وقت کی آواز
میں سازِ جاں پہ ترے گیت گنگناتی ہوں
قبول کر مرے نذرانۂ عقیدت کو
ترے حضور متاعِ حیات لاتی ہوں

۱۔ گلنار آفریں۔ پلک پلک سمٹی رات۔ اکیڈمک آفسٹ پریس کراچی۔ ص ۱۵

Dhaka University Institutional Repository

بطور مثال گلنار کی نظم "ماں" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عظیم ماں ترے صدقے کہ تیرے قدموں میں
مری حیات کی معراج میری جنت ہے
عظیم ماں ترا دستِ دُعا بلند رہے
کہ اس دُعا کی ہمیشہ مجھے ضرورت ہے

شاعری کے علاوہ گلنار آفریں نے افسانہ نگاری کے شغف کو بھی اپنایا۔ نظیر صدیقی گلنار آفریں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"شاعری انہیں خاندانی ورثے میں ملی ہے اور افسانہ نگاری ان کا ذاتی اکتساب ہے ان کی شاعری میں کسی قسم کی افسانویت یا افسانوی فضا ہو یا نہ ہو، ان کے افسانوں میں احساس کی شاعرانہ نزاکت ضرور ہے۔" [1]

شاعری ہو یا افسانہ نگاری ہر جگہ انہوں نے مشرقی اقدار کی غمّازی کی ہے۔ وہ مشرق پر مغرب کے اثرات سے باخبر ہیں۔ لیکن مشرقی خاتون کی پاکدامنی انہیں نہایت عزیز ہیں اور اس تہذیب کو وہ برقرار رکھنے کی خواہش مند نظر آتی ہیں۔ محبت کو انہوں نے ایک مقدس جذبہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

سید انور، گلنار آفریں کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گلنار آفریں کے افسانوں کا کلیدی کردار "عورت" ہے۔ گلنار آفریں کی عورت موجودہ دور کی تعلیم یافتہ ترقی پسند اور ماڈرن عورت ہے۔ وہ مشرقی تہذیب اور ثقافت کی گرویدہ ہے۔ وہ معاشرے کے ظلم و ستم کا مقابلہ قربانی، ایثار، بردباری، برداشت اور محبت سے کرتی ہے۔" [2]

انکے تمام افسانے معاشرتی ہیں جو عورتوں کی نفسیاتی کشمکش اور خانگی پریشانی پر مبنی ہیں۔ انہوں نے مردوں کی سفاکی اور عیاری پر بھرپور تازیانہ لگایا ہے۔ ان کا نفسیاتی شعور اور قوتِ مشاہدہ اچھا ہے۔ سماج کی سادہ لوح بے گناہ عورتوں سے انہیں بڑی ہمدردی ہے۔ وہ عورتوں کی فلاح و بہبود چاہتی ہیں۔ لیکن مشرقی اقدار کی

---

[1] "بلک بلک سسٹی رات"، سرورق [2] ایضاً ص ۱۲

Dhaka University Institutional Repository

کی بجا آوری کے ساتھ شاعری ہو یا افسانہ انہوں نے ہر جگہ ابتذال سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اسلوب میں پروین شاکر کی طرح عریانی نہیں اور نہ ہی بغاوت ہے۔ انہوں نے اپنا افسانہ پلک پلک سمٹی رات" میں مرد کے کردار سے عورتوں کے حقوق کی حمایت کروائی ہے۔ جو حقیقت پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر چند سطور ملاحظہ ہوں:

"میں جانتا ہوں مونا صاحبہ، ہمارے اس معاشرے میں، ہماری اس سوسائٹی میں آپ جیسی ان گنت بیویاں یونہی اس دردناک انداز سے جیا کرتی ہیں مگر ان میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ احتجاج کر سکیں۔ اس لئے کہ صدیوں سے ہمارے معاشرے میں عورت کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ صدیوں سے ہمارے ماحول میں عورت مٹی کے کھلونوں کی طرح ٹوٹتی رہی ہے"[1]

ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

(۱) پلک پلک سمٹی رات:	افسانوں کا مجموعہ	(مطبوعہ ۱۹۸۷ء)
(۲) جرس گل:	شعری مجموعہ	(" " ۲۰۰۰ء)
(۳) تیشۂ غم:	" "	(" " ۱۹۹۰ء)
(۴) پھول اور وہ:	افسانوں کا مجموعہ	(زیر طبع)
(۵) من کے تار:	گیتوں کا مجموعہ	(زیر طبع)
(۶) جانے انجانے لوگ:	شخصی خاکے	(زیر طبع)

---

[1] گلنارہ آفریں "پلک پلک سمٹی رات" اکیڈیمک پریس کراچی طبع دوم ۱۹۹۰ء ص ۲۸

Dhaka University Institutional Repository

نواب محی الدین

نواب محی الدین کا شمار سابق مشرقی پاکستان کے مہاجر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانے ۱۹۶۰ء کے بعد منظرِ عام پر آئے۔ اس دور میں انہوں نے متعدد اچھے افسانے لکھے جن میں "گڑیا بیٹی"، "کالا پتھر" "مرغی کھاتا" اردو حلقے میں پسند کئے گئے۔ محی الدین کے افسانے حقیقت نگاری کے تحت بیانیہ بھی ہیں اور علامتی بھی۔ "انتخاب" ڈھاکا (دسمبر ۱۹۸۸ء) میں شائع ہونیوالا افسانہ "دیدہ نادیدہ" علامتی افسانہ ہے۔ جس کا پلاٹ ہیروئن کی کالا بازاری ہے۔ آغاز سے اختتام تک یہ ایک کامیاب افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ نواب محی الدین اپنے افسانوں کے پلاٹ اپنے گرد و پیش سے لیتے ہیں۔ جس میں مقصدیت ہوتی ہے ان کے افسانوں میں تاثر کا ارتکاز، واقعات میں تسلسل، تذبذب وغیرہ موجود ہیں۔

نواب محی الدین ۱۹۷۱ء سے پہلے ہی روزی روٹی کی تلاش میں پاکستان (مغربی پاکستان) ہجرت کر گئے۔ کہا جاتا ہے وہاں وہ محی الدین نواب کے نام سے شہرت پا چکے ہیں۔ اور فلم انڈسٹری سے منسلک ہیں۔

نمونہ افسانوی نثر:

"۔۔۔۔ بلڈوزر مصروف تھے۔ چند دکانوں اور مکانوں کو گرانے کے بعد انہیں روک دیا گیا۔ اس کے آگے بدنام منشیات فروش گل مرجان کا اڈہ تھا۔ پولیس والوں کا اس چار دیواری کے سامنے ایک بینر لگا دیا تھا جس پر لکھا ہوا تھا "تھانہ گلزار ہجری" وہاں فوری طور پر کچھ میزیں اور کرسیاں لاکر رکھ دی گئیں۔ اڈے کے تہہ خانے میں جہاں منشیات کی تھیلیاں بھری رہتی تھیں وہاں ہیڈ محرر کا کمرہ بنایا گیا۔ ایک شخص نے جذبہ ایمانی سے سرشار ہو کر کہا۔ اسے کہتے ہیں ایمانی جذبہ۔ اسلام سے پہلے خانہ کعبہ بھی بتوں کا مسکن تھا۔ اسلام آتے ہی بتوں کو گرا دیا گیا۔ وہی چار دیواری ہمارا کعبہ ہے۔ ہمارے سجدوں کا مرکز۔"[1]

---

[1] محی الدین نواب "دیدہ نادیدہ" انکشاف سالنامہ ۵ دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۷۷

Dhaka University Institutional Repository

محبوب خزاں

نام محبوب۔ تخلص خزاں۔ تقسیم ہندوستان کے بعد سابق مشرقی پاکستان آگئے اور ڈھاکے میں رہائش اختیار کی۔ وہ بنگلہ دیش کے ترقی پسند شعراء میں معروف ہیں۔ شعر گوئی میں وہ فیض احمد فیض اور میراجی سے متاثر ہیں۔ ان کی شاعری احسن احمد اشک صلاح الدین محمد، ادیب سہیل، نوشاد نوری سے مماثلت رکھتی ہے۔ انہوں نے نظم، غزل، قطعات اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے فکری رجحان کو نظم میں اجاگر ہونے کا موقع ملا۔ محبوب خزاں کے بارے میں سلیم اللہ فہمی کی رائے تائیداً لکھنا مناسب سمجھتی ہوں۔

سلیم اللہ فہمی اپنے مضمون "مشرقی پاکستان میں اردو شاعری کے تیرہ سال" میں محبوب خزاں کے متعلق رقمطراز ہیں

"۔۔۔ محبوب خزاں مشرقی پاکستان میں بہت بعد میں آئے لیکن آتے ہی فضا پر چھا گئے۔ آج وہ ممتاز شعراء میں سے ایک ہیں۔ کبھی کبھی گہری اور چونکا دینے والی بات ایسے انداز میں کہہ جاتے ہیں کہ سننے والا حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ ان کے اسلوب اور تخیل میں شدت سے نیا پن ہے۔ جو کہنہ مشقی کے سہارے سننے والوں کو متاثر کرتا اور اردو کے مزاج سے اجنبی معلوم نہیں ہوتا"[1]

حسین احمد اپنی کتاب "تنقیدی جائزے" محبوب خزاں کی شاعری پر ناقدانہ روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آج مشرقی پاکستان کے بیشتر نوجوان ادیبوں پر خزاں کا اثر ہے۔ ان کے رنگ میں نظمیں اور غزلیں کہی گئی ہیں۔ ان کے انداز بیان کو لوگوں نے اپنایا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے مصرعے افسانوں کے اب عنوان بننے لگے ہیں"۔[2]

بحیثیت مجموعی فکری و فنی لحاظ سے خزاں اچھے شاعر کہے جا سکتے ہیں۔ ان کا نیا پن قابل قبول ہے۔ ان کی صدا قاری کو اپنے دل کی صدا معلوم ہوتی ہے۔ اور لب و لہجے کی غنائیت و نغمگی قاری کے دل کو متاثر کرتی ہے۔

خزاں کی شاعری کی اولین خصوصیت ان کی حقیقت بیانی ہے۔ ان کی شاعری برائے زندگی ہے۔ اس میں آمد

---

[1] نشتاہی "قلم کار" ڈھاکا ۱۹۶۰ء ص ۲۰

[2] تنقیدی جائزے بساط ادب، کراچی ۱۹۷۲ء ص ۵۰

Dhaka University Institutional Repository

ہے اور دنہیں۔ خزاں نے اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات سے گہرا تاثر لیا اور اسے کامیاب طریقے سے شعری جامہ پہنایا۔ ان کی شاعری ان کے عہد کی ترجمان ہے۔ چاند کے مسافر" ان کی مشہور نظم ہے جس میں اسلحہ کی فراوانی اور چاند پر انسانی قدم پہنچانے کی کوشش بیان کی گئی ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود جا بجا ان کی شاعری میں ابہام کی خامیاں نظر آتی ہیں جس کی وجہ سے قاری کو بعض وقت بات سمجھنے میں پُر پیچ راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

" اکیلی بستیاں" " رات اور دن" "چاند کا مسافر" ان کی مفید نظمیں ہیں:

مثال : قطعہ

مجھے دیکھو کہ مجھ سے زندگی دیکھی نہیں جاتی
اجالا اس قدر ہے روشنی دیکھی نہیں جاتی
وہ آنکھیں کس طرح اسرارِ عالم دیکھ سکتی ہیں
وہ آنکھیں جن سے اوروں کی خوشی دیکھی نہیں جاتی

محبوب خزاں ۱۹۷۱ء کے ناموافق حالات سے مجبور ہو کر پاکستان ہجرت کر گئے۔

بطور مثال ان کے اشعار:

جنوں سے کھیلتے ہیں، آگہی سے کھیلتے ہیں
یہاں تو اہلِ سخن، آدمی سے کھیلتے ہیں

آدھی جوانی روتے گزری: ڈھونڈ رہا تھا بچپن تجھ کو

محبت کو گلے کا ہار بھی کرتے نہیں بنتا
کچھ ایسی بات ہے انکار بھی کرتے نہیں بنتا

Dhaka University Institutional Repository

شہزاد اختر

دبستان اردو میں شہزاد اختر کی پہچان ایک معیاری افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد ڈھاکا آئے اور اسے اپنا مسکن بنایا۔ شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کی تعلیم مکمل کی!

شہزاد ۱۹۶۰ء کے بعد مقبول افسانہ نگار غلام محمد، اُم عمارہ، احمد زین الدین کی صف میں شامل ہیں جنہوں نے یہاں کے جدید ادبی رجحانات سے اپنے افسانے کو مزین کیا۔ اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ شہزاد ترقی پسند نظریہ کے حامی ہیں۔ ان کی نظریں انسانی قدروں پر رہتی ہیں۔ فکری و فنی پیمانے پر ان کے افسانے معیاری ہیں۔ انہوں نے بنگلادیش (سابق مشرقی پاکستان) میں رہ کر دور دیس کی کہانی نہیں لکھی۔ شہزاد نے افسانوں کے موضوعات اپنے گرد و پیش سے اخذ کئے۔ ان کا قوت مشاہدہ اور نفسیاتی شعور اچھا ہے۔ شہزاد کے افسانوں میں سب سے اول جو بات قاری کو اپنی طرف مبذول کرتی ہے وہ مقامی رنگ ہے۔ ان کے افسانوں میں سابق مشرقی پاکستان (بنگلادیش) کی عوامی زندگی کی عکاسی بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے دیہاتی زندگی کی ترجمانی بہت تفصیل سے کی ہے۔ گاؤں کے غریب کسان، مزدور، ماہی گیر، سیلاب اور طوفان سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے جن کرب و آلام کے شکار رہتے ہیں۔ ان کیفیات کو بڑے دردانگیز لہجے میں بیان کیا ہے۔ واقعات کے بیان میں حقیقت نگاری ہے۔ دیوانے کا خواب، "جونک" "سکھ سپنا دکھ نینا"[1] "پت جھڑ" وغیرہ ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔

بہ قول غلام محمد، شہزاد اختر نے پاکستانی عہد میں ایک سرکاری ملازمت کے عوض لکھنا ترک کر دیا[2]

شہزاد اختر افسانہ نویسی کے علاوہ ریڈیو پاکستان کے اردو پروگرام سے بھی منسلک رہے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد نامساعد حالات سے مجبور ہو کر پاکستان ہجرت کر گئے۔

نمونہ افسانوی نثر:

"..... گومتی، سنا لکھا اور بوڑھی گنگا میں پانی چڑھ آنے کے باعث کھیتوں میں برسات کا پانی کمر کمر کھڑا ہو گیا تھا۔ نکاسی کی کوئی صورت نہ تھی۔ گڑھوں اور تالابوں کا پانی بھی کھیتوں کی سطح پر آگیا تھا اور اب پتہ نہ چلتا تھا کہ کہاں گڑھے تھے اور کہاں تالاب تھے۔ البتہ کھیتوں کا پتہ نڈھال ہو کر سطح پر سر ڈالے دھان اور مکئی کے پودے سے ملتا تھا۔ تمام کسان فصل کی طرف سے نا امید ہو چکے تھے۔" (دیوانے کا خواب)

---

[1] "اردو انجمن" شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی کا رسالہ "جوئبار" جون ۱۹۶۵ء میں شہزاد اختر کا افسانہ "سکھ سپنا دکھ نینا" شائع ہوا۔ اس وقت موصوف ایم اے فائنل کے طالب علم تھے ص ۸۲

[2] انکشاف، ادبی رسالہ ڈھاکا (مدیر ایوب جوہر) فروری ۱۹۸۶ء ص ۷۱

Dhaka University Institutional Repository

حیدر صفی

حیدر صفی سابق مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۰ء سے قبل کے افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی تخلیقی رفتار مدھم تھی وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے۔ وہ افسانہ نگاری میں اچھا شعور رکھتے ہیں۔ "چراغ تلے" "آخری راستہ" "چچا پہلوان" "داشتہ" "تین دن اور تیس سال" موضوع و فن کے لحاظ سے قابل ذکر افسانے ہیں۔ انہوں نے سابق مشرقی پاکستان کے قومی، سماجی و لسانی مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ "تین دن اور تیس سال" کا پلاٹ سابق مشرقی پاکستان کے لسانی کشمکش پر رکھا ہے۔ افسانہ دلنشیں اور سبق آموز ہے ان کے افسانوں میں فنی لوازم بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انداز بیان صاف ستھرا اور عام فہم ہے۔ اپنے مقصد کو تقویت پہنچانے کے لئے جا بجا بنگلا مکالمہ لکھا ہے۔ لیکن اردو میں اس کا مطلب واضح کر دیا۔ حیدر صفی نے ایک ناول "مادام" کے نام سے لکھا تھا جو ڈھاکے میں ۱۹۷۱ء میں آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا۔[1] حیدر صفی کا قیام بھارت میں ہے۔ اب انہوں نے ادبی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔

نمونہ افسانوی نثر: "..... کہتے ہیں انسان کے لئے سکھ کے دن بھی اڑتے ہوئے بادلوں کے سائے کی طرح مختصر ہوتے ہیں۔ شاہ جی نے بھی ابوالحسن کو اپنا داماد بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ اس خواب کی تعبیر کے لئے جد و جہد کرنے سے پہلے ہی وہ شیشے کی کسی رنگین گلاس کی طرح ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔"

بقول قاسم انیس[2] حیدر صفی کے افسانوں کے دو مجموعے "اندھا سوال" اور "کلی کی خوشبو" (مکمل) نصف سے زائد کی (کتابت ۱۹۷۰ء میں ہو چکی ہے) دونوں مجموعے کی کتابت قاسم انیس نے کی ہے۔ لیکن کسی وجہ کی بنا پر ابتک زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکے۔

---

[1] ایوب جوہر۔ "بنگلادیش میں اردو افسانے اور افسانہ نگار" زبان و ادب، پٹنہ ۱۹۹۰ء ص ۱۰

[2] قاسم انیس (ڈھاکے میں مقیم اردو کاتب) کا زبانی بیان۔ بتاریخ ۲۴ جولائی ۱۹۹۲ء

Dhaka University Institutional Repository

مقبول نقش

مقبول نقش ہندوستان کے ایک شریف متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان سے قبل وہ جمشید پور میں ایک بہت بڑے لوہے کے کارخانے میں بحیثیت میکنک کام کرتے تھے۔ ۱۹۵۲ء مستقل طور پر سابق مشرقی پاکستان آگئے۔ یہاں وہ تعمیراتی کام کرنے کرنے والے کنٹریکٹروں کے یہاں مزدوروں کے نگراں کی حیثیت سے ذمہ داری انجام دیتے اور اپنے نان ونفقہ کے سامان مہیا کرتے رہے۔[1] ادبی حلقے میں ان کی پہچان ایک شاعر کی حیثیت سے تھی۔ ان کے ادبی کارناموں پر گمنامی کا پردہ پڑا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ، "جوئے خوں" (۷۲ بندوں کا مسدس) کے نام سے اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ستارۂ پاکستان پریس سے چھپ کر شائع ہوا۔ یہ کتاب وطن کے شہیدوں اور مجاہدوں کے نام منسوب کی گئی ہے۔ اس کی شاعرانہ فنکاری پر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اظہار خیال پیش کیا اور نظیر صدیقی نے "ازراہ تعارف" کے عنوان سے اس کے افادی و معنوی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ نظیر صدیقی "جوئے خوں" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق شعری تخلیقات میں "جوئے خوں" کو ایک امتیاز حیثیت حاصل ہے۔ اس نظم میں پاکستان پر حملہ کرنے والے دشمن سے صرف نفرت کا اظہار نہیں کیا گیا یا پاکستان پر ہندوستان کے حملے کے خلاف صرف مجاہدانہ اور سرفروشانہ جذبات ظاہر نہیں کئے گئے۔ اس میں پاکستان اور ہندوستان کے تاریخی اور فوجی تصادم کا پس منظر بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نظم ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ تک مسئلہ کشمیر کی منظوم تاریخ ہے۔"[2]

"جوئے خوں" میں شاعر کی فنکاری قابل ذکر ہے۔ شروع سے آخر تک زبان عام فہم اور رواں ہے۔ مناسب موقعوں پر مصرعے جوشیلے ہیت کے ہیں۔ مقبول نقش کا تاریخی اور سیاسی شعور اس مسدس کے ہر بند میں نمایاں ہے۔ کتابچہ کے مصنف جیسا کہ ان کے احوال زندگی سے ظاہر ہے۔ کتاب خواں نہیں۔ مگر کتاب زندگی کے رموز و نکات سے واقف اور باخبر ضرور ہیں۔ اس میں ان کی کاری گہنائش نہیں۔ مقبول نقش نے کسی استاد سے شاعری نہیں سیکھی۔

---

[1] مقبول نقش "جوئے خوں" ستارہ پاکستان پریس ڈھاکا ۱۹۶۸ء، ص ۱۴

[2] ایضاً ص ۱۵

Dhaka University Institutional Repository

ان کا شاعرانہ شعور فطری ہے۔ مقبول نقش کی یہ مختصر تصنیف بنگلا، پاک و ہند کی تاریخ اور ادب میں یادگار رکھی جا سکتی ہے۔

سادہ تصویر کو مل گیا رنگ بھی
چھڑ گئی دوسری عالمی جنگ بھی
وہ دھماکے ہوئے اور وہ بم گرے
سرنگوں ہو گیا قصرِ افرنگ بھی

ظالموں کے ستم میں کمی آ گئی
غمزدوں کے لبوں پر ہنسی آ گئی
لارڈیوں کا آخر مشن آ گیا
لیگ اور کانگرس سے ہوا مشورا
لیگ کو اس پہ اصرار تھا برملا
قوم مسلم جدا، قوم ہندو جدا

کانگرس کی تھی ضد ہم وطن ایک ہیں
جتنے ہیں بت و بت شکن ایک ہیں

لہ یہ جنگ ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۴۵ تک رہی

لہ ۔ شملہ کانفرنس جون ۱۹۴۵ء

Dhaka University Institutional Repository

اسلم فریدی

نام اسلم۔ معروف اسلم فریدی۔ تخلص فریدی۔ ماہر فریدی کی شاگردی کی مناسبت سے فریدی تخلص کرتے ہیں۔ اسلم فریدی کی ادبی خدمات دور پاکستان سے دور بنگلادیش تک محیط ہیں۔ دور پاکستان میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں پروفیسر فروغ احمد سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ قیام بنگلادیش کے بعد ماہر فریدی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ۹۵ صفحات پر مشتمل ان کا مختصر مجموعہ کلام "افکار فریدی" کے نام سے "بزم نشاط ادب" میرپور (ڈھاکا) کی سرپرستی میں اگست ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں چالیس سے زائد غزلیں، چند نظمیں اور قطعات ہیں۔ اسلم فریدی نے اس مجموعے کو بنگلادیش میں اردو ادب کو زندہ رکھنے والوں کے نام انتساب کیا ہے۔ طرز نگارش روایتی ہے۔ دلی جذبات کی عکاسی، سچائی اور روانی ہے۔

اسلم فریدی غالباً ۱۹۷۷ء میں پاکستان چلے گئے۔

نمونۂ کلام:

غم کی جب تم نے ابتدا کر دی
صبر کی میں نے انتہا کر دی

دل دیا جان بھی فدا کر دی
طے رہِ منزلِ وفا کر دی

اے فریدی یہ فیضِ ماہر ہے
جس نے حق میں ترے دعا کر دی

لہ افکار فریدی "عرض حال" اسلم فریدی

Dhaka University Institutional Repository

باب سوم

بنگلہ دیش میں اردو ادب سنہ ۱۹۷۲ء تا سنہ ۱۹۹۰ء

پاکستان کے دو حصے تھے۔ مشرقی و مغربی۔ مشرقی پاکستان ۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء کو پاکستان سے علیحدہ ہو کر بنگلا دیش بنا۔ قیام پاکستان کے وقت پاکستان کے دونوں حصوں کے عوام میں بڑی اخوت و یک جہتی تھی۔ جب حکومت پاکستان نے اردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا تو سابق مشرقی پاکستان میں اس کے خلاف بے چینی، غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اور مطالبہ کیا جانے لگا کہ بنگلا کو بھی سرکاری زبان بنایا جائے۔ کیونکہ سابق مشرقی پاکستان میں اکثریت کی زبان بنگلا تھی۔ رفتہ رفتہ یہ مطالبہ تحریک کی شکل اختیار کرتا گیا اور مطالبہ میں شدت پیدا ہو گئی۔ ۲۱ فروری سنہ ۱۹۵۲ء میں بنگلا کو سرکاری زبان بنانے کے لئے ڈھاکے میں جلوس نکالا گیا۔ پولیس نے جلوس کو منتشر کرنے کے لئے گولیاں چلائیں جس میں چند طالب علم شہید ہو گئے۔ اس دل سوز سانحہ نے پاکستان کے دونوں بازوؤں کی یک جہتی میں پھوٹ ڈالنے کے لئے چنگاری کا کام کیا۔ یہ چنگاری تہہ خاک سلگتی رہی۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے خود غرض سیاسی لیڈروں کی بد اعمالیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور یہ آگ یک بیک بھڑک اٹھی پاکستان کا مشرقی حصہ خلفشار میں مبتلا ہو گیا۔ اس خلفشار کا اختتام اس طرح ہوا کہ ۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء کو پاکستان کا مشرقی حصہ علیحدہ ہو گیا۔ اور بنگلا دیش کا قیام عمل میں آیا۔ شہزاد منظر اس سیاسی کشمکش میں بنگالی عوام (سابق مشرقی پاکستان کے بنگالی باشندے) کے حق بہ جانب رہنے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "بنگالیوں نے کبھی وفاق سے علیحدگی کی بارے میں نہیں سوچا۔ وہ پر آئینی جدوجہد کے ذریعہ اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے جدوجہد کرتے رہے لیکن فوجی آمر جنرل یحییٰ اور مغربی پاکستان کے جاگیردار طبقے اور اس کے پروردہ پنجابی اور مہاجر سول اور ملیٹری بیوروکریسی کی جانب سے بنگالی مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے کی کوشش کے ردعمل میں بنگالی قوم پرستی پروان چڑھی اور اس کے منطقی نتیجے میں پاکستان کا سابق مشرقی حصہ خانہ جنگی کا شکار ہو گیا

Dhaka University Institutional Repository

اس خانہ جنگی کے نتیجے میں بے شمار معصوم اور بے گناہ لوگ مارے گئے جن میں بنگالی بھی تھے اور غیر بنگالی بھی۔ لیکن غیر بنگالیوں کی تعداد چونکہ بنگالیوں کی بہ نسبت کم تھی اس لئے ان کا جانی اور مالی نقصان زیادہ محسوس ہوا۔[1] شہزاد منظر مزید لکھتے ہیں:

"مشرقی پاکستان میں جمہوری قوت کی پامالی اور فوجی آمریت کی جانب سے بنگالی مسلمانوں کی علاقائی خود مختاری کی جدوجہد کو بہیمانہ طور پر کچلنے کے نتیجے میں نسلی منافرت اور علاقائی اور لسانی عصبیت نے نہایت گھناؤنی صورت اختیار کر لی اور بنگالی قوم، بنگالی قوم پرستی کے جنون میں پاگل ہو گئی اور مغربی پاکستان کی پنجابی فوج اور پنجابی بیوروکریسی کے ساتھ مشرقی پاکستان کے ان اردو بولنے والوں کو بھی اپنا دشمن سمجھ لیا جو بنگالیوں کی علاقائی خود مختاری کی جدوجہد میں ان کے خلاف مغربی پاکستان کا ساتھ دے رہے تھے۔[2]

بہر حال یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ بنگلا دیش کی بنیاد اردو و بنگلا لسانی تنازعہ سے پڑی جس سے اردو داں طبقہ گہرے طور پر متاثر ہوا اور اسے پناہ لینے کے لئے بھارت اور پاکستان کا سہارا لینا پڑا۔ اس طرح سابق مشرقی پاکستان کے مہاجر طبقے کو دوسری مرتبہ ہجرت کا کرب برداشت کرنا پڑا۔ ان تمام واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو داں طبقے کے ساتھ اردو زبان و ادب پر بھی حرف آنے لگا۔ لیکن سیاسی حالات کے سدھرتے ہی رفتہ رفتہ تازگی پیدا ہو گئی۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد یہاں رہ جانے والے اردو داں نے اطمینان کا سانس لینا شروع کیا تو ان میں اردو ادب کے فن کار اپنے جذبات اور احساسات کے اظہار کے لئے بے چین ہو گئے لیکن ان کے پاس قلمی تخلیق کی اشاعت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ نہ اخبار تھا نہ رسالہ اور نہ پریس تھا۔ ایسے عالم میں انہوں نے قلمی رسالہ نکالا۔ پھر حالات قدرے موافق ہوئے تو باقاعدہ ادبی رسائل بھی شائع ہونے لگے۔ ان ادبی رسائل کی اشاعت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے جوں جوں دن گزرتا گیا۔ اردو کے لئے فضا سازگار ہوتی گئی۔ نئی ادبی انجمنوں کی بنیادیں پڑیں، جو پرانی تھیں ان میں از سر نو تازگی پیدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ حالات اور سازگار ہوئے تو شعری اور افسانوی مجموعے بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بنگلہ دیش کے اہل قلم تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کاموں سے اردو زبان کے سرمائے کو مالا مال کر رہے ہیں۔ یہ بڑی مبارک علامت کہی جا سکتی ہے۔

---

[1] شہزاد منظر: "پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال"۔ ص ۲۰۶

[2] ایضاً ص ۲۰۶

Dhaka University Institutional Repository

یہاں کے مقامی اور غیر مقامی شعراء و ادباء جو دورِ پاکستان سے اردو ادب نوازی میں کم و بیش منہمک رہے ان میں آصف بنارسی، سلیم اللہ فہمی، عابد دانا پوری، امیر الاسلام شرقی، ظہور المبارکی، ماہر فریدی، حافظ دہلوی، کامل کلکتوی، عطا آصفی، خطیب رودلوی، ذوق چائیگامی، منور صدیقی (چائیگام)، محمد عبداللہ، کلیم سہسرامی، شمس الحق شیدائی، اسد الحق شیدائی، احسن احمد اشک، نوشاد نوری، عطاء الرحمٰن جمیل، احمد سعدی، احمد الیاس، نیر احمری، نور خاں نور، غلام محمد، زین العابدین، یوسف حسن، نور الدین کے نام تحریر کے مستحق ہیں۔

۱۹۷۱ء کے بعد ابھرنے والے شعراء و ادباء میں اختر آنولوی، شعیب عظیم، شمیم زمانوی، ایوب جوہر، ذاکر عزیزی، شام بارک پوری، س۔م۔ ساجد، ایم۔ نعیم، کلیم احمد، قاضی محی الدین، حسنین بھاگلپوری، جمال مشرقی، جلال عظیم آبادی، صابر علی صابر، سخاوت حسین سحر، زبیر ارتضیٰ، عاطف بنارسی، عثمان غنی شاداں، شاد آصفی، محیط رشک، ارمان شمسی، یوسف راہی، محبوب شیدائی، قاسم انیس وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں

تنقیدی و تحقیقی کاموں کے ساتھ اردو درس و تدریس سے منسلک رہنے والوں میں شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی کے اساتذہ میں فیض احمد چودھری (مرحوم) رستم علی دیوان (مرحوم) محمد عبداللہ، کلثوم ابو البشر، اُم سلمیٰ، زینت آرا شیرازی، جناب ظفر احمد خُفتاں کے علاوہ راقم السطور کا نام لیا جا سکتا ہے۔

شعبۂ السنہ راجشاہی یونیورسٹی کے اساتذہ میں کلیم سہسرامی، شمیم خان شمیم، لطیف احمد، حسین احمد کمالی کا ذکر ضروری ہے۔

کالجوں کے اساتذہ میں مرحومہ محفوظہ اسلام (بدر النساء کالج) مرحومہ جہاں آرا چودھری (جگناتھ کالج) ممتاز بیگم (کوملا کالج) خلیل احمد (کھلنا کالج) اسد الحق شیدائی (کشٹیا سرکاری کالج) کے نام تحریر کے مستحق ہیں۔

فی الحال کالجوں کے اساتذہ اپنے اپنے عہدوں سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ کالجوں میں اردو طلباء و طالبات خال خال ہیں۔ شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی اور شعبۂ السنہ راجشاہی یونیورسٹی اس معاملے میں قابلِ تحسین ہے ان شعبوں میں درس و تدریس کے پہلو بہ پہلو اردو ادب کی تخلیقی رفتار جاری ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

۱۹۷۱ء کے بعد جن ادبی انجمنوں نے مفید خدمات انجام دی ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہیں۔

بزم آصفی: یہ بہت قدیم ادبی انجمن تھی۔ قیام بنگلادیش کے بعد عثمان غنی شاداں اور حسین مرزا کی کوششوں سے یہ عمل پیرا ہوئی۔ علامہ آصف بنارسی کے نگرانی میں اس انجمن نے ادبی کارنامے انجام دیئے۔ اس بزم کے ساتھ جن معتبر اہل قلم کا تعاون رہا ان میں کامل کلکتوی، اظہر قادری، نوشاد نوری، شعیب عظیم، شفیق احمد شفیق، احمد الیاس، نیر احمری، جمال مشرقی، صابر علی صابر اور ایوب جوہر کے نام قابل تحریر ہیں۔ اس بزم کے بانی اور صدر علامہ آصف بنارسی اور عثمان غنی شاداں کے بعد یہ بزم بھی خاموش ہو گئی[1]

انجمن ادب: ترقی پسند انجمن تھی۔ قیام بنگلادیش کے بعد اس انجمن نے اپنے آپ کو دوبارہ ترتیب دیا۔ اس انجمن نے اپنی روایات کے مطابق تنقیدی نشستوں پر زیادہ توجہ دی اور کئی چھوٹے بڑے مشاعروں کے علاوہ ایک ادبی مجلہ "انجمن" احمد الیاس کی ادارت میں (جنوری ۱۹۷۸ء) میں شائع کیا۔ یہ ایک فعال انجمن کہی جا سکتی ہے اس انجمن سے جو شعراء و ادباء منسلک رہے ان میں عطاء الرحمٰن جمیل، نوشاد نوری، احمد الیاس، قدوس صدیقی، س۔م۔ ساجد، جمال مشرقی، زین العابدین، احمد سعدی، ایوب جوہر قابل ذکر ہیں۔

دبستانِ ادب: دبستان ادب کا قیام ۲ نومبر ۱۹۷۴ء کو جمال مشرقی کے گھر پر ہوا تھا۔ عطا آصفی اس کے صدر تھے۔ پروفیسر جہاں آرا چودھری، صابر علی صابر، احمد الیاس، نوشاد نوری، ڈاکٹر یوسف حسن، شعیب عظیم، پروفیسر کلثوم ابو البشر، رضا دارووی وغیرہ اس انجمن سے منسلک رہے[2]۔ یوم نذرل کے موقع پر ادبی مذاکرہ کا اہتمام دبستان ادب کا ایک مفید خدمت کہا جائے گا۔ بنگلا اور اردو ادب کا آپس میں اتحاد و اشتراک دبستان ادب کا کارآمد رجحان ہے[3]۔

محاذ پبلی کیشنز بنگلادیش: ایوب جوہر اس ادارے کے بانی تھے۔ محاذ پبلی کیشن بنگلادیش کے تحت بہت ساری ادبی اشاعتیں منظر عام پر آئی ہیں جن میں سہ ماہی جریدہ "محاذ" کے کئی شمارے، شعری مجموعہ "چراغ لالہ" (پروفیسر شمس شیدائی) افسانوی مجموعہ "سادہ کاغذ" (ایوب جوہر) کے علاوہ "رفتار" (۱۹۷۱ء کے بعد ڈھاکے کا سب سے پہلا

---

[1] ایوب جوہر۔ بنگلادیش میں ادبی انجمنوں کا سفر" مجلس" ڈھاکا - ۱۹۸۸ء ص ۵۱-۵۲

[2] ایضاً ص ۵۲

[3] ایضاً ۵۳

Dhaka University Institutional Repository

اردو جریدہ) سہ ماہی جریدہ "انکشاف" کی مسلسل اشاعتیں قابل ذکر ہیں۔ ایوب جوہر کے انتقال کے بعد یہ فعال ادارہ عملاً ختم ہو گیا۔

شاہکار پبلی کیشنز: اس ادارے کے بانی س۔م ساجد ہیں۔ اس انجمن نے "شاہکار" اور "دستک" کے نام سے رسالے شائع کئے۔ س۔م ساجد اور احمد سعدی کا مشترکہ افسانوی مجموعہ "دو چراغ محفل" اسی ادارے کے سرپرستی میں شائع ہوا۔

حلقۂ اہل قلم: حلقہ اہل قلم کے سرپرست اصغر راہی تھے۔ اس انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ بنگلا دیش پریشد (ڈھاکا) کا کل بنگلہ دیش کوی سمیلن (مشاعرہ) جس میں بنگلا زبان کے نامور شعراء کے علاوہ بنگلا دیش کے مختلف علاقوں کے نمائندہ شعراء و ادباء نے بھی شرکت کی تھی۔ حلقہ اہل قلم نے بہت سارے مشاعرے کا اہتمام کیا۔ جن میں "یوم غالب" اور "یوم نذرل" کے موقع پر کئے گئے مشاعرے یادگار ہیں۔

اُردو مجلس: اردو مجلس کے بانی جمال مشرقی تھے۔ اس ادارے نے کئی کامیاب مشاعروں اور ادبی نشستوں کا اہتمام کیا۔ رسالہ "مجلس" کی اشاعت اس کا مفید کارنامہ ہے۔ جمال مشرقی کے انتقال کے بعد یہ انجمن بھی خاموش ہو گئی۔

ناسپاسی ہوگی اگر سید پور کی ادبی انجمنوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ سید پور میں جن ادبی انجمنوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ہیں ان میں حلقۂ احباب، منزل ادب اور مرکز تخلیق ادب کے نام خاص طور قابل ذکر ہیں۔ "حلقہ احباب" ۱۹۷۳ء میں قائم ہوا۔ حافظ مقبول نظر اس کے سرپرست تھے۔

مرکز تخلیق ادب: مرکز تخلیق ادب بڑی سرگرم انجمن تھی۔ اس کے بانی ذاکر عزیزی تھے۔ اس ادارے نے "انتخاب" کے نام سے پانچ ادبی شمارے شائع کئے۔

منزلِ ادب: منزل ادب کے بانی جلیل عشرت تھے۔ اس ادارے نے کئی مشاعروں اور ادبی نشستوں کے اہتمام میں قابل قدر حصہ لیا

حلقۂ فکر و دانش: حلقہ فکر و دانش کے بانی و صدر حافظ دہلوی تھے[1]۔ اس کی بنیاد ڈھاکے میں سنہ ۱۹۷۱ء سے پہلے پڑ چکی تھی۔ دور پاکستان میں اس انجمن کے زیر اہتمام ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل (ڈھاکا) میں ایک یادگار

[1] بہ زبانی حافظ دہلوی ۷ اگست ۱۹۹۳ء

Dhaka University Institutional Repository

مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ قیام بنگلہ دیش کے بعد یہ ایک فعال انجمن رہی۔ "نجم و شرر" (شعری مجموعہ) کی فروری ۱۹۷۵ء میں اشاعت حلقہ فکر و دانش کی مفید پیشکش ہے۔ یہ انجمن حافظ دہلوی اور ان کے شاگردوں پر مشتمل تھی۔ بنگلادیش میں اس انجمن کی پانچ شاخیں محمد پور (ڈھاکا) چاٹگام، رنگ پور، جیسور، اور بوگرا میں سرگرم عمل تھے۔ حصیر نوری، طارق بنارسی، صابر عظیم آبادی، عاطف بنارسی اس کے سرگرم ممبران تھے۔ حافظ دہلوی کے انتقال سے اس انجمن کی عملی رفتار ان دنوں سست ہے۔

بنگلادیش کے کہنہ مشق ادباء و شعرا کے علاوہ ۱۹۷۱ء کے بعد منظر عام پر آنے والے ارباب قلم کی فہرست طویل ہے۔ اگلے صفحات میں حتی الامکان قابل ذکر شاہیر ادب کی تفصیلی بیان پیش کرنے کی سعی کی جائے گی۔

Dhaka University Institutional Repository

عابد داناپوری

(۱۹۱۶ء - ۱۹۷۲ء)

مکمل نام عبدالمعبود عابد۔ تخلص عابد۔ ادبی حلقے میں عابد داناپوری کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۹۱۶ء میں ضلع پٹنہ موضع داناپور میں پیدا ہوئے[1]۔ والد حکیم عبدالرؤف داناپوری اپنے وقت کے مشہور عالم اور مصنف تھے۔ بقول وفا راشدی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کلکتہ ہی میں ان کا قیام رہا[2]۔ اس طرح عابد داناپوری کی پرورش کلکتے میں ہوئی ۔ کلکتہ بود و باش ہونے کی وجہ سے انہیں بنگلا زبان و ادب سے واقف ہونے کا خوشگوار موقع ملا۔ انہوں نے بنگلا شعر و ادب کی تاریخ کا مزید مطالعہ کیا اور اپنی اردو نثری تخلیقات میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

عابد داناپوری نے مدرسۂ عالیہ کلکتہ سے تعلیم مکمل کی تھی۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے ادبی و سیاسی سرگرمیوں سے وابستہ تھے۔ ۱۹۳۵ء میں اردو کے ہفت روزہ اخبار "کلکتہ ویکلی" کے مدیر معاون ہوئے۔ کچھ دنوں تک صحافت نگاری سے بھی شغف حاصل رہا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد ڈھاکا آ گئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ وہ آخری عمر تک اردو ادب کی خدمات میں منہمک رہے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۲ء کو ڈھاکے میں داعئی اجل کو لبیک کہا اور عظیم پور قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

عابد داناپوری کا شمار بنگلہ دیش کے ان ارباب علم و ادب میں ہوتا ہے جنہوں نے بنگلا اور اردو زبان و ادب میں اشتراک و اتحاد اور بنگلہ دیش کی زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی۔

عابد داناپوری شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ دونوں جگہ انہوں نے دیرپا اثرات چھوڑے۔

شاعری میں انہوں نے غزل نظم دونوں صنفوں پر طبع آزمائی کی۔ ان کی غزلوں میں روایت اور جدیدیت کا امتزاج ہے۔ بحور و قافیہ اور صنائع لفظی کے استعمال میں ان کی طرز نگارش روایتی ہے۔ لیکن تفکر اور موضوع کے انتخاب میں جدت سے کام لیا ہے۔ ان کی شاعری عشق و عاشقی کے فرسودہ خیالات تک محدود نہیں۔ اس میں تعمیر کردار و اخلاق اور جذبۂ قومی کی بیداری جیسی مفید موضوعات شامل ہیں۔ غزل میں ان کی سُردھیمی اور نظم میں موضوع کے

---

[1] مشرقی بنگال میں اردو ص ۲۸۷

[2] بنگال میں اردو، وفا راشدی ص ۲۰۴

Dhaka University Institutional Repository

مطابق جوش ولولہ ہے۔

عابد دانا پوری کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مسعود شہر یار لکھتے ہیں۔

" عابد دانا پوری کی شاعری میں گہری سوچ اور فکر کا پہلو خاصا نمایاں ہے۔ ان کی شاعری کا رجائی پہلو قاری کو سوچنے سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ ذرا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ شاعر کا تیور قابل غور ہے[1]"

میں اپنی منزل کا آپ مالک، میں اپنی جادہ کا آپ مالک
ہمارے رستے میں آ کے دیکھو کسی کا نقش قدم نہیں ہے

عابد دانا پوری نے شاعری یا نثر نگاری میں کسی کی تقلید نہیں کی۔ ان کا ایک انفرادی رنگ ہے جس کے وہ خود ہی خالق ہیں۔ جیسا کہ مذکورہ شعر میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے۔ لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ اقبال کی رجائی شاعری اور جوش و قاضی نذرالاسلام کی شاعری سے بلاواسطہ طور پر متاثر تھے۔ اس سلسلے میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جس میں نذرل اور جوش کا رنگ عیاں ہے۔

زمیں کا سینہ دھڑک رہا ہے فلک سے آواز آ رہی ہے
اُلٹ دو اب یہ بساط اُلٹ دو کہ زندگی مات کھا رہی ہے

ان کی نظم "تسخیرات" سے بطور نمونہ دو بند ملاحظہ ہوں :

ابھی تو نکہتِ بادِ بہار بدلی ہے
ابھی تو صورتِ لیل و نہار بدلی ہے
ابھی تو رحمتِ پروردگار بدلی ہے
اسی زمین پہ جنت ہمیں بتانی ہے
یہی زمین تو فردوس سے ملانی ہے
اسی زمین پہ تقدیر آزمانی ہے

نثر نگاری میں عابد نے مشرقی بنگال کی تاریخ اور جغرافیائی حالات کی عکاسی کرنے کے علاوہ بنگلا ادب کے

---

[1] مسعود شہر یار ص ۳۳۵

Dhaka University Institutional Repository

مشاہیر کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ قاضی نذرالاسلام اور انکی حیات اور کارناموں کے چند اہم گوشوں کو اردو داں طبقے سے روشناس کرانے کی غرض سے مضامین لکھے۔ ان کے یہ مضامین مختلف ادبی رسائل "ساقی" کراچی "ماہ نو" کراچی "دلربا" ڈھاکا "آب و گل" ڈھاکا وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ "ساقی" مشرقی پاکستان نمبر ۱۹۶۳ء میں ان کے چودہ مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مشرقی پاکستان کی داستان (۲) سُندربن (۳) مینا متی
(۴) مشرقی پاکستان کے نیم وحشی قبائل (۵) کھیدا (۶) بنگالی شعر و شاعری
(۷) مشرقی پاکستان کے گیت (۸) مشرقی پاکستان کے چار گیت (۹) قاضی نذرالاسلام کا بچپن
(۱۰) قاضی نذرالاسلام ڈراما نگار کی حیثیت سے (۱۱) جوٹ کی کہانی (۱۲) شاہ جلال یمنی
(۱۳) کوٹھی باڑی (۱۴) مشرقی پاکستان اور صوفیائے کرام

نثر میں عابد دانا پوری کا طرز تحریر صاف، سلیس اور رواں ہے۔ بیان میں پیچیدگی نہیں۔ ان کی تحقیق و تفتیش کی صلاحیت اچھی ہے۔ ان کے مضامین میں تنقیدی پہلو کا فقدان ہے۔ کہیں کہیں صحافیانہ رنگ در آیا ہے۔ لیکن موضوع بیان اور اسلوب بیان کی روانی نے اس پر پردہ ڈال دیا ہے۔

نمونۂ نثر:

"بنگالی ادب میں تمثیلی ڈراموں کی بنا ٹیگور نے ڈالی اور بلاشبہ نذرل کے ڈراموں پر ٹیگور کے اثرات بہت کافی ہے اور امکان یہ نذرل نے ٹیگور کی تقلید کی۔ یہی وجہ ہے کہ نذرل کے تمثیلی ڈراموں کے نثر کے حصے میں ٹیگور کا غنائیہ انداز جھلکتا ہے۔ لیکن حقیقی عمل تک نذرل کی رسائی اور پہنچ ٹیگور سے کہیں زیادہ جرأت مندانہ اور حقیقت پر مبنی ہے"

عابد دانا پوری کا کوئی شعری مجموعہ یا مضامین کا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ان کی نگارشات مختلف ادبی رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔

Dhaka University Institutional Repository

سلیم اللہ فہمی

(۱۹۰۶ء-۱۹۷۵ء)

نام - ابوالمکارم سلیم اللہ - فہمی تخلص - والد فہیم اللہ عربی اور فارسی کے عالم تھے - سلیم اللہ فہمی کی پیدائش سنہ ۱۹۰۵ء میں مٹیا برج میں ہوئی[1]۔ ان کا آبائی وطن رودلی شریف ضلع بارہ بنکی تھا۔ نواب واجد علی شاہ والئی اودھ کے ہمراہ آنے والے قافلے کے ساتھ بنگال آئے اور مٹیا برج میں سکونت اختیار کی۔

سلیم اللہ فہمی نے سنہ ۱۹۲۵ء میں پریسڈنسی کالج کلکتہ سے بی۔ اے آنرز فارسی اور سنہ ۱۹۲۸ء میں ایم۔ اے فارسی کا امتحان فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں بنگال سول سروس کے امتحان کے مقابلے میں مسلمانوں میں دوسرا اور عام مقابلے میں پانچواں درجہ حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے بعد سابق مشرقی پاکستان میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ "جائنٹ سکریٹری" حکومت پاکستان وزارت زراعت و خوراک بنگال سول سروس کے پہلے افسر جنہیں یہ عہدہ ملا۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے سابق مشرقی پاکستان میں بھرپور زندگی گزاری۔

سلیم اللہ فہمی اپنی کتاب "مشرق" کے دیباچے میں اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ۔۔۔۔ پیدائش، تعلیم و تربیت، روایات اور تشکیل مذاق کے اعتبار سے اس کتاب کا مصنف قطعی طور پر بنگالی اور بنگال ہی اپنا وطن جانتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا تین پشتوں سے اسی دنیا میں آباد ہے۔ اور یہ بھی کہ ۱۹۲۹ء سے اس وقت تک اس کا تعلق ایک ایسے سرکاری محکمہ سے رہا ہے جس میں رہ کر اسے بنگال کی زندگی کے ہر رخ کو اسے قریب سے دیکھنے کے مواقع حاصل رہے ہیں[2]۔

---

[1] اقبال عظیم نے فہمی کا سن پیدائش ۱۹۰۶ء لکھا ہے۔ فہمی کا شعری مجموعہ "ذوق سلیم" کے سرورق پر سنہ ۱۹۰۵ء درج ہے۔ ڈھاکے میں مقیم سلیم اللہ فہمی کی بیٹی خالدہ فہمی کے بیان کے مطابق "ذوقِ سلیم (شعری مجموعہ) میں ان کی مختصر حالات زندگی کے تمام تر بیانات صحیح ہیں۔

[2] سلیم اللہ فہمی۔ دیباچہ مشرق۔ مشرق کوآپریٹو پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ڈھاکا۔ سنہ ۱۹۵۲ء

Dhaka University Institutional Repository

اردو اہلِ قلم میں سلیم اللہ فہمی کی پہچان مؤرخ، نقاد، مترجم، مؤلف اور شاعر کی حیثیت سے ہے۔ لیکن ان کا اصل میدان شاعری ہے۔ جہاں ان کی فطری صلاحیت کو اجاگر ہونے کا موقع ملا۔

سلیم اللہ فہمی کا ادبی رجحان ادب برائے زندگی کا حامل ہے۔ انہوں نے تقاضائے وقت کے خاطر مضامین لکھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے نثری مضامین میں نفس مضمون کو اولیت کا درجہ دیا۔ حسبِ منشا حسن بیان کو اجاگر کرنے سے قاصر رہے۔ ان کا اسالیب بیان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ مسعود شہریار کا انہیں انشا پرداز کہنا مغالطہ ہے۔

تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان کے دونوں حصوں میں جو ذہنی اور تمدنی دوری تھی اسے رفع کرنے کی ایک مفید قلمی کوشش تھی کہ ملک کے دونوں بازوؤں کے ادب و کلچر کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ اس مفاد کو حتی الامکان کامیاب بنانے میں رفیع احمد فدائی، یونس احقر، احسن احمد اشک، افسر ماہ پوری، سعد میر، تمنا عمادی، وحید قیصر ندوی، سلیم اللہ فہمی پیش پیش رہے۔ فہمی کے زیادہ تر تحقیقی مضامین اور تراجم مشرقی بنگال کی تاریخی، تمدنی و ادبی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کا کتابچہ "مشرق" کے علاوہ ماہنامہ "ساقی" کراچی (مشرقی پاکستان نمبر) میں اشاعت پذیر مضامین کے عنوانات ان کی تخلیقی رجحان کے ترجمان ہیں۔ مثلاً "مشرقی پاکستان کا تمدن"، "کھیدا"، "پرانا قلعہ (ڈھاکا)"، "مشرقی پاکستان میں اردو شاعری کے تیرہ سال"، "نذرالاسلام اور اردو داں طبقہ"، "خالد بنگالی"، "فارسی کا اثر بنگلا پر" اس نوع کے مضامین ہیں۔

سلیم اللہ فہمی کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

مشرق :۔ مطبوعہ مشرق کوآپریٹو پبلیکیشنز لمیٹڈ ڈھاکا۔ ۱۹۵۲ء

۱۳۶ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ سابق مشرقی پاکستان (بنگلادیش) کی ادبی، ثقافتی، تہذیبی تاریخ پر یارہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جو ۵۰ء سے ۵۲ء تک مختلف وقتوں میں ڈھاکا ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی جا چکی ہیں۔ نفس مضمون کے لحاظ سے یہ کتابچہ نہایت مفید ہے۔ زبان آسان اور عام فہم استعمال کی ہے۔ "تمدن"، "چاٹگام ہل ٹریکٹ"، "نذرالاسلام کی شاعری کا پس منظر"، "خالد بنگالی" اہم مضامین ہیں۔

عمرِ خیام :۔ مطبوعہ آل پاکستان ریسرچ اکاڈمی کراچی۔ ۱۹۶۱ء

Dhaka University Institutional Repository

یہ کتابچہ سلیم اللہ فہمی کی تحقیقی تالیف ہے۔ عمر خیام کی سوانح اور رباعیات کے علاوہ عمر خیام کے قلمی نسخوں کا محققانہ اور ناقدانہ جائزہ پیش کیا ہے

ذوقِ سلیم مطبوعہ بقائی فاؤنڈیشن کراچی۔ ۱۹۹۰ء

یہ شعری مجموعہ ایک حمد، ایک نعت، ۴۳ غزلیں ۲۵ نظموں اور چند قطعات پر مشتمل ہے تین منظوم تراجم بھی شامل ہیں۔ بنگلادیش کے شعری ذخائر میں یہ ضخیم مجموعہ قابلِ قدر ہے۔

مترجم کی حیثیت سے سلیم اللہ فہمی کا درجہ غیر معمولی ہے۔ انہوں نے متعدد فارسی، انگریزی و بنگلا تخلیقات کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ اس سلسلے میں عمر خیام کے فارسی رباعیات، امیر خسرو کی فارسی نظموں اور قاضی نذرالاسلام کی بنگلا نظموں اور گیتوں کے منظوم اردو تراجم ان کی مفید خدمات ہیں۔ انہیں ترجمہ کرنے کا بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان تراجم میں انہوں نے حتی الامکان اصل کی روح کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔

برصغیر کے اردو شعرا میں سلیم اللہ فہمی کا شمار معیاری شعراء کی فہرست میں ہے۔ وہ فطری شاعر تھے۔ شاعری ان کا نشہ تھا۔ فہمی کی شاعری میں دراصل ان کی شخصیت اور سیرت کی آئینہ داری ہے۔ انہوں نے حمد، نعت، نظم، مسدس، قطعات، غزل اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کا اصل میدان غزل ہے۔ اس میدان میں وہ جگر مرادآبادی سے قریب رہنے کے علاوہ وحشت کلکتوی کے حلقہ تلامذہ میں شامل تھے۔ لہذا ان کی شاعری میں دونوں شعراء کے اثرات ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی انداز میں صاف ستھری غزلیں لکھی ہیں۔ وحشت کی پیروی کی وجہ سے ان کی غزلوں میں کہیں کہیں غالب کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن ان کے زیادہ تر اشعار مومن دہلوی اور میر تقی میر کا رنگ نمایاں ہے۔ عشق و عاشقی کے بیان میں دہلی کی داخلیت جھلکتی ہے بحریں چھوٹی زبان عام فہم لیکن معیاری ہے۔

نمونۂ کلام:

لاکھ آنسو امڈ کے آتے ہیں — ہم بہر حال مسکراتے ہیں
دوست ہمدرد یاں جاتے ہیں — اور ہم دل میں مسکراتے ہیں
جو ہمیں یک قلم بھلا بیٹھے — وہی ہر لحظہ یاد آتے ہیں
وہی سوتے ہیں پاؤں پھیلا کر — جو تمنا سے ہاتھ اٹھاتے ہیں

Dhaka University Institutional Repository

نہ سنے گا نہ کوئی سمجھے گا : گیت ناحق سلیم گاتے ہیں[1]

فہمی کے یہ اشعار مومن کے رنگ میں ہیں:

ترے تلوّنِ بے جا سے کیا نہیں ہوتا
زوالِ شوق کہ خونِ وفا نہیں ہوتا

بس ایک وعدہ تمہارا وفا نہیں ہوتا
وگرنہ عالمِ امکاں میں کیا نہیں ہوتا

ترے بغیر نہیں لطفِ مے کشی ساقی
شرابِ ناب میں بھی کچھ مزہ نہیں ہوتا

سلیم اچھا ہے مشقِ سخن رہے جاری
ترا کلام سُنا ہے، برا نہیں ہوتا[2]

نمونۂ نثر:

"مشرقی بنگالہ کو قدرت نے حسین سے حسین بنانے کی شروع ہی سے کوشش جاری رکھی ہے۔ دریاؤں اور ندیوں کا ایک جال ہے جو سارے خطے پر بچھا ہوا ہے جن پر طرح طرح کی خوبصورت کشتیاں، رنگ برنگ کے بادباں پھیلائے بل کھاتی ندیوں پر اٹھلاتی منگاہوں کا خراج لیتی بل کھاتی گزرتی رہتی ہیں۔ ناریل، کیلے اور سُپاری کے درخت ہر طرف لہلہاتے ہیں۔ ان کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی جھوٹی جھوٹی بستیاں نئی نویلی دلہنوں کی طرح لجائی لجائی نظر آتی ہیں۔ دھان کے کھیت میں ہوا سے جو ہلکورا پیدا ہوتا ہے، وہ ایک عجیب دلفریب منظر پیش کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جس طرح اوپر ایک نیلا آسمان فضا پر پھیلا ہوا ہے اسی طرح ایک سبز آسمان زمین پر اُتر آیا ہے"[3]

---

[1] سلیم اللہ فہمی، ذوقِ سلیم ص ۱۹۳

[2] ایضاً ص ۶۷ [3] سلیم اللہ فہمی "مشرق" ص ۵۹

Dhaka University Institutional Repository

سلیم اللہ فہمی کی ایک مخصوص تعریف یہ ہے کہ وہ بنگال اور بنگالی ادب کے شیدائی تھے۔ ان کی قلمی خدمات اردو و بنگلا دونوں زبانوں میں قابل ذکر ہیں۔ ملازمت کے دوران سابق مشرقی پاکستان (بنگلادیش) کے جس گوشے میں بھی گئے وہاں شعر و ادب کا چراغ روشن کیا۔ انہیں اپنے وطن اور زبان سے جنون کی حد تک پیار تھا۔ وہ پاکستان کے دونوں حصوں کی زبان و ادب کے فروغ کے خواہاں تھے۔

انجمن ادب مشرقی پاکستان کے زیر اہتمام انسٹی ٹیوٹ آف انجینیرز کی عمارت میں ۱۹۶۱ء میں منعقد ہونیوالی لٹریری کانفرنس میں بیگم صوفیہ کمال اور سلیم الدین نے اپنی تقریروں میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے اردو و بنگلا ادیبوں کے اتحاد پر زور دیکر کہا تھا "اردو و بنگلا ادباء کے درمیان قرابت ضروری ہے"[1]۔ فہمی نے اپنی تقریر میں اس قول کی حمایت کی تھی۔

فہمی اردو و بنگلا ادب کی بہبودی چاہنے والے پرخلوص شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے ۲۴ دسمبر ۱۹۷۵ء سوموار کی رات کو اپنی رہائش گاہ "مٹیا برج ہاؤس مگ بازار ڈھاکا میں انتقال کیا۔ انا للہ.....

---

[1] ماہنامہ "ہم قلم" کراچی۔ مئی ۱۹۶۱ء۔ ص ۸۰

Dhaka University Institutional Repository

آصف بنارسی

(۱۹۰۱ء - ۱۹۷۷ء)

عبدالرحمٰن نام - آصف تخلص - والد کا نام مولوی عبدالشکور تھا - ۳۰ دسمبر ۱۹۰۱ء کو محلہ چاہ مہمان بنارس میں پیدا ہوئے[1] ان کے والد تجارت کے سلسلے میں مغربی بنگال آئے اور کلکتے کو اپنا مسکن ثانی بنایا - اس لحاظ سے آصف کی پرورش کلکتے میں ہوئی - آصف کو طالبعلمی کے زمانہ ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا - ۱۹۲۰ء میں باقاعدہ شاعری شروع کی - ابتدا میں واقف بہاری سے مشورہ سخن کرتے تھے - بعد میں وحشت کلکتوی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا[2] - وحشت کے حلقۂ تلامذہ میں آصف کو اعلیٰ درجہ حاصل تھا - وحشت کی سرپرستی نے آصف کے فطری شاعرانہ ذوق و تخیل کو جلا بخشی اور بہت جلد ان کا شمار کلکتہ کے اساتذہ میں ہونے لگا - ۱۹۵۰ء میں آصف سابق مشرقی پاکستان تشریف لے آئے اور ڈھاکے میں مستقل رہائش اختیار کی - آصف کو خود نمائی پسند نہیں تھی - انہوں نے درویشانہ خاموش زندگی گزاری اور ۳۰ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ڈھاکے میں انتقال کیا - عظیم پور قبرستان میں دفن کئے گئے[3]

علامہ وحشت کی خواہش پر انہوں نے دیوان شمس کی ترتیب کا کام نوعمری ہی میں انجام دیا - آصف کا مرتب کردہ دیوان شمس ۱۹۲۰ء میں کلکتے سے شائع ہوا[4]

آصف کی ادبی سرگرمیوں میں "بزم آصفی" کو اردو ارباب قلم میں بڑی اہمیت حاصل رہی - غالباً ۱۹۲۹ء میں آصف کے شاگردوں نے آصف کی نگرانی میں اس بزم کی بنیاد ڈالی تھی - جو بعد میں آصف کے ساتھ ڈھاکے میں منتقل ہو گئی - وحشت جبتک زندہ رہے اس بزم کی سرپرستی کرتے رہے - وحشت کی وفات کے بعد آصف اس کے سرپرست رہے -

آصف بنارسی کے حلقۂ تلامذہ کی فہرست طویل ہے - ان کے شاگردوں کو متحد رکھنے میں بزم آصفی کا تعاون حاصل رہا - چند قابل ذکر تلامذہ کے نام یہ ہیں - پروفیسر اختر حسین اختر، پروفیسر غلام سرور غنی کشفی آصفی، میکش آصفی، عطا آصفی، ہاشم آصفی، شاد آصفی، اختر آصفی پشاوری، رضا ابن آصف، نیر آصفی، پروفیسر جہاں آرا چودھری، شفیق احمد شفیق، عثمان غنی شاداں، محمد قاسم مونس، مدن لال آباد

---

[1] مشتاق احمد، بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء، مطبوعہ ستارہ ہند پریس پرائیوٹ لمیٹڈ بنیا پوکھر لین کلکتہ ۱۹۷۲ء ص ۲۲

[2] مشرقی بنگال میں اردو - ص ۳۱۸

[3] سرگذشت آصف، ہارون الرشید، مغربی بنگال اردو اکاڈمی کلکتہ ۱۹۸۳ء ص ۲۴

Dhaka University Institutional Repository

مارواڑی وغیرہ۔

آصفؔ قادرالکلام شاعر تھے۔ فن عروض پر انہیں مہارت تھی ۔۔۔ اسی بنا پر ان کے اشعار فنّی خامیوں سے پاک ہیں۔ وہ پرانے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا طبعی رجحان اسلام پسند تھا۔ انہوں نے حمد، نعت، نظم، غزل سب ہی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں ندرت بیان، معاملاتِ حسن و عشق اور تصوف کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ کہیں کہیں شوخی اور رندی کے پہلو بھی نمایاں ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کی شوخی میں دہلی کی متانت ہے۔ ان کا کلام ابتذال سے پاک ہے۔ بندش الفاظ کی خوبی، تسلسل اور زورِ بیان ان کی نظموں کی خاص خصوصیات ہیں۔

نمونۂ غزل۔

درد بنا احساس سمٹ کر
داغ ہے دل پر دل کے برابر

آئے اثر کیا خاک دُعا میں
ہوتی ندامت کاش گنہ پر

ہم بھی وہاں ہو آئے آخر
اہلِ نظر کی آنکھ بچا کر

دل کی بدولت گرم ہے محفل
شیشہ نہ ساقی بادہ نہ ساغر

آصفؔ اب تک ہوش نہیں ہے
چوٹ لگی ہے ایسی دل پر[1]

ع نہ کرم یاد رہے اور نہ ستم یاد رہے
اب تو اے کاش یہی طبع کی افتاد رہے

---

[1] ششماہی "قلم کار" ڈھاکا۔ (نگراں احسن احمد اشکؔ) جنوری ۱۹۶۱ء ص ۹۸

Dhaka University Institutional Repository

آنکھ کھلتے ہی ہوئے خوفِ اسیری میں اسیر
یعنی اک پل بھی نہ ہم رنج سے آزاد ہوئے
ہم کو مطلوب بہر حال خوشی تھی تیری
تو نے جس حال میں رکھا ہمیں ہم شاد رہے
ہم کچھ اس طرح رہے بزمِ جہاں میں آصفؔ
جس طرح شمع سرِ رہ گزرِ باد رہے[1]

نمونۂ رباعی :

خود مشکلیں اپنے لئے پیدا نہ کرے
خواہش تو کرے خواہشِ بیجا نہ کرے
آساں نہیں تکمیلِ تمنّا آصفؔ
بہتر ہے کہ انسان تمنّا نہ کرے

مزاحیہ اشعار :

جوانی میں پینے سے انکار آصفؔ
یہ کفرانِ نعمت مسلمان ہو کر

عمر بھر گوشۂ مسجد میں ادا کی ہے نماز
پائے ساقی پہ بھی اک سجدۂ شکرانہ سہی[2]

---

[1] "شش ماہی" قلم کار" ڈھاکا (نگراں احسن احمد اشک۔ جنوری ۱۹۶۱ء ص ۹۹

[2] سرگزشت آصفؔ، ص ۸۵

Dhaka University Institutional Repository

اشک بنارسی

(۱۹۱۶ء - ۱۹۸۰ء)

خاندانی نام شیخ محمد امین الرحمٰن۔ تخلص اشک۔ ولادت بنارس میں ۱۹۱۶ء کو ہوئی۔ آبائی وطن گوالیار (راجپوتانہ) تھا۔ والد شیخ محمود الرحمٰن بنارس میں رہتے تھے۔[1] اشک کی تعلیم پرائمری اسکول میں ہوئی انہوں نے کسی تعلیمی ادارے سے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی۔ ان کی علمی معلومات کثرت مطالعہ اور اردو شعر و ادب کے ماحول کا نتیجہ تھا۔

اشک کی شعر گوئی کا آغاز غزل سے ہوا۔ رفتہ رفتہ نعت، منقبت، قصیدہ، نظم، ترانہ، نوحہ، مرثیہ پر بھی طبع آزمائی کی۔ فلمی گانے اور قوالی بھی تحریر کئے۔

اشک ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے سابق مشرقی پاکستان آئے اور اسے اپنا وطن ثانی بنایا۔ شعر و شاعری کے علاوہ اشک یہاں کی ادبی سرگرمیوں سے بھی منسلک رہے۔ انہوں نے "بزم احباب" کے نام سے ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس کے پہلے صدر حافظ دہلوی تھے۔ بعد میں یہ ذمہ داری مولوی محبوب پر عائد کی گئی اور حافظ دہلوی حلقہ فکر و دانش کے صدر ہوئے۔

اشک روایتی شاعر تھے۔ ان کی شاعری روایتی شاعری ہے۔ مگر انہوں نے جدید فکری رجحان سے بھی فائدہ اٹھایا۔ شعر گوئی میں وہ غالب اور یگانہ سے متاثر تھے۔ جیسا کہ ان کے شعر سے ظاہر ہے۔

اشک غالب ہوں یا یگانہ ہوں
میری نظروں میں دونوں ہیں استاد

اشک نے ۱۹۸۰ء میں ڈھاکے میں انتقال کیا۔ ان کا شعری مجموعہ "روح شاعر" بزم ادب ڈھاکا سے شائع ہوا۔ اس میں اشک کی نظمیں، غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔ لیکن سن طبع درج نہیں۔ اشک کی نظموں میں غزل کی نغمگی ہے۔

نمونہ کلام:

جس قدر تم پہ وہ کریں افتاد
دیتے جاؤ انہیں مبارکباد

---

[1] نجم و شرر، شعری مجموعہ۔ پیش کردہ حلقہ فکر و دانش۔ ص ۱۱۱

Dhaka University Institutional Repository

باغباں کی یہ کیسی سازش ہے
اہل گلشن کو کر دیا برباد
بلبلو! تم دعائے خیر کرو
دام میں پھنس گیا ہے خود صیّاد[1]

قطعہ

حاصل نہیں ہے جس کو صداقت کی بانسری
پیدا کہاں سے ہوگی کشش ان کے راگ میں
اہل سخن کی کیا وہ بجھائیں گے تشنگی
جو خود ہی جل رہے ہیں تعصب کی آگ میں[2]

---

[1] بحر و شرر، ص ۱۱۵
[2] روحِ شاعر

Dhaka University Institutional Repository

نیّر احمری

(م — ۲۰ر جون ۱۹۸۰ء - چاٹگام)

مکمل نام طفیل احمد۔ تخلص نیّر ہے۔ موصوف کا تعلق ضلع بارہ بنکی (یو پی) سے تھا۔ مگر زندگی کا کچھ حصہ رنگون (برما) میں گزرا۔ ۱۹۶۲ء میں برما سے چاٹگام آ گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ نیّر احمری کے استاد احمر رنگونی تھے۔ استاد کی نسبت سے وہ اپنا قلمی نام نیّر احمری لکھا کرتے تھے۔[1]

نیّر احمری کا شمار چاٹگام کے اردو ارباب محفل میں ہوتا ہے۔ وہ چاٹگام کے اردو ادبی سرگرمیوں سے منسلک رہے۔ انہوں نے اصغر راہی کے ساتھ مل کر چاٹگام میں ایک ادبی ادارے "حلقہ اہل قلم" کی بنیاد رکھی تھی۔ انہیں اردو شعر و شاعری سے شغف رہا ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ان کے کلام مختلف ادبی رسالوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

نمونہ کلام یہ ہے:

ترے چمن کی فضا کیا ہو سازگار مجھے : کہ اب تو موسم گل بھی ہے ناگوار مجھے
جنون و عشق و وفا کی پیمبری کے لئے : وہ منتخب کئے جاتے ہیں بار بار مجھے

راکھ کے نیچے دبی چنگاریاں کچھ کم نہیں — آگ زندہ ہو تو بھڑکانے میں کتنی دیر ہے
پوچھتا تھا اک اک سے شب غم بار بار — اور اب سورج نکل آنے میں کتنی دیر ہے

نیّر احمری کا انتقال ۱۹۸۰ء مطابق ۱۴ شعبان ۱۴۰۰ھ چاٹگام میں ہوا۔[2]

[1] بہ زبانی نوشاد نوری (مرحوم) ۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۳ء

[2] ایضاً

Dhaka University Institutional Repository

حسن آرا عرف رئیسی بیگم

(م - ۱۹۸۲ء)

نام حسن آرا۔ عرفیت رئیسی بیگم۔ والد شیر بنگلا ا ے۔ کے فضل الحق۔ بنگال کے مشہور و معروف شخصیت تھے۔ والدہ خورشیدی بیگم نواب سید محمد آزاد کی صاحبزادی تھیں[۲]۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ رئیسی بیگم کی خالہ زاد بہن ہوتی تھیں[۳]۔

رئیسی بیگم کی مادری زبان اردو تھی۔ ان کا خاندان علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ رئیسی بیگم کو اردو و بنگلا کے علاوہ فارسی و عربی سے بھی واقفیت تھی۔ بنگال کی اہل قلم خواتین میں رئیسی بیگم شاعرہ اور مضمون نگار کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں۔ راقمہ کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل رہا۔ بڑی شستہ اردو بولتی اور لکھتی تھیں۔ نہایت افسوس ہے کہ ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

نثر میں ان کا اسلوب تحریر صاف، سلیس اور مولویانہ ہے۔ ان کے مضامین اخلاقی اور دینی ہیں۔ رئیسی بیگم کے شوہر[۴] محمد خلیل الرحمٰن بن اسحٰق (بردوانی) کا کتابچہ "نظام فقر" کا افتتاحیہ رئیسی بیگم نے سادہ و سلیس زبان میں لکھا ہے بطور نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔

> "یہ کتاب "نظام فقر" جو دراصل نظام اسلام کی اصلی اور حقیقی شکل ہے۔ اسلام کی معاشی زندگی کی درستگی کے ساتھ ایک مسلمان کی سچی اسلامی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام تر اصلاحات و فلاحات کی ضامن ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے سوائے کور باطن اور بد نفس طبیعتوں کے کوئی محروم نہیں رہ سکتا۔ کتاب اللہ پاک اور تمام احادیث اور تمام اصلاحی و فلاحی نکتوں سے مالا مال یہ ایک ایسی چیز ہے جسے عرف عام میں نسخۂ اکسیر کہنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔"[۵]

رئیسی بیگم نے ۱۹۸۲ء میں ڈھاکے میں انتقال کیا اور ڈھاکے ہی میں تارا مسجد سے ملحق قبرستان میں دفن ہوئیں۔

---

[۱] محمد عبداللہ۔ "ڈھاکہ بشو بیدالوئے پتریکا"، مطبوعہ اکتوبر ۱۹۸۵ء ص ۲۶۶

[۲] نواب سید محمد آزاد (۱۸۴۷ء - ۱۹۱۷ء) اودھ پنچ کے مشہور نامہ نگار تھے۔

[۳] بیگم شائستہ اکرام اللہ کا زبانی بیان ۵ ستمبر ۱۹۹۹ء۔

[۴] محمد خلیل الرحمٰن بن اسحٰق، رئیسی بیگم کے شوہر

[۵] نظام فقر، محمد خلیل الرحمٰن بن اسحٰق (بردوانی) مطبوعہ ستارہ پاکستان پریس ڈھاکا ۱۹۶۸ء

Dhaka University Institutional Repository

جہاں آرا چودھری

(۱۹۲۱ء - ۱۹۸۴ء)

جہاں آرا چودھری کے آباء و اجداد ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں خراسان سے ہجرت کر کے مغربی بنگال آئے اور مالدہ میں آباد ہو گئے۔ ان کے والد شاہ محمد احسن خراسانی محکمۂ پولیس میں افسر تھے۔ ملازمت کے دوران انہیں مختلف شہروں کا دورہ کرنا پڑا۔ جہاں آرا چودھری ۱۹۲۱ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم سخاوت میموریل گرلز اسکول کلکتہ میں ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں کومیلا (مشرقی پاکستان کا ضلع) کے ایک معزز گھرانے میں نور اللہ چودھری سے بیاہی گئیں۔ ۱۹۵۰ء میں اپنے شوہر کے ہمراہ ڈھاکا آئیں اور مستقل سکونت اختیار کی۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے شوہر اچانک ہارٹ فیل کر گئے۔ جہاں آرا کے لئے یہ وقت بڑا کٹھن تھا۔ اس مصیبت سے وہ گھبرائیں نہیں بلکہ انہوں نے ہمت اور قوت ارادی سے کام لیا۔ مرحوم اپنے پسماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑ گئے تھے۔ ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری جہاں آرا کے سر عائد ہو گئی تھی۔ اپنے فرائض کو انہوں نے نہایت عقلمندی اور فراخدلی سے انجام دیئے۔ جہاں آرا چودھری نے ۱۹۶۲ء میں ڈھاکا بورڈ سے پرائیوٹ ایس۔ ایس سی کا امتحان اور ۱۹۶۴ء میں ایڈن گرلز کالج ڈھاکا سے آئی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر ۱۹۶۷ء میں ڈھاکا یونیورسٹی شعبۂ اردو و فارسی اردو میں آنرز اور ۱۹۶۸ء ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۶۹ء میں چاٹگام گرلز کالج میں جہاں آرا کا اردو لیکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ بعد میں ان کا تبادلہ جگناتھ کالج ڈھاکا میں ہو گیا۔ آخر دم تک اس کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہیں۔ ۱۵ مارچ ۱۹۸۴ء بروز جمعرات ان کا انتقال ہوا اور ربانی قبرستان میں سپرد خاک ہوئیں۔

بنگلہ دیش کی مقبول شاعرات و افسانہ نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جہاں آرا بڑی ذہین اور شریف النفس خاتون تھیں۔ بچپن ہی سے انہیں اردو ادب سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔ ان کی بیٹی نفیسہ جمال کے بیان کے مطابق وہ بارہ سال کی عمر سے بچوں کے لئے کہانیاں اور نظمیں لکھا کرتی تھیں۔ جو اس وقت بچوں کا رسالہ "پھول" دہلی میں شائع ہوتی رہیں۔ اس کے علاوہ موصوفہ، مولانا راشد الخیری کا مشہور رسالہ ماہنامہ عصمت اور بنات کی مستقل قلم کار تھیں۔ انہوں نے اپنی ادبی تخلیقات پر (۹ سال) خاتون اکرم عصمی سے انعامات بھی حاصل کئے۔[1]

---

[1] ماہنامہ عصمت کراچی۔ ۶۰ سالہ جوبلی نمبر ستمبر ۱۹۶۸ء ص ۴۴۹

Dhaka University Institutional Repository

جہاں آرا نے نظموں اور کہانیوں کے علاوہ مقالے بھی لکھے۔ ان کی تخلیقات زیادہ تر اصلاحی اور مقصدی ہیں انہوں نے سماج میں رواج پا جانے والی برائیوں کو سبک لہجے میں عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظموں میں کہیں کہیں اسلام کے تاریخی واقعات و برگزیدہ ہستیوں کا بیان ملتا ہے۔ نثر میں ان کا انداز بیان سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ خلوص اور درد ان کی نظموں کی خصوصیات ہیں۔

نمونۂ کلام:

پھر اٹھ رہے ہیں ہاتھ دعاؤں کے واسطے
بہتا ہے خون دل کا پھر آنکھوں کی راہ سے
منزل ہے، کون سی ہے جہاں میرِ کارواں
کیوں گردِ کارواں میری آنکھوں کا ہے دھواں
چلنا ہے اس کے نقشِ قدم پر چلیں گے ہم
کرنے کو جو کچھ اس نے کہا ہے کریں گے ہم

(کشتیٔ نسواں کا خواب)

ان کی کہانی "لالٹین" سے بطور مثال ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"....حق اور ناحق کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ نہ تو بزرگوں کا ادب ہے اور نہ چھوٹوں شفقت کی نگاہ! پرانے لوگوں کو تو اپنی وضعداری کا بڑا پاس ہوتا تھا۔ مگر ان باتوں کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اخلاق سے ناآشنا، مذہب سے لاپرواہ، دھوکہ اور فریب کا بازار گرم ہے۔ رشوت جائز قرار دی جا چکی ہے۔ اپنے ایک پیسے کے فائدے کی خاطر دوسروں کا ہزاروں کا نقصان ہو جائے کوئی پرواہ نہیں۔ سچائی دم توڑ رہی ہے۔ نااہلوں کا راج ہے۔"[1]

---

[1] ماہنامہ "عصمت" کراچی۔ نومبر ۱۹۶۸ء ص ۱۷

نوٹ: جہاں آرا چودھری کی حالات زندگی ان کی بیٹی پروفیسر نفیسہ جمال (شعبہ انگریزی ڈھاکا یونیورسٹی) سے معلوم ہوئیں۔

Dhaka University Institutional Repository

ابو محمد فیض چودھری

(۱۹۱۷ء - ۱۹۸۸ء)

مکمل نام ابو محمد فیض چودھری - ادبی نام فیض چودھری - والد کا نام امیر الزمان چودھری تھا۔ ولادت یکم اپریل ۱۹۱۷ء موضع پوکوریا۔ تھانہ بانس کھالی چاٹگام میں ہوئی۔ فیض ۱۹۳۳ء میں کلکتہ عالیہ مدرسہ سے فاضل اور ۱۹۳۸ء میں معلم گورنمنٹ ہائی سکول چاٹگام سے میٹرک اور ۱۹۴۰ء گورنمنٹ اسلامیہ کالج چاٹگام سے آئی۔ اے کے امتحانات بہ ترتیب امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ۱۹۴۳ء میں شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز فارسی اور ۱۹۴۵ء میں ایم۔ اے فارسی کے امتحانات میں اوّل درجے اوّل آئے۔ ۱۹۵۵ء انہوں نے اسی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی سند حاصل کی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں تہران یونیورسٹی سے جدید فارسی زبان میں ڈپلوما حاصل کیا۔[1]

ان کی ادبی خدمات اردو و فارسی کے علاوہ بنگلہ زبان سے بھی منسلک ہیں۔ ان کے اردو و فارسی مضامین مختلف معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۶۹ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے طویل چھٹی لیکر دو سال تک چاٹگام یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات سے بھی وابستہ رہے۔ بنگلا اکاڈمی میں "پربھاشا" سب کمیٹی کے وہ اہم رکن تھے۔ فیض چودھری ۱۷-۱۲-۱۹۷۱ سے ۳۰-۴-۱۹۷۴ تک شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی کے صدر رہے۔ اس شعبے کی بقا و بحالی کے سلسلے میں ان کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے حسن تدبر سے ۱۹۷۱ء میں اسے غرق ہونے سے بچا لیا۔ اس وقت انقلاب بنگلادیش کے نامساعد حالات سے مجبور ہو کر بیشتر اساتذہ اہل زبان پاکستان ہجرت کر چکے تھے۔ جو یہاں رہ گئے تھے اپنے سر کو بچائے گوشہ نشین تھے۔ اس نازک حالات میں باد مخالفت کا مقابلہ فیض چودھری نے مستقل مزاجی سے کیا۔ شعبے میں بنگالی نژاد اردو اساتذہ کا تقرر کر کے اس کی مردہ رگوں میں زندگی کی روح پھونکی۔ ۱۹۷۴ء میں وہ معاون پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے ڈھاکا میں رحلت فرمائی اور اپنے آبائی وطن چاٹگام میں پیوند خاک ہوئے۔

ان کی تصنیفات یہ ہیں:- "بنگلا اردو ڈکشنری" کی تین جلدیں (مرتب) بنگلا اکاڈمی، ڈھاکا ۱۹۶۳ء

سکندر نامہ (ترجمہ بنگالی)

نیا اردو قواعد:

اس کے علاوہ انہوں نے اردو و فارسی زبان و ادب سے متعلق مفید مضامین سپرد قلم کئے۔ جو مؤقر رسائل میں شائع ہوئے۔

[1] ذاتی فائل، مملوکہ ڈھاکا یونیورسٹی رجسٹرار آفس

Dhaka University Institutional Repository

حکیم محمد اسمٰعیل ہلالی

(۱۹۱۷ء - ۱۹۸۸ء)

نام محمد اسمٰعیل۔ تخلص ہلالی۔ حکیم اور قاری لقب۔ ۱۹۱۷ء میں موضع تالکاؤں۔ یونین جنوتی۔ سات کانیہ (چاٹگام) میں پیدا ہوئے۔ والد شاہ محمد عبدالمجید ہنگلی مدرسے کے استاد تھے۔

ہلالی نے دارالعلوم عالیہ مدرسہ چاٹگام سے فاضل، عالیہ مدرسہ کلکتہ سے کامل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد دیوبند اور سہارنپور میں کچھ عرصہ مزید تعلیم حاصل کی۔ پھر تکمیل طب کالج لکھنو سے فاضل الطب والجراحت کا امتحان اعلیٰ درجے سے پاس کیا۔ انہوں نے امرکن ہومیوپیتھک کالج لکھنو سے ہومیوپیتھک میں بھی سند حاصل کی تھی۔ بنگالی نژاد ہونے کے باوجود ہلالی کا رجحان اردو کی طرف مائل تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ ہے کہ مدرسوں میں ان کی ذریعہ تعلیم اردو رہی۔ دیگر وجہ یہ ہے کہ دیوبند اور سہارنپور میں قیام کے دوران اعلیٰ اردو شخصیتیں مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا اشرف علی تھانوی و جگر مرادآبادی سے قربت کا شرف حاصل رہا۔ جس نے ان کے مزاج کو اردو قالب میں ڈھال دیا۔ اور ان کی پہچان بنگلادیش کے دبستان اردو میں "خادم اردو" کی حیثیت سے ہوگئی۔ چاٹگام میں مقیم موصوف کے صاحبزادے ہمایوں ہلال کے قول کے مطابق[1] ہلالی کسی اہل زبان سے اپنا تعارف ان الفاظ میں کراتے تھے۔"

"یہ ہلالی ہے۔ میری فطرت اس خاک چاٹگام سے بنی ہے لیکن میں اردو کا بھی دلدادہ ہوں"

پیشہ کے لحاظ سے ہلالی حکیم تھے۔ پہلے "خنجر دواخانہ" کے نام سے چاٹگام میں ایک دواخانہ (مطب) کھولا پھر ۱۹۶۷ء میں طبیہ کالج کی بنیاد رکھی۔ اور اس کالج کے پرنسپل کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ اس زمانے میں چاٹگام میں مقیم اردو شعراء و ادباء مثلاً اصغر راہی، شوق شاکری، اقبال عظیم وغیرہ کی ان کے مطب میں پر لطف محفل جمی رہتی تھی[2]۔

ہلالی نے کچھ دنوں تک انجمن ترقی اردو چاٹگام کے صدر کی حیثیت بھی فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۶۸ء میں سابق مشرقی پاکستان میں اردو اور بنگلا زبان میں نفاق زور پکڑ رہا تھا۔ انہوں نے انجمن ترقی بنگلا و اردو (موخات) کے نام سے ایک تنظیم تشکیل دی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ بنگلا کے ساتھ گھل مل کر اردو کا ارتقا بھی جاری رہے۔ ترقی زبانِ اردو کے حق میں ان کی یہ بڑی مفید پالیسی

---

[1] چاٹگام میں مقیم حکیم ہلالی کے صاحبزادے ہمایوں ہلالی نے یہ تمام معلومات بہم پہنچائیں۔ مورخہ ۵ اگست ۱۹۹۲ء

[2] روزنامہ "انقلاب (بنگلا روزنامہ) ڈھاکہ ۲۶ نومبر ۱۹۹۳ء

Dhaka University Institutional Repository

تھی۔ ۱۹۷۱ء تک چاٹگام میں ہر ممکن طریقے سے اردو زبان ادب کی خدمت میں کوشاں رہے۔ چاٹگام کے علاوہ دوسرے اردو مراکز کے بھی ہر ادبی نشست و مشاعرے میں حتی الامکان شرکت کی کوشش کرتے تھے۔ اپنی ذاتی زندگی میں بڑے ملنسار، خوش اخلاق اور مجلسی آدمی تھے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے انہیں "رونقِ محفل" کا خطاب عطا کیا تھا۔[1]

ہلالی زبانِ اردو پر اس لئے فریفتہ تھے کہ اس زبان میں تبلیغ اسلام کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ نثر ہو یا نظم ہر جگہ ان کا بنیادی تصور اسلام ہے۔ ان کے اشعار میں مولویانہ رنگ غالب ہے۔ ان کی شعر گوئی کی ابتدا نعت گوئی سے ہوئی انہوں نے اپنی پہلی نعت پر اصلاح جگر مرادآبادی سے لی۔ جگر نے ان کی ہمت افزائی کی۔ اس کے بعد سے وہ برابر جگر مرادآبادی سے مشقِ سخن میں اصلاح لیتے رہے۔

شعر و شاعری کے علاوہ ان کے مقالات مختلف روزنامے و رسالے مثلاً روزنامہ "پاسبان" (ڈھاکا) پیامِ مشرق (چاٹگام) "دورِ جدید" (رنگون) جنگ (کراچی) میں شائع ہوتے رہے۔

ہلالی نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو اپنی رہائش گاہ "ہلال منزل" سات کانیہ (چاٹگام) میں رحلت فرمائی اور بیت خدا جامع مسجد سات کانیہ کے احاطے میں دفن ہوئے۔[2]

بہ یک لمحہ مجسم عرش پہ جاتے اور آتے ہیں
تری رفتار کی گرمی کہاں بجلی میں پاتے ہیں
غبارِ راہ کا خواہاں ہلالی زخم دل حاضر
غمِ پنہاں کا مرہم درشبِ معراج پاتے ہیں

ذکر ابرو کا کروں، بزم میں تلوار چلے
نام مژگاں کا جو لوں خنجر خونخوار چلے
سر پٹکتا ہی رہا ہوں کہ مرا سر نہ کٹا
تیغ قاتل کے، برابر سے کئی وار چلے

---

[1] اسمٰعیل ہلالی "شاروک گرنتھو" مرتبہ: نور محمد [2] بحوالہ ہمایوں ہلالی

Dhaka University Institutional Repository

امیر الاسلام شرقی

(۱۹۰۲ء - ۱۹۷۹ء)

اصل نام امیر الاسلام تخلص شرقی - ۱۴ جون ۱۹۰۲ء کو کلکتے میں پیدا ہوئے - والد کا نام امین الاسلام تھا - دادا نواب سراج الاسلام کومیلا (بنگلہ دیش) کی مشہور شخصیت تھے ٭

امیر الاسلام نے پریسڈنسی کالج کلکتہ سے ریاضی کے ساتھ بی - اے پاس کرنے کے بعد عربی میں ایم - اے کی سند حاصل کی - قیام پاکستان کے بعد ڈھاکا آئے اور سکونت اختیار کی - ان کی ملازمت کا آغاز انکم ٹیکس افسر کی حیثیت سے محکمہ انکم ٹیکس میں ہوا - اور ۱۹۵۹ء میں اسی محکمے سے سبکدوش ہوئے - شرقی نے علم موسیقی کے نظریے پر بھی ریسرچ کی تھی - ریٹائرڈ کے بعد بلبل اکاڈمی ڈھاکا کے ڈائرکٹر بنے -

شرقی شاعری کے علاوہ فن تاریخ گوئی اور علم عروض پر دستگاہ رکھتے تھے - وہ فطری شاعر تھے - ملازمت کے پہلو بہ پہلو شاعری اور مضمون نگاری ان کا مشغلہ تھا - فن موسیقی سے متعلق انہوں نے مضامین بھی لکھے جو اس وقت کے جرائد میں شائع ہوتے رہے - شرقی کا اصل میدان شاعری ہے - انہوں نے حمد، نعت، غزل، نظم، قصیدہ، سلام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے - ان کے انتقال کے بعد ان کا شعری مجموعہ "خواب رفتہ" سید معراج منیر نے مرتب کیا - اور قدوس پرنٹرز لاہور سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا - شرقی دہشت کلکتوی اور ناطق لکھنوی سے مشورۂ سخن لیتے تھے

حمد اور نعت میں شرقی کا بیان والہانہ ہے جس میں وجدانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے - نظم ہو یا غزل ان کا اسلوب نگارش سادہ اور سلیس ہے - ان کی غزلیں دلی جذبات کی آئینہ داری کرتی ہیں جس میں سچائی اور شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہیں - غزل گوئی میں شرقی روایتی ہوتے ہوئے بھی تفکر کے بدلتے ہوئے جدید رجحان سے اپنا دامن نہ بچا سکے - ان کی شاعری میں نغمگی ہے -

---

٭ سراج الاسلام نواب سلیم اللہ (ڈھاکا) اور علی نواب چودھری (لکشام) کے رفیق کار تھے - انہوں نے شرقی بنگال میں مسلمانوں کی تعلیمی و سماجی بہبودی کے لئے بڑی خدمات انجام دیں - بحوالہ کومیلا جیلار ایتی ہاش، مرتب ذکریا ص ۱۷۵

ٹ امیر الاسلام شرقی کی صاحبزادی پروفیسر محفوظ اسلام سے یہ تمام معلومات مجھے زبانی معلوم ہوئیں - محفوظ اسلام بدرالنسا کالج ڈھاکا میں اردو کی ہیڈ تھیں - ۱۹۸۶ء میں ڈھاکا میں انتقال کیا - راقم ۷۲ء تا ۱۹۷۵ء ان کی شاگرد رہی -

Dhaka University Institutional Repository

نمونۂ غزل:

وہ جانتے نہیں شاید روش زمانے کی
چمن میں فکر جو کرتے ہیں آشیانے کی
برت رہے ہیں وہ بیگانگی جو اپنے تھے
بدل گئی ہے بہت اب ہوا زمانے کی
بڑھاپا کیا ہے، جوانی کا نقشِ فرسودہ
فضا اداس ہے دل کے نگارخانے کی

مثال تاریخی قطعہ: رحلت سَر سیّد احمد خاں

کہا جو قم باذن اللہ ملّت جی اٹھی فوراً
مسیحا قوم کے تھے اور وہ تھے سیّدِ دوراں
جو پورا کر کے کام اپنا خدا کے گھر گئے واپس
ندا آئی یہ شرقی، نذرِ مسلم سید احمد خاں

شرقی نے ڈھاکے میں ایک بھرپور زندگی گزاری۔ ۱۹۷۹ء میں ان کا انتقال ڈھاکے میں ہوا اور ربانی قبرستان میں دفن ہوئے۔

Dhaka University Institutional Repository

مولانا ہرمز اللہ شیدا سلہٹی

(۱۹۰۳ء — ۱۹۹۰ء)

نام ہرمز اللہ شیدا۔ تخلص شیدا۔ تھانہ تورک کھلا ضلع سلہٹ میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے — والد کا نام مقیم اللہ تھا۔ آسام مدرسے کے فائنل امتحان میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے بعد کلکتہ عالیہ مدرسہ سے فخر المحدثین کی سند حاصل کی۔ اسی دوران مدرسہ عالیہ لائبریری کی عربی، فارسی اور اردو قلمی نسخوں کی فہرست تیار کی۔ اس سلسلے میں حکومت بنگال نے انہیں ریسرچ وظیفے سے نوازا۔ ڈیڑھ سال میں یہ مفید کام مکمل کرنے پر حکومت نے مزید ایک سال چار مہینے کام کی مدت بڑھا دی۔ ۱۹۲۸ء میں حیدر آباد دکن کا سفر کیا۔ حیدر آباد کے کتب خانے میں علم کیمیا کی غیر مطبوعہ تقریباً دو ہزار کتابوں کی فہرست کی۔ ریسرچ سے فارغ ہو کر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں واپس آگئے۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۷ء عالیہ مدرسہ کلکتہ میں مدرس کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد عالیہ مدرسہ ڈھاکے میں انکا تبادلہ ہو گیا۔ ۱۹۵۰ء میں عالیہ مدرسہ سلہٹ کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی اور ۲۹ جون ۱۹۵۸ء کو اس ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔[۲] ۱۹۹۰ء میں دسمبر کی دوسری تاریخ کو شیدا نے انتقال فرمایا۔ سلہٹ میں داؤد پور مسجد کے احاطے میں دفن ہوئے۔

شیدا کو بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ وہ فطری شاعر ہیں۔ مشق شاعری میں انہوں نے کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا قیام دکن کے دوران اردو ارباب قلم کی صحبت نے انکے فن شعر گوئی کو جلا بخشی۔ انہیں عربی کے علاوہ اردو و فارسی میں بھی دستگاہ حاصل تھی۔ انہوں نے دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ دکن میں امیر مینائی کے صاحبزادے اختر مینائی شعبہ دینیات کے صدر، جناب شمس اللہ قادری ماہر آثار قدیمہ سے ان کی ملاقات رہی۔ نظام حیدر آباد میر عثمان علی خاں عثمان سے شرف بازیابی نے شیدا کے ذہن پر اچھا اثر ڈالا۔ شیدا نے دو طویل نظم اور ایک قطعہ نظام کی خدمت میں پیش کئے۔ شیدا کی تصنیف شرح دیوان خمسہ رسمی اشرفیوں کے عوض نظام نے قبول فرمائی۔

---

[۱] محمد عبدالجلیل بسمل۔ سلہٹ میں اردو۔ انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان ص ۲۱۸/۲۱۹ — محمد عبدالنور۔ علامہ ہرمز اللہ شیدا انیو آدرش لائبریری ص ۲۲۹

[۲] پروفیسر عبداللہ شعیب اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی، کی زبانی یہ معلومات فراہم ہوئیں۔

Dhaka University Institutional Repository

عوض نظام نے قبول فرمائی۔[1]

شیدا ہر صنف شاعری کے اصول و لوازم سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے نثری تخلیقات بھی پیش کئے لیکن شیدا کا اصل میدان شاعری ہے جہاں ان کی فن صلاحیت کو نمایاں ہونے کا موقع ملا۔ شیدا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہر تقریب میں اردو و فارسی میں شعر سنا کر سامعین کو مسرت بخشتے تھے۔ وہ بڑے خوش الحان شاعر واقع ہوئے تھے۔ اور جب شعر پڑھتے تھے تو محفل پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا۔

نثری کارنامے :

(۱) "مخزن الفراسہ فی شرح باب المدائح والاضاف من دیوان الحماسہ" کے دو ابواب کی شرح سلیس اردو میں لکھی ہے (مطبوعہ)

(۲) "نعم المقتنم" کے نام سے مسلم الثبوت کی شرح، زبان اردو میں کی ہے۔ جو غیر مطبوعہ ہے۔

(۳) "معلوماتِ احادیث" فن حدیث پر اردو میں ایک چھوٹا سا غیر مطبوعہ رسالہ ہے۔

(۴) نیل الاوطار کے مصنف علامہ شوکانی کی سوانح حیات مرتب کی۔ یہ کتاب حکومتِ بنگال کی ہدایت پر ۱۹۴۶ء میں لکھی گئی۔ اس کا قلمی نسخہ مدرسہ عالیہ ڈھاکا میں محفوظ ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی حکومت بنگال نے کرایا تھا

شیدا کو زبان اردو سے والہانہ عشق تھا۔ اکثر اردو ادبی نشستوں اور مشاعروں میں انہیں مدعو کیا جاتا تھا۔ ان کی فصیح و بلیغ اردو تقریریں سامعین میں پسند کی جاتی تھیں۔

۱۹۵۷ء میں مصری سیاحوں کے ایک وفد کو انجمن ترقی اردو سلہٹ کے سرپرست مجد الدین احمد چودھری کی جانب سے دی گئی ایک استقبالیہ میں شیدا نے یہ نظم بہ عنوان "اردو" سنائی[2]

نظم کے چند اشعار یہ ہیں۔

ہمارا وطن اور اردو زباں
ہمیشہ سے دونوں ہیں باہم زباں

---

[1] عبد الجلیل بسمل۔ "سلہٹ میں اردو" ص ۲۲۲

[2] ایضاً ص ۲۲۰

Dhaka University Institutional Repository

سکونت گہہ حضرت شہ جلال رح

یہی سرزمیں ہے یہ دار الاماں

ڈھلے ہیں قدامت کے سانچے میں ہم

جہاں پر ہے اسلام ہم ہیں وہاں

انجمن ترقی اردو سلہٹ کی جانب سے منائی گئی یوم اقبال کے موقع پر ایک مشاعرے کی محفل میں جس کی صدارت ڈاکٹر عبد لیب شادانی کر رہے تھے۔ شیدا کا کلام سن کر ڈاکٹر موصوف نے یہ شعر فی البدیہہ کہا۔

شیدا ترا کلام ہے یا نیشتر کدہ

پیری میں کیوں شباب کا تجھ پر گمان نہ ہو

شیدا غزل گوئی میں مولانا الطاف حسین حالی سے متاثر تھے ان کی شاعری میں مہذبانہ رنگ ہے۔ ان خصوصیات نے انہیں انفرادی حیثیت بخشی ہے۔ جو قابل قبول ہے۔ نمونہ غزل یہ ہے۔

سناؤں درد دل کس کو کوئی بیدل نہیں ملتا

جو مر کر زندگی پائے وہی بسمل نہیں ملتا

ہمیشہ نشنۂ جذبات صادق یاب الفت ہے

جو دل ہو درد کے قابل کہیں وہ دل نہیں ملتا

نظام فطرت عالم میں خار و گل بہم یک جا

جو دریا میں نہ ڈوبا ہو اسے ساحل نہیں ملتا

قطعہ:

یارب تیرے در پہ گناہ گار آیا ہوں

منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں

بار گناہ نے چلنے نہ دیا مجھ کو رح

اسی لئے کندھوں پہ سوار آیا ہوں (ہرمز اللہ شیدا)

Dhaka University Institutional Repository

کامل کلکتوی

(۱۹۱۲ء - ۱۹۹۱ء)

خاندانی نام کامل علی۔ قلمی نام کامل کلکتوی۔ ولادت ۱۹۱۲ء کلکتے میں ہوئی۔ والد کا نام یوسف علی تھا۔ وحشت، اکمل، صولت وغیرہ یوسف علی کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔ اس طرح کامل کا بچپن ہی سے ایک علمی و ادبی ماحول میسر آیا۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں اسلامیہ کالج کلکتہ سے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ کئی سال آزادی اور بے فکری کی زندگی گزارنے کے بعد سینٹ جوزف اسکول کلکتہ میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کرلی۔ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکا آگئے یہاں انہیں سینٹ گریگوری اسکول میں استاد کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ اس اسکول میں طویل عرصے تک تدریسی ذمہ داری انجام دیتے رہے اور اسی اسکول سے ریٹائر ہوئے ان کی وفات ۳۱ جنوری ۱۹۹۱ء کو ڈھاکے میں ہوئی۔ جو رائن قبرستان پوستوگولا (ڈھاکا) میں سپردِ خاک ہوئے!

کامل قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کا طبع رجحان غزل گوئی کی طرف مائل رہا۔ ابتدا میں وہ کلکتے کے مشہور شاعر اکمل علی اکمل کلکتوی سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ اور فن شعر گوئی کے رموز سیکھے۔ شاعری میں کامل کا فکری رجحان جدید تھا۔ غالب اور اقبال ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ انگریزی تعلیم نے انہیں روشن خیال بنا دیا تھا۔ وہ زبانِ غیر کے اچھے تفکر کو اپنانے کے قائل تھے لیکن نقالی پسند نہیں تھی۔ اکتساب کرنا روا سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم کے کلام میں زبان و بیان کی پختگی کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کی گہرائی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں حقائق زندگی اور تجربات حیات کی عکاسی نمایاں ہے۔ بنگلادیش کے کہنہ مشق شعراء میں وہ ایک ممتاز اور منفرد غزل گو تھے۔

زندگی اور سینکڑوں اُلجھن ؛ جیسے کانٹوں میں پھول کا دامن
جذب ہو جائیں بجلیاں جس میں ؛ کاش ایسا بھی ہو کوئی خرمن
چل کے ساغر میں رو گئے کامل ؛ دھوپ میں خشک ہو گیا دامن

اندوہِ دل کبھی، کبھی دردِ جگر ملا ؛ سرمایۂ حیات بہ رنگ دگر ملا
فطرت کا حسن و عشق بہ تھا ایک ساکرم ؛ پھولوں کو حسن مجھ کو جمالِ نظر ملا
اہلِ ہنر کو دہر میں کامل ملا نہ کچھ ؛ دادِ ہنر ملی، نہ خراجِ ہنر ملا

---

۱ محفل جواہر گئی (غیر مطبوعہ) از ہارون الرشید
۲ ایضاً

Dhaka University Institutional Repository

اصغر راہی

(۱۹۳۵ء - ۱۹۹۱ء)

اصل نام شیخ اصغر علی۔ تخلص راہی تھا۔ اصغر راہی کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش ۱۹۳۴-۳۵ء کے لگ بھگ پرانا تھانہ گھوڑا ضلع چھپرا میں ہوئی[1]۔ خاندانی پیشہ کاشتکاری اور تجارت تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم پرانا تھانہ گھوڑا ضلع چھپرا کے پرائمری اسکول میں ہوئی مزید تعلیم کے لئے کلکتہ بھیج دیئے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کے امتحان میں ناکام رہے۔ کلکتہ کے قیام سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ کلکتہ اور مٹیا برج کے شاعرانہ اور ادبی ماحول نے ان کے ذہن کو متاثر کیا اور وہ رفتہ رفتہ شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ ۱۹۵۴ء میں کلکتہ کے کسی مشاعرے میں انہوں نے پہلی غزل پڑھی اور انجمن ترقی پسند مصنفین (کلکتہ) کے ممبر بھی ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں فرقہ وارانہ فسادات سے مجبور ہو کر کلکتہ سے ہجرت کر کے چاٹگام آ گئے[2] اور زندگی کے آخری ایام تک چاٹگام ہی میں رہے۔

مرحوم جب تک زندہ رہے چاٹگام کی اردو ادبی سرگرمیوں سے منسلک رہے۔ وہ حلقہ اہل قلم چاٹگام کے صدر تھے۔ ۱۹۸۱ء میں ان کی ادارت میں چاٹگام سے ادبی رسالہ "ماحول" کا اجراء ایک مفید کارنامہ تھا۔

بنگلہ دیش کے ادبی ماحول میں اصغر کا تعارف معیاری شاعر کی حیثیت سے ہے۔ ان کی شاعری کلکتے میں پروان چڑھی۔ آغاز ہی سے ان کی افتادِ طبع جدید رجحانات کی طرف مائل رہی۔ اصغر کی شاعری رجائی شاعری ہے ان کی رجائیت میں دہلی کی سادگی اور پاکیزگی ہے۔ اصغر راہی اپنی شاعری کے بارے میں دعویٰ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میری شاعری بھی جمالیاتی شاعری ہے، تغزل کی شاعری ہے۔ ترنم کی شاعری ہے اور میرے خیال میں اس سے آگے شاعری کی کوئی منزل نہیں ہے"۔

اصغر کی شاعری میں عشق و عاشقی، ہجر و وصل اور اخلاقی باتیں بھی ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔

مثال:

یہ فنا کیا ہے یہ بقا کیا ہے — میں نہیں ہوں تو پھر خدا کیا ہے
میرے ہونے سے سارا عالم ہے — اور عالم میرے سوا کیا ہے
تم تو راہی برے نہیں لیکن — لوگ کہتے ہیں تو برا کیا ہے

---

[1] اصغر راہی "اپنا آئینہ اپنا چہرہ" انتخاب سیدپور (خصوصی اشاعت) مدیر ذاکر عزیز، نومبر ۱۹۸۶ء ص ۵۰

[2] ایضاً

Dhaka University Institutional Repository

اس شوخ کے کوچے کا پتہ کیوں نہیں دیتے
مرنے کی جگہ ہم کو بتا کیوں نہیں دیتے

اصغر راہی کی شاعری میں غم دوراں اور غم جاناں کا امتزاج ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر کی طرح حساس دل رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش کے سیاسی و قومی مسائل کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی آزادئ ہند و پاکستان کے بعد کے حالات اور ہجرت کا کرب انکے اشعار میں جا بجا نمایاں ہیں۔

مثال : جان چمن پہ وار کر ہم کو صلہ یہ کیا ملا
ہائے بھری بہار میں نکلے ہیں آشیاں سے ہم

بحیثیت مجموعی اصغر کی شاعری جدید رجحانات کی حامل ہے۔ ان کے اشعار میں فیض کا رنگ جھلکتا ہے۔ انہوں نے شاعری کی روح کو باقی رکھتے ہوئے اپنے عہد اور اپنے ماحول کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔

راہی تم اپنے ساتھ زمانے کو لے چلو
ہرگز نہ تم زمانے کی رفتار دیکھنا

اصغر راہی کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ان کے شعری نگارشات مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔
اصغر راہی نے ۱۲ مئی ۱۹۹۱ء میں چاٹگام میں انتقال کیا۔ اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

Dhaka University Institutional Repository

ظہور المبارکی

(۱۹۲۳ء-۱۹۹۳ء)

نام- ابو محمد ظہور الحق۔ تخلص ظہورؔ- حافظِ قرآن تھے ۔ حضرت پیر مبارک شاہ صاحب قادری نقشبندی پشاوری کی مریدی حاصل رہی۔ اسی مناسبت سے اپنے نام کے ساتھ مبارکی لکھتے تھے۔ والد کا نام حکیم محمد ذکریا تھا۔

ظہور المبارکی ۱۹۲۳ء میں ڈھاکے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن گورکھپور صوبہ یوپی تھا۔ ڈھاکے کے نواب خواجہ احسن اللہ شاہین (۱۸۴۵ء- ۱۹۰۱ء) دہلی گئے تو ان کی نظر آپ کے دادا حکیم مظفر حسین الٰہی بخش پر پڑی اور وہ انہیں اپنا ذاتی حکیم بنا کر ڈھاکے لے آئے۔ دادا کے انتقال کے بعد آپ کے والد حکیم محمد زکریا نواب خواجہ سلیم اللہ کے ذاتی حکیم مقرر ہوئے۔ حافظ ظہور پرانے ڈھاکا کے اردو ماحول میں پروان چڑھے۔ ظہور پیری مریدی بھی کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈھاکا میں ان کے کچھ مریدان بھی تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اردو، فارسی و بنگلا کے علاوہ عربی و انگریزی زبان سے بھی واقفیت حاصل تھی۔ بنگلا میڈیم میں انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے باوجود ان کا فطری رجحان اردو کی طرف رہا۔ شادانی کی استادانہ ذوق نے انکے ذوق کو جلا بخشی[1]۔ سولہ سال کی عمر میں پہلی غزل کہی جس کا مقطع یہ ہے۔

کفر ہے شکوۂ بے مہریٔ احباب ظہورؔ
داغ ناسور محبت میں لگاتے کیوں ہو

شعر گوئی میں حافظ ظہور کو ڈاکٹر عندلیب شادانی سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ مرتے دم تک ان کے مقلد رہے۔ ظہور نے اپنا شعری مجموعہ "غزالانِ حرم" کا انتساب شادانی کے نام کر کے شاگردی کا حق ادا کیا

نظیر صدیقی "ڈاکٹر عندلیب شادانی، ایک مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

"حافظ ظہور صاحب ڈھاکا کے شاعر اور عندلیب شادانی کے نہایت عزیز شاگرد ہیں۔ اکثر نشستوں اور مشاعروں میں خواہ تعارف کا سلسلہ ہو یا نہ ہو، شادانی صاحب ان کا تعارف اس حیثیت سے کرا دیتے ہیں کہ بنگال میں پیدا ہونے کے باوجود اردو میں اہلِ زبان کی طرح عمدہ شعر کہنے پر قادر ہیں۔ چنانچہ اس نشست میں شعراء کے تعارف کا سلسلہ

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں ظہور المبارکی کا زبانی بیان بتاریخ ۱۷ ستمبر ۱۹۹۳ء

Dhaka University Institutional Repository

تو رتی ۔ "حافظ ظہور صاحب کی باری آئی تو شادانی صاحب نے ان فی البدیہہ اشعار میں ان کا تعارف کرایا"[1]

ضرورت کیا ہے بزم شعر میں ان کے تعارف کی
جو اچھا شعر پڑھتے ہیں وہ اچھا شعر کہتے ہیں
مگر مقصود اتنا ہے فقط ان کے تعارف سے
کہ یہ شاعر مقامی ہیں، یہیں ڈھاکے میں رہتے ہیں

ظہور المبارکی نے حمد، نعت، نظم، سلام، غزل مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کا ذہن صوفیانہ ہے اور دل شاعرانہ۔ ان کے کلام میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کا امتزاج ہے زبان صاف ستھری، پاکیزہ اور رواں ہے۔ ان کے اشعار دہلی کے داخلی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ظہور نے غزل کی روایات سے انحراف نہیں کیا۔ ہجر و وصال، سوز و درد، غم جاناں و غم دوراں کا بیان ان کی غزلوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ کسی مخصوص شاعر کے پیرو نہیں۔ ان کے کلام میں درد کا تصوف بھی ہے اور میر تقی میر کی تنوطیت بھی۔ کہیں کہیں ان کا انداز بیان غالب کے رنگ سے قدرے ملتا ہوا نظر آتا ہے۔ ظہور حسن و عشق کے غماز بھی ہیں اور روحانی و عرفانی جلووں کے آئینہ دار بھی۔ اور یہ ان کا ایک انفرادی رنگ ہے۔

حافظ ظہور کی زبان دانی کے متعلق شادانی کہتے ہیں۔

زعم جس شخص کو ہو اپنی زبان دانی کا
اور یہ کہتا ہو بنگال میں اردو کیا خوب
آئے اور آ کے سنے دھیان سے اشعار ظہور
خود ہی کھل جائے گا پھر عقدۂ خوب و ناخوب

بنگلہ دیش کے مقامی اردو شاعروں میں ظہور المبارکی درجہ معیاری ہے۔ قدرت نے انہیں شاعرانہ صلاحیت عطا کی تھی۔ ظہور المبارکی کا شعری مجموعہ "غزالان حرم" ۱۹۷۳ء ڈھاکے سے شائع ہوا۔ قیام بنگلہ دیش کے بعد بنگلہ دیش سے

---

[1] پروفیسر نظیر صدیقی۔ "ڈاکٹر عندلیب شادانی ۔ ایک مطالعہ" کراچی ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۹

Dhaka University Institutional Repository

شائع ہونے والا پہلا اردو شعری مجموعہ ہے۔ "غزالان حرم" سے بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

پھر خرافات کا در یاد آیا
قبلۂ اہلِ نظر یاد آیا
تذکرہ آیا بتوں کا جب بھی
مجھ کو اللہ کا گھر یاد آیا

ہم سالکان اہل طریقت کے واسطے
ہر نقش پائے اہل محبت ہے سجدہ گاہ

تکیہ نہیں جہاں پہ ہمارا کہ ہم ظہورؔ
اللہ کے ہیں مست، ہے اللہ پر نگاہ

کون سہہ سکتا حیاتِ جاوداں کی سختیاں
زندگی پر موت کا کتنا بڑا احسان ہے

یا غمِ دوراں، یا غمِ جاناں
دو ہی تو ہیں جینے کے سہارے

درد نہ ہو عالم میں تو یارب
کوئی تجھے شاید ہی پکارے

عبث ہے یہ فکرِ غم و شادمانی
نہ وہ جاودانی، نہ یہ جاودانی
کرو قدر کانٹوں کی بھی باغبانو!
کہ کرتے ہیں پھولوں کی یہ پاسبانی

یکم اکتوبر ۱۹۹۳ء کو ۷۶ برس کی عمر میں ظہور المبارکی نے انتقال فرمایا۔

Dhaka University Institutional Repository

احسن احمد اشک

(۱۹۱۸ء - ۱۹۹۳ء)

نام احسن احمد - اشک تخلص ہے۔ والد عبدالمقتدر کا شمار ہندوستان کے مشہور مستشرقین میں تھا۔ اشک یکم جنوری ۱۹۱۸ء کو کلکتے میں پیدا ہوئے[1]۔ ان کا آبائی وطن بانس کھالی چاٹگام (بنگلہ دیش) ہے۔ احسن احمد اشک نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شعبۂ اینگلو پرشین سے اردو اینکولر کے ساتھ میٹرک۔ اسلامیہ کالج کلکتہ سے انٹرمیڈیٹ۔ کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرس فارسی و ایم۔ اے فارسی (۱۹۴۰ء) کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور گولڈ میڈل کے مستحق بنے۔ ۱۹۴۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے موڈرن لینگویجز (پالی، ہندی، اردو، بنگلہ) کے شعبے سے اردو ایم۔ اے کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ ۱۹۴۲ء میں پریذیڈنسی کالج میں ان کا تقرر لکچرار کی حیثیت سے ہوا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد سابق مشرقی پاکستان آئے اور ڈھاکا کالج (ڈھاکا) راجشاہی کالج (راجشاہی) ایم۔ سی کالج (سلہٹ) میں اردو و فارسی معلم کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد میں سابق مشرقی پاکستان (صوبائی حکومت) کے چیف سکریٹری تیاز احمد کی فرمائش پر انکی ملازمت محکمۂ تعلقات عامہ میں منتقل ہوگئی۔ اس دفتر میں ترقی کرکے ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر پہنچے۔ اور ۱۹۶۷ء تک بحال رہے۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۴ء تک صحافت کے پیشے سے منسلک رہے ــــ دوئی نک پاکستان (روزنامہ پاکستان بنگلہ اخبار) "اتفاق" (بنگلہ اخبار) نیوز ایشن (انگریزی اخبار) میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۷۷ء سے آخر دم تک ابراہیم میموریل ذیابطیس ہسپتال میں آنریری خازن کی ذمہ داری سنبھالی۔[2]

احسن احمد اشک جہاں بھی رہے ثقافتی و اردو ادبی سرگرمیوں سے منسلک رہے۔ ۱۹۴۷ء میں کلکتہ میں قیام کے دوران وہ اسلامیہ کالج کلکتہ اردو لٹریری سوسائٹی کے صدر رہے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد ڈھاکا آئے تو انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان کے اہم رکن بنے۔ وہ کچھ دنوں تک اس انجمن کے سکریٹری بھی رہے۔ اشک نے پاکستان رائٹرز گلڈ (مشرقی پاکستان) کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیں۔

---

[1] احسن احمد اشک کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مختلف اختلاف پائے جاتے ہیں۔ موصوف کی زبانی بیان کے مطابق ۱۹۱۸ء صحیح ہے۔

[2] راقمہ کو احسن احمد اشک سے انٹرویو لینے کا موقع حاصل رہا جو "احسن احمد اشک سے ایک گفتگو" کے عنوان سے سہ ماہی "فنون" لاہور جنوری اپریل ۱۹۹۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ تمام معلومات اسی انٹرویو سے منسلک ہیں۔ ہفتہ وار رسالہ "نقاش" کلکتہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء ص۔ ۱۳

Dhaka University Institutional Repository

احسن احمد اشک کو عربی، فارسی، اردو، بنگلہ اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان سے بھی واقفیت تھی انہوں نے فرانسیسی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور فرانسیسی شعراء سے متاثر تھے۔[1] کیٹس، شیلے، ٹیگور کے علاوہ برصغیر کے شعراء میں انہیں منیر لاہوری پسند تھے اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ منیر لاہوری کی شاعری میں بنگال کی آب وہوا اور مناظر کی عکاسی ہے فکر وادب پر اشک کی نظر وسیع اور مطالعہ گہرا تھا۔ ان کی شخصیت مختلف الجہات تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ صحافی بھی تھے اور مترجم بھی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انسانیت کے پرستار تھے۔ اپنے وطن بنگلہ دیش سے انہیں والہانہ عشق تھا۔

اشک کی تصنیفات وتالیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) برق وباراں (شعری مجموعہ) مطبوعہ قرآن منزل ڈھاکا سنہ ۱۹۵۰ء

(۲) جاگے جزیرے (شعری مجموعہ) " " سنہ ۱۹۶۲ء

(۳) آہنگ انقلاب (مشرقی پاکستان کی انقلابی شاعری کا انتخابی مجموعہ) مطبوعہ پاکستان رائٹر گلڈ سنہ ۱۹۶۰ء

(۴) مسلم شعرائے بنگال (احسن احمد اشک یونس احمد کے مشترکہ منظوم ترجموں کا مجموعہ)

ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی سنہ ۱۹۵۴ء

اس میں چودھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کے اہم شعراء کی نگارشات کے منظوم تراجم قلمبند کئے گئے ہیں۔

احسن احمد اشک کا بنیادی میدان شاعری ہے لیکن انہوں نے خاص ضرورت کے تحت مضامین بھی سپرد قلم کئے جو عصر جدید (کلکتہ) ماہنامہ جدید (کلکتہ) ماہِ نو (کراچی) سہ ماہی فنون (لاہور) ماہنامہ دلربا (ڈھاکا) میں شائع ہوتے رہے۔ بنگال کے فن وفن کار کو گمنامی سے روشنی میں لانا اور بنگلہ زبان وادب کو اردو داں طبقے میں متعارف کرانا ان کا مقصد اعلیٰ تھا۔ ان کے تمام مضامین مثلاً "قاضی نذر الاسلام کی غزل گوئی"، "بنگلہ زبان وادب کا تاریخی پس منظر" "الاؤل"** "مشرقی پاکستان کی عوامی کہاوتیں" وغیرہ اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

---

[1] رسالہ "پروتی پکھو" (بنگلا) ڈھاکا اگست ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۳

** الاؤل، دور متوسطین کا پہلا بنگالی شاعر جس نے فارسی "ہفت پیکر" کے علاوہ مثنوی "تحفہ" کو بنگالی شاعری کا جامہ پہنایا

Dhaka University Institutional Repository

اشک کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۵ء اور دوسرا ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۶ء ۱۹۶۶ء تا ۱۹۹۱ء وہ بالکل خاموش رہے۔ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۵ء ان کی شاعری کا بہترین دور ہے۔

اشک کا دعویٰ ہے کہ شاعری میں نہ وہ کسی کے مقلد ہیں اور نہ ہی متاثر۔ انہوں نے اپنا جادہ آپ بنایا اور اس پر گامزن رہے[1]۔ ابتدا میں وہ جمیل مظہری سے مشورۂ سخن کرتے تھے بعد میں خود کفیل ہو گئے۔ نیاز احسن احمد اشک کو کسی نے شاعر کی حیثیت سے نہیں پہچانا۔ شادانی نے ان کے متعلق ایک سطر لکھ کر قصہ مختصر کیا کہ "اشک کی شاعری میں غنائی ہے[2]۔"

"برق و باراں" ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۵ء تک ان کی ابتدائی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کا عنوان یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ خطہ بنگال "بارش و بجلی" کا مترادف ہے۔ انہوں نے "برق و باراں" کو ان لمحات کے نام انتساب کیا ہے۔ جو جمیل مظہری کی صحبت میں گزارے۔

"برق و باراں" میں ہلال عید" "جوگن" اور "نذرِ عقیدت" کے عنوان پر جو نظمیں ہیں۔ اسے بحال رکھ کر دیگر نظموں اور غزلوں کو اشک نے اپنی شاعری سے خارج کر دیا ہے۔ راقمہ نے جب اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے برجستہ جواب دیا۔

"غالب نے بھی اپنی شاعری سے کچھ اشعار خارج کر دیئے تھے۔ آپ نے ان سے کیوں نہیں سوال کیا؟،

یہ ہماری مرضی ہے۔۔۔ بس[3]"

"برق و باراں" میں اشک کا شاعرانہ رجحان اشتراکیت کی طرف کما حقہ مائل نظر آتا ہے۔ خاص کر "ہلالِ عید" اور "دہقان" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اشک کا شعری مجموعہ "جاگتے جزیرے" مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) کی جغرافیائی حدود اور اس کے جزیروں کی سیاسی بیداری کا ترجمان ہے۔ اس میں مشرقی بنگال کا ماحول، غریب کسانوں کا حوصلوں، نا اُمیدوں اور ان جزیروں کی سیاسی بیداری کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ جاگتے جزیرے میں اشک کا ذہنی ارتقاء بنگالی قومیت کا مترادف ہے ۱۹۵۶ء کے بعد پاکستان میں رونما ہونے والے سیاسی خلفشار اور اس کے دونوں بازوؤں (مشرقی و مغربی) میں نا اتفاقیوں اور

---

[1] "احسن احمد اشک سے ایک گفتگو" [2] "برق و باراں" ص ۱۵

[3] احسن احمد اشک سے ایک گفتگو

Dhaka University Institutional Repository

رنجشوں کا جو بیان تھا "جاگتے جزیرے" کی نظموں میں اس کی عکاسی ملتی ہے۔

اشک فطرتاً بڑے حساس اور نرم دل کے مالک تھے۔ وہ پاکستان کے سابق صدر جنرل ایوب خاں کا مارشل لاء اور عوام کی بے بسی کو دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے۔ اس کرب کا اظہار انہوں نے شاعرانہ تلمیحاتی سے کیا۔ ان کی دوربین نظروں کے سامنے وہ واقعہ گردش کرتا رہا جو ۱۹۷۱ء میں انقلابی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ "جاگتے جزیرے" کی پہلی نظم "آئینہ" ایک سیاسی نظم ہے۔ جو ان کے مذکورہ تخیل کی آئینہ داری کرتی ہے۔ "آئینہ" سے چند اشعار بطور مثال ملاحظہ فرمائیے۔

میری نظمیں یہ مرے سرخ لہو کے نغمے
درد کی آنچ میں تپ تپ کے جو آئینہ ہے
اس میں تم ننگے ہو، میں ننگا ہوں سب ننگے ہیں

دیکھ کر اپنے خدوخال بگڑتے کیوں ہو
توڑ ڈالو انہیں غصے میں پٹک دو لیکن
آن گنت آئینہ ریزوں میں بکھر جاؤ گے
تم مری جان حقیقت سے کہاں بھاگو گے

اشک اپنی نظم جزیرہ میں ملک (پاکستان) کے دونوں بازوؤں کے عوام سے اس طرح مخاطب ہیں

نا امیدی کے تھپیڑے پے بہ پے کھاتے ہوئے
دونوں ننگے دونوں بھوکے دونوں گھبرائے ہوئے

اتفاقاً ایک چھوٹا سا جزیرہ مل گیا
سانس لینے کو یہیں تھوڑا سا وقفہ مل گیا

یاس اور امید کی کل بندشوں کو توڑ کر
آؤ سو جائیں پرندوں کی طرح سر جوڑ کر

جانے کب ہم چھوٹ جائیں اس بھیانک خواب سے
یہ جزیرہ ڈوب جائے یک بیک سیلاب سے

Dhaka University Institutional Repository

بحیثیت مجموعی اشک کا کلام مختصر بھی ہے اور منتخب بھی انہوں نے اپنے مقصد کا اظہار اشاروں کنایوں میں کیا ہے وہ بعض نظموں میں اصول قافیہ کی پابندی کو نباہ نہ سکے۔ لیکن مفید موضوعات اور پُر لطف طرز کلام نے اس عیب کی پردہ پوشی کر دی ہے۔

بلاشبہ اشک کسی سے متاثر نہیں لیکن ان کے بعض اشعار میں قاضی نذرالاسلام کا طنزیہ اور باغیانہ رنگ بلاواسطہ نمایاں ہے۔ مثال:

ہیں کوئی سیٹھ نہ قومی لیڈر
نوکروں کا بھی ادنیٰ نوکر
اس پہ بنگال کا اردو شاعر

اشک نے نظم و غزل دونوں اصناف میں قادرالکلامی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ لیکن میری رائے میں نظم کے میدان میں وہ زیادہ کامیاب رہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں بنگال کے مقامی رنگ کی عکاسی اور سیاسی بیداری کو اشاروں اور کنایوں کے پردوں میں جس مہارت سے پیش کیا ہے۔ یہ انہی کا حصہ ہے۔ اشک کی شاعری ان کی ذات اور زمانہ دونوں کا پتہ دیتی ہے۔ ان کی شاعرانہ خصوصیات کی سب سے بڑی خوبی بنگالی قومیت کی نشاندہی ہے۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ اشک کی شاعری کو بین الاقوامی سطح پر لے آتا ہے۔

شاعری کے علاوہ تراجم کے میدان میں بھی احسن احمد اشک کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ انہیں بنگلا اور اردو زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ نیز وہ دونوں زبانوں کے مزاج سے واقف تھے۔

اشک ایک باشعور مترجم تھے۔ ان کے تراجم میں اصل کا گمان ہوتا ہے۔ بقول احسن احمد اشک[1] نذرالاسلام ان کے تراجم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ نیز جو نظمیں اردو میں منتقل ہو چکی تھیں انہیں دوبارہ ترجمہ کرنے کی ہدایت بھی دی تھی۔ اشک نے قاضی نذرالاسلام کے ایما پر تقریباً ساٹھ نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ منظوم تراجم مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ اشک نے قاضی نذرالاسلام کے عنوان سے ان کے چیدہ چیدہ منظوم ترجموں کا انتخاب بھی ترتیب دیا تھا لیکن وہ شائع نہیں ہوا۔ اس کے اشتہار "دلربا" کے مختلف شمارے میں ملتے ہیں۔

---

[1] کنیز بتول۔ اردو بھاشائے نذرل چرچا۔ نذرل انسٹی ٹیوٹ ڈھاکا۔ ۱۹۹۶ء ۱۳۸

Dhaka University Institutional Repository

نمونہ نثر :

"بنگال کی روح امن پسند ہے مگر جب کشمکش پر آمادہ ہو جاتی ہے تو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ بنگال کی دریا عموماً نرم ہیں مگر جب ان کے مزاج میں اُبال آتا ہے تو سیلاب بن کر مضبوط سے مضبوط چٹانوں کو بھی پاش پاش کر دیتے ہیں۔ بنگال کی بھیگی ہوئی نشیلی ہواؤں میں محبت پروان چڑھتی ہے" مگر یہی ہوائیں بیساکھ کی گرجتی ہوئی آندھیاں بنکر تباہی اور بربادی کا پرچم بھی اڑاتی ہیں"۔

اشک کی نثری تخلیقات بھی ادبی و تاریخی نقطہ نگاہ سے وقعت رکھتی ہیں۔ ان کے انداز بیان میں ملاحت اور شیرینی کے ساتھ سچائی بھی ہے۔ الفاظ سیدھے سادے، عام فہم استعمال کئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اشک نثر ہو یا نظم ہر جگہ کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔

۷ ار دسمبر ۱۹۹۳ء کو احسن احمد اشک نے ڈھاکے میں انتقال کیا۔ اور بنانی قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

Dhaka University Institutional Repository

شہناز عذرا

(۱۹۳۲ء-۱۹۹۳ء)

مکمل نام شہناز تنویر عذرا۔ تخلص شہناز تھا۔ والد قطب الدین احمد اور والدہ مہ جبیں خمار، شاعرہ و مضمون نگار تھیں۔ شہناز ۱۹۳۲ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۵۱ء میں اپنی والدہ کے ساتھ کلکتے سے کھلنا آئیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد چاٹگام منتقل ہو گئیں۔ ۱۹۷۱ء کے نامساعد حالات سے مجبور ہو کر اسلام آباد چلی گئیں اور اسلام آباد میں ۱۹۹۲ء میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک کی گئیں۔[۲]

شہناز عذرا کی تعلیم گھر پر ان کی والدہ کی نگرانی میں ہوئی۔ فارسی اور اردو زبان پر اچھی دستگاہ تھی شاعری میں وہ اپنی والدہ مہ جبیں خمار سے اصلاح لیتی تھیں۔ اُن کی شاعری قدیم روایتی اسکول سے منسلک ہے شہناز کے خیالات میں پختگی اور گہرائی ہے۔ فارسی الفاظ کے مناسب استعمال سے زبان میں مہارت پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی شاعری میں دلی جذبات کی عکاسی ہے۔ روزمرہ اور محاروں کا استعمال اچھا کیا ہے وہ اپنے وقت کی ایک اچھی شاعرہ تھیں۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتی تھیں۔

نمونۂ کلام :

زندگی جب غم ایام میں ڈھل جاتی ہے
تیری راہوں سے دور نکل جاتی ہے
لاکھ مضبوط ہو دل پھر بھی تڑپ اٹھتا ہے
لاکھ محتاط طبیعت ہو مچل جاتی ہے

شہناز اسے لاکھ بھلائے تو میں دل سے
رہ رہ کے مگر آتا ہے وہ شوخ ادا یاد

عذرا کو افسانہ نویسی کی بھی اچھی صلاحیت تھی۔ بقول مسعود شہریار، انہوں نے ایک ناول "انقلاب" بھی لکھا جو غیر مطبوعہ ہے عذرا کا کوئی افسانہ بطور نمونہ دستیاب نہ ہو سکا۔[۳]

---

۱ مشرق بنگال میں اردو۔ ص ۴۰۸ ۲ بحوالہ شیریں کہ شہناز ڈھاکے میں مقیم عذرا کی چھوٹی بہن۔ ۳ مسعود شہریار۔ ص ۲۳۹

Dhaka University Institutional Repository

شمس الحق شیدائی

(۱۹۱۳ء - ۱۹۹۴ء)

نام شمس الحق شیدائی۔ تخلص شیدائی۔ والد کا نام حکیم عبدالوحید تھا۔ آپ ۱۹۱۳ء میں موجودہ ضلع رہتاس کا صدر مقام سہسرام (بہار) میں پیدا ہوئے[1]۔ خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ شمس کے والد اور چچا حکیم عبدالحمید بھی غزل کے شاعر تھے۔ والد مضطر تخلص کرتے تھے اور چچا شیدا۔ شمس کو بچپن ہی سے شاعری کا ماحول ملا تھا۔ جس نے ان کے ادبی ذوق و شوق کو جلا بخشی۔ اسلامیہ کالج کلکتہ (موجودہ مولانا ابوالکلام آزاد کالج) میں طالب علمی کے دوران مولانا وحشت کی سرپرستی نے ان کے شاعرانہ ذوق کو نکھرنے کا موقع فراہم کیا۔ چونکہ ان کا فطری رجحان نظم گوئی کی طرف تھا لہٰذا وحشت کے مشورے سے وہ جمیل مظہری کے تلامذہ میں شامل ہو گئے[2]۔

شمس نے ۱۹۳۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک اور اسلامیہ کالج کلکتہ سے انٹرمیڈیٹ، ۱۹۳۵ء میں اسی کالج سے فارسی میں بی۔ اے آنرز کا امتحان اعلیٰ اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور جوبلی اسکالرشپ لے کر کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی ایم۔ اے کلاس میں داخل ہو گئے ۱۹۳۷ء میں امتحان دے کر اوّل درجے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے اردو ایم۔ اے کا امتحان دیا اور اول درجے میں اوّل آئے۔

۱۹۳۹ء میں برہم پور کالج میں فارسی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ان کا تبادلہ مراری چند سرکاری کالج سلہٹ میں ہو گیا۔ ۱۹۵۵ء میں تعلیم اور نفسیاتی تعلیم کے لئے ایڈنبرا گئے۔ واپسی کے بعد راجشاہی کالج میں ایک سال تک اردو کے مدرس رہنے کے بعد ان کا تبادلہ راجشاہی ٹریننگ کالج میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اردو و فارسی سے ان کا تعلق کم ہوتا گیا۔ اور وہ فلسفۂ تعلیم اور نفسیات کے درس دینے میں منہمک ہو گئے۔ ان کا آخری تقرر ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات راجشاہی ڈویژن کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں اسی عہدے پر برقرار رہ کر ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔ شیدائی ڈھاکا یونیورسٹی میں شعبۂ اردو و فارسی کے بیرونی ممتحن بھی رہے۔

شمس شیدائی کو مولانا ابوالکلام آزاد سے بڑی گہری انسیت تھی۔ تا بحیات وہ مولانا کے معتقد رہے۔ شمس فکر و تخیل میں مولانا کے مقلد اور اسلوب نگارش میں علامہ اقبال سے متاثر تھے۔

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں شمس شیدائی کا زبانی بیان [2] شمس شیدائی: "چراغ لالہ" ص ۳۱

[2] شمس شیدائی۔ "چراغ لالہ" ص ۴۲۔

Dhaka University Institutional Repository

شمس، "چراغ لالہ" میں اپنی سوانح لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"میرے دل و نظر کی تربیت کے سلسلے میں دو شخصیتوں کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ ایک امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسری علامہ اقبال جن کی شکل میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی!"[1]

شمس شیدائی کا سیاسی تفکر مولانا ابوالکلام آزاد کے تفکر سے مستعار ہے۔ اس سلسلے میں شمس کہتے ہیں:

"مولانا آزاد کے اثر نے میرے اندر سیاسی رجحان پیدا کر دیا۔ جو مولانا کہتے ہیں میں مانتا تھا اور ان کی تائید کرتا تھا!"[2]

شمس شیدائی کو زمانہ طالب علمی ہی سے شعر و شاعری کا چسکا لگ گیا تھا۔ ان کی پہلی نظم "شعاع" جو علامہ اقبال کی نظم "جگنو" کی روشنی پر لکھی گئی ہے۔ ۱۹۳۵ء رومان، لاہور میں شائع ہوئی۔ ذیل میں "شعاع" سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

افق چمکا، ہوئی کافور شب کی ظلمت پیہم
پیام صبح رنگیں ہے، سحر کی آسماں تابی
دم خورشید نے ایک روح پھونکی نبض ہستی میں
تپش پیدا ہوئی ذروں میں مثل رقص سیمابی
چلی موج نسیم صبح اٹھ کر کنج گلشن سے
گزیزاں چشم غنچہ سے ہوا کیف گراں خوابی

شیدائی نے نظم و غزل دونوں اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ نظم گو ہیں۔ انہوں نے سیاسی، سنجیدہ رومانی نظمیں لکھیں۔

ان کی نظمیں زیادہ تر "رومان" لاہور اور "نگار" لکھنؤ میں شائع ہوتی تھیں۔ سابق مشرقی پاکستان کے دور میں ڈھاکا سے شائع ہونے والا رسالہ ماہنامہ "خاور" کے سلسلے لکھنے والے تھے۔ "مدیر خاور کے نام" کے عنوان سے انہوں نے ایک نظم بھی لکھی۔

ان کی سیاسی نظموں میں "خطاب بہ امام الہند" "امام الہند کا پیغام" "حقیقت ابدی" "معزولی شاہ" "خطاب پاکستان بہ شیر گل افغان" بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ سنجیدہ نظموں میں "شعاع" "گلکدۂ دارجلنگ" "سالگرہ" وغیرہ ان کے حسن بیان اور ندرت خیال کی بہترین مثال ہے۔ وہ اقبال اور وحشت سے متاثر ضرور ہیں لیکن نقال نہیں۔ نظم ہو یا غزل ان کی ایک انفرادی حیثیت برقرار رہتی ہے۔

---

[1] چراغ لالہ (شعری مجموعہ) ص ۳۳
[2] ایضاً

Dhaka University Institutional Repository

'حقیقت ابدی' وہ آخری خطبہ ہے۔ جو کلکتہ کے میدان میں مولانا ابو الکلام آزاد نے ۱۹۳۵ء میں عید الفطر کے موقع پر مسلمانوں کو مخاطب کر کے دیا تھا۔ مولانا کے جملوں کو شیدائی نے بڑے سلیقے سے نظم کے خاکے میں پیش کیا۔

دنیا میں حقیقت کو قیام ابدی ہے
ٹلتی ہے حقیقت بھی کہیں کرنے سے انکار
بجھتا نہیں موجوں کے تھپیڑوں سے یہ شعلہ
گل جاتی ہے اس آگ سے فولاد کی دیوار
مومن کو جلا سکتی نہیں آتش نمرود
مومن کے لئے آگ بھی بنجاتی ہے گلزار

غزل گوئی میں شیدائی نے روایت کی پابندی کا خیال بھی رکھا اور اپنی عصری زندگی کی عکاسی بھی کی۔ وہ ایک حساس دل و دماغ رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں میں سادگی، سنجیدگی اور سلاست روی ملتی ہے۔ انہوں نے تغزل کی شان کو ہر جگہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

نمونہ کلام :

یہ ادا مسکرا کے آنے کی — ایک تمہید ہے ستانے کی
تم میرے ہو کے بھی میرے نہ ہوئے — ہائے مجبوریاں زمانے کی
اسکی خاطر جو مجھ کو مل نہ سکا — دشمنی مول لی زمانے کی
دل دھڑکتا ہے شمس کیوں میرا — ہے توقع کسی کے آنے کی

شمس شیدائی کی مطبوعہ تصانیف حسب ذیل ہیں :

مولانا ابو الکلام آزاد — حیات اور کارنامے ۔ (انگریزی)
تھرو دی کار ونینڈو (سفرنامہ) (سفرنامہ)
چراغ لالہ (شعری مجموعہ) محاذ پبلی کیشنز ڈھاکا ۱۹۸۵ء

شمس الحق شیدائی نے ۱۳ فروری ۱۹۹۴ء کو اپنی رہائش گاہ دھانمنڈی میں انتقال فرمایا اور بنانی قبرستان میں دفن ہوئے۔

Dhaka University Institutional Repository

حافظ دہلوی

(۱۹۲۴ء - ۱۹۹۵ء)

حافظ دہلوی کا اصل نام محمد رفیع۔ تخلص حافظ، والد کا نام محمد شفیع تھا۔ ۶ر دسمبر ۱۹۲۴ء محلہ مشورہ کوٹھی۔ پہاڑ گنج دہلی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ حافظ ہیرانی وضع کے ایک صوفی منش، خوش اخلاق انسان تھے۔ طبیعت میں قناعت تھی تمام عمر حرص و لالچ سے بے پروا رہے۔ پیشے کے لحاظ سے لکڑی کے کاریگر تھے۔ ۱۹۵۰ء میں دہلی سے ہجرت کر کے ڈھاکہ آئے اور سابق مشرقی پاکستان کو وطن ثانی بنایا۔ ۲۶ر اگست ۱۹۹۵ء کو انتقال کیا اور ڈھاکا عظیم پور قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

حافظ دہلوی کو بچپن ہی سے شاعرانہ ماحول ملا تھا۔ اوائل عمر میں زیب دہلوی، کامل نظامی دہلوی، حیدر دہلوی، غافل دہلوی وغیرہ کے روبرو شعر پڑھنے کا موقع حاصل رہا۔ سابق مشرقی پاکستان کے روایتی شعراء کے حلقے میں ان کا درجہ صفِ اوّل میں ہے۔

۱۹۷۱ء کے بعد بنگلادیش کے ادبی حلقوں میں حافظ کی حیثیت استادانہ رہی۔ ان کے شاگردوں کے نام یہ ہیں۔

طارق بنارسی، عنایت بنارسی، عاطف بنارسی، عامر فریدی، صابر عظیم آبادی، عاشق صحرائی، زاہد مظفرپوری، شرر آروی، حصیر نوری، فرقان ادریسی، کلیم رحمانی، حلیم صبا، شمیم انولوی، صابر فریدی۔ نجم بنارسی، جوہر بلیاوی، شان الرحمٰن شان، عاصی غازیپوری، قاسم انیس، شمیم احمد شمیم، شمیم کاشفی، ظہیر احمد ظہیر اور عبدالمجید انصاری وغیرہ

حافظ نے حمد، نعت، نظم اور غزل اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی۔ لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ان کا فطری رجحان مذہبی ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں شعوری طور پر ان کے ذہن میں اس شعر کا آنا اس بات کی واضح دلیل ہے۔

مدینے کی گلیوں میں جا کر پکارا
کہاں ہیں محمدؐ نظارا کروں گا[1]

حافظ دہلوی کی شاعری میں روایت و جدت کی ہم آہنگی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں روایت کی دلکشی بھی ہے اور عہد جدید کے تلخ حقائق کی غمازی بھی ہے۔ انہوں نے اپنے گردوپیش میں پھیلے ہوئے واقعات کو بڑے سلیقے سے غزل کے لہجے میں پیش کیا ہے

---

[1] حافظ دہلوی۔ "آندھیوں میں چراغ" مرتب: فرقان ادریسی۔ حصیر نوری۔ مطبوعہ کراچی۔ ص ۱۵

[2] "نجم و شرر" مختلف شعراء کے کلام کا انتخاب۔ طبع اول فروری ۱۹۷۶ء پیش کش، حلقہ نکرو دانش ڈھاکا ص ۱۴

Dhaka University Institutional Repository

غزل کے علاوہ حافظ دہلوی کی نظمیں بھی قابل ستائش ہیں۔ ان کی نظموں میں جدید سیاست کے کربناک نتیجوں، انسانیت سوز رویّوں کی عکاسی بھی ہے اور فال نیک کی نشاندہی بھی۔ حافظ کی نظموں میں سوز و گداز بھی ہے اور جوش و خروش بھی۔ غزل ہو یا نظم ہر جگہ سادگی و صفائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکی شاعری معیاری ہے۔ وہ اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔

نظموں میں "شہر دسترس"، "بھومی"، "لیل و نہار"، "استغاثہ" اور "سارک" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کہاں ہے خاتم فن کی سند تقدیر آذر میں
سمندر بہہ رہا ہے ان گنت شکلوں کا پتھر میں

نسل و زباں کے پھیر میں انساں ہے خوار خوار
موتی ملے ہیں خاک میں، پتھر نہ جانیئے

اے خضر ذرا آپ کو تکلیف تو ہو گی
میں اپنی سکونت کا پتہ بھول گیا ہوں

نفرت کی کڑی دھوپ میں جب میں نے پکارا
سائے نے کہا آپ کی قامت میں کھڑا ہوں

اسی خیال سے میں بند اپنے خول میں ہوں
نئی ہوا نہ کہیں توڑ پھوڑ دے مجھ کو

Dhaka University Institutional Repository

نمونہ نظم :

ارضِ بنگلہ دیش کی تو قیمتی ایجاد ہے
مسجدوں کے شہر ڈھاکا میں تری بنیاد ہے
تیری ہر تجویز پر چھوٹے بڑے کا صاد ہے
کل اسیرِ جبر سب تھے آج ہیں سب شاد شاد
اے جنوبی ایشیا کے ہفت ملکی اتحاد
ایک تازہ دور کا آغاز راس آئے ہمیں
اختتامِ جور کا آغاز راس آئے ہمیں
باہمی اس طور کا آغاز راس آئے ہمیں
تجھ سے وابستہ ہے ملک و قوم کا حُسنِ مفاد
اے جنوبی ایشیا کے ہفت ملکی اتحاد

لہ حافظ دہلوی ۔ "آندھیوں میں چراغ" مرتب : فرقان ادریسی، حقیر نوری ۔ کراچی

Dhaka University Institutional Repository

جمال مشرقی

(۱۹۴۷ء - ۱۹۹۶ء)

خاندانی نام محمد جمال۔ معروف بہ جمال مشرقی۔ تخلص جمالؔ۔ ولادت ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو چیک پور کلکتے میں ہوئی والد کا نام شیخ محمد حنیف تھا۔ ۱۹۵۰ء میں اپنے والد کے ہمراہ ڈھاکا آئے۔ ڈھاکا ہی سے میٹرک، انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کی تعلیم مکمل کی۔ حصول علم سے فراغت کے بعد قیام بنگلہ دیش تک مختلف ہائی اسکولوں میں تدریسی خدمات پر مامور رہے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد ان کا ذریعۂ معاش تجارت رہا۔ اور مشغلہ شعر و شاعری تھا۔ ۳ دسمبر ۱۹۹۶ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اپنی رہائش گاہ نور جہاں روڈ (محمد پور ڈھاکا) میں رحلت فرمائی اور ۴ دسمبر کو میر پور قبرستان میں پیوند خاک ہوئے[1]۔

جمال مشرقی کا شمار ۱۹۷۱ء کے بعد بنگلا دیش میں ابھرنے والے معیاری شعرا میں ہوتا ہے ان کو طالب علمی کے زمانہ ہی سے شاعری اور مضمون نگاری سے دلچسپی تھی۔ انقلاب بنگلا دیش کے بعد ان کے ذوق ادب نوازی میں حرارت پیدا ہو گئی۔ اور وہ یہاں اردو کے لئے نامساعد حالات میں بھی سرگرم عمل رہے۔

۲ فروری ۱۹۸۵ء کو "اردو مجلس" کی بنیاد رکھی۔ مرحوم اس ادارے کے بانی، معتمد اعلیٰ اور سرگرم کارکن تھے۔ اس ادارے نے بنگلا زبان اور اردو کے نامور قلم کاروں کو لے کر بہت ساری ادبی مجالس، مشاعرے منعقد کیں۔ اس ادارے کی نگرانی میں شعری مجموعہ "اشکِ غم" (حسنین بھاگلپوری) "شہرِ آئینہ" جمال مشرقی کے علاوہ "مجلس" (مدیر جمال مشرقی) شائع ہوئیں۔ جمال کی ادبی سرگرمیوں میں اہم کام یہ رہا کہ انہوں نے پہلی بار (۷۱ء کے بعد) عوامی سطح پر اردو، بنگلہ مشاعرے کی محفل منعقد کی اور یوم غالبؔ، یوم اقبال، یوم قاضی نذرالاسلام اور یوم ڈاکٹر شہید اللہ کے انعقاد سے ادبی فضا کو خوشگوار کیا۔[2]

بہرحال جمال مشرقی کی پہچان ایک باشعور شاعر کی حیثیت سے ہے۔ ان کا شعری رجحان جدید اور صحتمند تھا۔ غزل گوئی میں وہ میرؔ اور غالبؔ کے پیرو رہے، نظم گوئی میں علامہ اقبال سے متاثر رہے۔ ان کی قلمی نگارشات کو ادبی دنیا سراہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ خصوصاً صنف تضمین پر انہیں مہارت تھی۔ ان کی تضمین کا مجموعہ "شہرِ آئینہ" ۱۹۹۵ء میں مجلس پبلی کیشنز ڈھاکا سے شائع ہوا۔ تضمین کا یہ مجموعہ بنگلا دیش میں تقریباً دو سو سال پر محیط اردو شاعری کی تاریخ میں پہلی کامیاب کوشش ہے۔ اس میں

---

[1] جمال مشرقی کی اہلیہ مالا جمال سے کل معلومات فراہم ہوئیں۔ [2] شہرِ آئینہ، مجلس پبلی کیشنز ڈھاکا ۱۹۹۵ء۔ ص ۱۰

Dhaka University Institutional Repository

انہوں نے ولی دکنی کے دور سے موجودہ دور تک نامور شعراء کے چیدہ چیدہ اشعار کے افادی و معنوی حسن کے تناظر میں خوبصورت نظم کی شکل میں تضمین کی ہے۔ اس میں انہوں نے منتخب شعر کو سنگ بنیاد قرار دیگر شعر کے مفہوم کو اپنی تضمین کا موضوع بنایا۔ اس ضمن میں ان کی صلاحیت قابل تحسین ہے

جمال کی طرز نگارش میں دہلی کی داخلیت کے ساتھ لکھنؤ کی رجائیت بھی ہے۔ ان کے کلام میں آمد ہے آورد نہیں ان کی غزلوں میں جدید فکری رجحان ہے۔ نظموں میں عصری واقعات کی نشاندہی کی ہے۔ بحیثیت مجموعی جمال کی شاعری میں غم جاناں اور غم دوراں کا امتزاج ہے۔

نمونہ تضمین :

وہ بندہ جو ہے واقف اسرار الٰہی
اٹھتا ہے تو ڈھا دیتا ہے ایوان تباہی
خاطر میں جہاندار کو لاتا ہے بھلا کب
درویش کی ٹھوکر میں رہا کرتی ہے شاہی
تاریخ امم خون سے لکھتا ہے مسلماں
اقبال بھی دیتا ہے جمال اس کی گواہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

نمونۂ غزل :

ہوتی ہے جمال اس پہ ہی پتھر کی نوازش
جو شاخ ثمر دار بھی ہے، سایہ فگن بھی

فلک سے کب شب غم کا حساب مانگے ہے
سحر گزیدہ نیا آفتاب مانگے ہے
قلم ہے، تیغ ہے، چنگ و رباب، ساغر ہے
اٹھالے ہاتھ میں جو انقلاب مانگے ہے

Dhaka University Institutional Repository

غلام محمد

(۱۹۳۹ء - ۱۹۹۷ء)

اصل نام غلام محمد۔ پیدائش ۵ مئی ۱۹۳۹ء کو کھلنا (بنگلا دیش) میں ہوئی۔ والد کا نام فقیر محمد تھا۔ دادا اعظم گڑھ سے چلے اور کھلنا آکر آباد ہو گئے۔ غلام محمد ۱۹۵۹ء میں جگن ناتھ کالج ڈھاکا سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ای۔ پی سی۔ ایس کا امتحان دیا اور کامیاب ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۶ء سرکاری ملازمت میں منہمک رہے۔ ۱۹۷۶ء میں احتجاجاً ملازمت سے استعفیٰ دے کر ابوظہبی چلے گئے اور کچھ دنوں تک وہاں ملازمت کی۔ ۱۹۹۱ء میں بنگلہ دیش واپس آئے۔ اور صحافت نگاری کا پیشہ اختیار کیا[1]۔ موصوف اپنے آخری ایام تک روزنامہ "نیوز نیشن" ڈھاکا میں بطور SPECIAL CORRESPONDENT وابستہ رہے۔ ۲۷ اگست ۱۹۹۷ء بروز چہارشنبہ رات ۲ بجے اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اپنی رہائش گاہ شاہ جہاں پور ڈھاکا میں رحلت فرمائی۔ ۲۸ اگست کو عظیم پور قبرستان ڈھاکا میں سپرد خاک کیے گئے۔

بنگلا دیش کی اردو ادبی محفل میں غلام محمد کا تعارف اعلیٰ افسانہ نگار، معتبر صحافی اور اچھے مضمون نگار کی حیثیت سے ہے۔ غلام محمد کو اردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی دستگاہ حاصل تھی۔ ان کے ادبی مضامین اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی شائع ہوتے رہے لیکن غلام محمد کا بنیادی میدان افسانہ نگاری تھا۔ وہ اسکول میں طالب علمی کے زمانہ سے نونہال کراچی (بچوں کا رسالہ) میں بچوں کے لئے افسانہ لکھتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے باقاعدگی کے ساتھ افسانہ نویسی شروع کی۔ پہلا افسانہ فیض احمد فیض کی ادارت میں "لیل و نہار" میں شائع ہوا۔ جس کا عنوان غریب و عجیب تھا۔ ان کے افسانے ماہ نامہ "ساقی" (کراچی) ماہ نو (کراچی) ماہنامہ ادب لطیف (لاہور) ماہنامہ قومی زبان کراچی) سہ ماہی "فنون (لاہور) انکشاف (ڈھاکا) اردو مجلس (ڈھاکہ) قلم کار (ڈھاکا) وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ میرے سوالنامے کے جواب میں غلام محمد نے اپنے افسانہ نگاری کے بارے لکھتے ہیں:

> "افسانہ نگاری میں جڑوں کی تلاش، جڑیں جو بیرصغیر اور اس کے باہر بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اسے لازمی سمجھتا ہوں۔ میرے افسانوں کا حوالہ بنگلادیش ہے ــــ پاکستانی عہد کے افسانوں میں ایک رویہ ہے ــــ وہ افسانے "ایک شخص سہما ہوا" پر ختم ہوتے ہیں۔ دوسرا رویہ بنگلہ دیشی

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں غلام محمد نے اپنے متعلق کل معلومات بہم پہنچائیں۔ بتاریخ ۱۵ اگست ۱۹۹۶ء

Dhaka University Institutional Repository

عہد کے افسانوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر وہ ایک دوسرے کی تردید یا نفی نہیں کرتے۔ اول الذکر افسانوں کا تعلق تقسیم برصغیر کے بعد کے حالات سے جہاں موخر الذکر افسانوں کے ڈانڈے ۱۹۷۱ء سے ملتے ہیں۔ میں سن ۱۹۷۱ء کی گھن گرج میں بہت شدت محسوس کرتا ہوں۔ میرے افسانوں کا ثقافتی لینڈ اسکیپ بنگلادیشی ثقافت ہے۔ انڈونیشیا کا مسلمان بھی اپنی ہی ثقافت پر اصرار کرتا ہے۔[1]

غلام محمد اپنے ادبی تفکر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ادبی تحریکوں کی میں نے مخالفت کی۔ پہلے ترقی پسند تحریک جو کمیونسٹوں کے لئے طرز کار کے طور پر استعمال ہوئی۔ اب جدیدیت جو ترقی پسندی کی ضد ہے اور اس سے زیادہ دھوکہ بازی ہے۔ ایسے کام ادب میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں۔ میں ان تحریکوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میری پوزیشن تاریخی طور پر صحیح ثابت ہوئی۔"[2]

غلام محمد نے تقریباً ایک سو پچاس افسانے لکھے۔ جو مختلف ادبی جرنل میں شائع ہوتے رہے۔ غلام محمد کے انتقال کے بعد ان کے دیرینہ دوست احمد زین الدین کی نگرانی میں چیدہ چیدہ افسانوں کے تین مجموعے کراچی سے شائع ہوئے۔ جو حسب ذیل ہیں:

(۱) انگلیاں ریشم کی — منتخب افسانے، غلام محمد۔ مرتب: احمد زین الدین۔ زین پبلی کیشنز کراچی جنوری ۱۹۸۲ء

(۲) ترشنا — منتخب افسانے، غلام محمد۔ مرتب: 〃 〃 〃 〃

(۳) لہو قطرہ قطرہ — منتخب افسانے، غلام محمد مرتب: 〃 〃 〃 ۱۹۸۲ء

غلام محمد کے افسانوں میں محبت، نفرت، جنس، لالچ، مذہب، اخلاق، سماج، تاریخ، تمدن، تہذیب، ثقافت، سیاست سبھی کچھ نمایاں ہیں۔ ان کے افسانے عہد پاکستان سے لیکر عہد بنگلادیش تک کا احاطہ کرتے ہیں۔ انہوں نے کسی خاص طبقے یا گروہ کو اپنے افسانوں کا موضوع نہیں بنایا۔ ان کے افسانے تقاضائے وقت کہے جا سکتے ہیں۔ جن کے پلاٹ زیادہ تر انسانی فلاح و بہبود پر قائم ہیں غلام محمد کے افسانے شور، خدا کی مار، ترکِ وفا، رشتے، تین مسافر، ڈگڈگی والا، ریشم کی انگلیاں، لہو قطرہ قطرہ وغیرہ اس ضمن کے

---

[1] سوالنامے کا جواب۔

[2] غلام محمد "میری افسانہ نگاری"، ترشنا (منتخب افسانے) مرتب احمد زین الدین۔ اوکھائی پرنٹنگ پریس اردو بازار کراچی جنوری ۱۹۸۲ء ص ۱۶

Dhaka University Institutional Repository

افسانے ہیں۔" انگلیاں ریشم کی" کا پلاٹ اس تاریخی واقعے کی طرف قاری کا ذہن مبذول کرتا ہے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ڈھاکے کے ململ بننے والے کاریگروں کی انگلیاں کاٹ کر اس مشہور صنعت کی ہمیشہ کے لئے بیخ کنی کر دی۔ کہانی کا اختتام وہ اس طرح کرتے ہیں کہ اب ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ ایشین ڈیولپمنٹ بینک اور ورلڈ بینگ لے لی ہے۔ ان کا افسانہ "شور" نو دولتیوں کی دینی اور اخلاقی پستی کی کہانی ہے۔ نئی دولت ایک طرف آنکھوں میں سرور پہنچاتی ہے تو دوسری طرف مزاج میں کمینگی پیدا کرتی ہے۔ مصنف نے "شور" میں سیاسی افراتفری، سماجی خلفشار بداخلاقی، بے حیائی اور احکام خداوندی سے اجتناب جیسے اہم مسائل پر تاثر آمیز اظہار خیال کیا ہے۔

افسانہ "خدا کی مار" انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام سے لاپرواہی کو انسان کی پریشانیوں کا سبب قرار دیا ہے۔ اور اس مقصد کی وضاحت کے لئے وہ قرآن پاک سے آیت کی تفسیر پیش کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے "نبی اللہ کی نافرمانی کرنے پر اللہ کا عتاب اس طرح نازل ہوا کہ نافرمان بندوں کی شکلیں بندر کی ہوگئیں۔ اور وہ درختوں پر کئی دن اچکتے رہے"۔

افسانہ "ٹینشن" میں لالچ کی مذمت اور انسان کی بے ثباتی کی نشاندہی کی ہے۔

"تین مسافر" میں ہندو اور مسلمان، مقامی و مہاجر کے باہمی روابط و تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کل افسانوں کے پلاٹ مقصد کے تحت لکھے گئے۔ غلام محمد کے افسانے تکنیک کے لحاظ سے بھی کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ کردار نگاری کا ارتقا، زمان و مکاں کا التزام، تاثر کا ارتکاز، مناظر کی عکاسی، تذبذب بدرجہ اتم موجود ہے۔ افسانہ نگاری میں ان کا رنگ انفرادی ہے۔ افسانہ نویسی میں وہ پریم چند، کرشن چندر وغیرہ کے خاص گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے عالمی ادب کا وسیع تر مطالعہ کیا تھا۔ اور وہ اس سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ خاص کر فرانسیسی مصنف سارتر انہیں بہت پسند تھا۔

غلام محمد کے افسانوں میں علامتی اور بیانیہ افسانوں کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے افسانے "تین مسافر" اور "کل جگ" وغیرہ علامتی کہے جائیں گے۔ "ٹینشن" "شور" "فیکٹری" وغیرہ بیانیہ رنگ کے افسانے ہیں۔

افسانہ نگاری کے علاوہ غلام محمد نے چند مفید مضامین بھی سپرد قلم کئے جو مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے

غلام محمد کو اپنا وطن بنگلہ دیش بے حد عزیز تھا۔ ۱۹۷۱ء کا انقلاب اور کرب کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے مہاجرین افراد کے مصائب کی دلسوزیاں بھی اور مقامی بنگالی عوام کی پریشانیوں کی بھی نشاندہی کی یہ ان کی انصاف پسندی کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

وہ اپنے مضمون "ہم عصر اردو افسانے میں رقمطراز ہیں۔

"ظالم و مظلوم کی شناخت میں ایسی لغزش ہوئی ہے کہ ظالم خود مظلوم اور مظلوم آپ ظالم نظر آتا ہے۔ بہاری اپنی طبقاتی حیثیتوں کے باوجود مظلوم قرار دیئے گئے۔ حالانکہ بہاریوں کے مقابلے میں بنگلا دیش کے پشتو ہاراؤں کے حالات کم افسوسناک نہ تھے۔ کیونکہ سن ۱۹۷۱ء تک بہاری سابقہ مشرقی پاکستان میں تقریباً آباد ہو چکے تھے۔ بشتو ہارا اپنے وطن میں بے وطن پھرتے تھے۔"[1]

غلام محمد کے تقریباً چھ افسانوں کے ترجمے حسنین امتیاز نے بنگلا زبان میں کیے جو مختلف بنگلا ادبی رسالوں میں شائع ہوئے۔

قیام بنگلا دیش کے بعد یہاں افسانہ نگاروں میں غلام محمد کا رتبہ قابل قدر ہے۔ ان کا نفسیاتی شعور اور قوت مشاہدہ پختہ تھا۔ برصغیر کی تاریخ پر ان کی نگاہ غائر تھی۔ ان کا ناولٹ "لہولہو قطرہ" اس کی بین ثبوت ہے۔ بنگالی افسانہ نگاروں میں وہ شوکت عثمان سے متاثر تھے۔ غلام محمد کے افسانوں میں احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین کے افسانوں سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ فنی و مقصدی تناظر میں غلام محمد بنگلا دیش کامیاب افسانہ نگار تھے۔

لہو قطر قطرہ (ناولٹ) سے چند سطور بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

"کہا جاتا ہے کہ میر جعفر علی خاں بڑے نیک تھے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اقتدار کا خیال ان کے ذہن میں اس طور پر آیا اور اسی غرض سے آیا تھا جیسے ازمنہ قدیم سے لے کر آج تک ہوتا آیا ہے انہوں نے اپنے مقاصد کے لئے کلایو کو استعمال کرنا چاہا۔ مگر وہ خود کلایو کے ہاتھوں استعمال ہو گئے۔ ایسا رانا سانگا کے ساتھ بھی ہوا تھا جس نے ابراہیم لودھی کے خلاف ظہیر الدین محمد بابر کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ تاریخ نے اس واقعہ کو نظر انداز کر دیا۔"

---

[1] غلام محمد: "ہم عصر افسانہ" ادبی رسالہ "انکشاف" ڈھاکہ۔ فروری ۱۹۸۶ء ص ۷۳

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر ابو سعید نورالدین

(۱۹۲۹ء — ۱۹۹۹ء)

نام ابو سعید نورالدین۔ ولادت یکم فروری ۱۹۲۹ء بہ مقام پاچرخی تھانہ نندائل ضلع میمن سنگھ (بنگلہ دیش) میں ہوئی۔ والد مولوی عبدالحکیم اپنے علاقے کے مقبول عالم تھے۔ نورالدین کی ابتدائی تعلیم عربی، فارسی ان کے والد کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں انہوں نے شیرپور سینیر مدرسہ سے "فاضل" کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ ۱۹۴۶ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے "ممتاز المحدثین" کی سند لی۔ ۱۹۴۸ء میں سراج گنج انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں ڈھاکا یونیورسٹی سے بی اے آنرز اور ۱۹۵۲ء میں ایم۔ اے اردو کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔[1]

"اسلامی تصوف اور علامہ اقبال" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر کراچی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کا سند لیا۔ اس دوران علامہ اقبال اکاڈمی پاکستان سے ریسرچ فیلو کے لئے جاری کردی وظیفہ کے مستحق بھی بنے۔ ان کا تحقیقی مقالہ "اسلامی تصوف اور اقبال" کتابی شکل میں ۱۹۵۹ء میں اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر نورالدین کی ادبی خدمات حسب ذیل ہیں۔

"اسلامی تصوف اور اقبال۔ اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور ۱۹۵۹ء

ڈاکٹر نورالدین کا یہ تحقیقی مقالہ ایک مقدمہ اور سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف نے لفظ "تصوف" کی تحقیق، تعریف اور اصل کی توضیح بیان کرنے کے بعد علامہ اقبال کے تناظر میں تصوف کا مقام اور بلندی پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔ مقصد کی وضاحت کے لئے اقبال کے اشعار بھی پیش کئے ہیں علامہ اقبال کے فلسفے سے منسلک کتابوں میں، میرے خیال میں یہ اپنی نوع کی پہلی اور مفید کتاب ہے۔

تاریخ ادبیات اردو حصہ اول۔ اردو نثر: مغربی پاکستان اردو اکاڈمی لاہور ۱۹۹۷ء

" " حصہ دوم۔ اردو نظم " " " " "

یہ کتاب بیک وقت تالیف بھی ہے اور تصنیف بھی۔ اس میں ترہویں صدی عیسوی سے لے کر

---

[1] ابو سعید نورالدین کا زبانی بیان۔ ۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء

Dhaka University Institutional Repository

بیسویں صدی عیسوی کے آخر تک اردو شعر و ادب کے ارتقائی مراحل مدلل بیان کئے گئے ہیں۔ اس پر گرانقدر تعارف ڈاکٹر عندلیب شادانی نے لکھی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر نورالدین کی تابہ حیات اردو ادبی خدمات کا نچوڑ کہی جاسکتی ہے۔ ضخامت کے لحاظ سے مصنف نے اسے دو حصوں میں (نثر و نظم) شائع کروایا ہے۔ عاشقانِ اردو کے لئے یہ ایک مفید ادبی سرمایہ ہے۔

مہاکوی اقبال (عظیم شاعر اقبال) علامہ اقبال شتابدی بنگلادیش ۱۹۹۶ء

بنگلا زبان میں یہ تصنیف علامہ اقبال کی حیات اور ان کی ادبی خدمات سے متعلق مفید کارنامہ ہے۔ ۱۶۴ صفحات کی یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جس میں علامہ اقبال کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا بیان زیادہ ہے۔ فلسفۂ کلام سے متعلق بحث نہایت مختصر ہے بنگالی حلقوں میں علامہ اقبال کے تعارف کے لئے یہ ایک مفید کوشش کہی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ مصنف نے وقتاً فوقتاً مفید ادبی مضامین بھی تحریر کئے جو مختلف رسالوں میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نثر نگاری کے علاوہ ابوسعید نورالدین کو تراجم کی بھی صلاحیت تھی ان کی مادری زبان بنگلا اور تعلیمی زبان اردو اور انگریزی تھی۔ اس بنا پر انہیں تینوں زبانوں سے واقفیت تھی۔ انہوں نے کئی بنگلہ ادب پاروں کو اردو میں منتقل کیں۔ جن میں چند کے نام یہ ہیں۔

"سیلاب" اصل، ابوالکلام شمس الدین	ماہنامہ "ماہِ نو" کراچی۔ مارچ ۱۹۵۴ء
"دیر سے آرزو" اصل، ابوالکلام شمس الدین	"ماہِ نو" کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۶ء
ایک عجیب الخلقت رات اصل، نذرالاسلام	"ماہِ نو" کراچی

ڈاکٹر نورالدین کسی علمی یا تعلیمی ادارے سے منسلک نہیں تھے۔ انہوں نے صنعتی ترقیاتی ادارہ کے ماتحت مختلف عہدوں بنگلادیش اسٹیل اینڈ انجینئرنگ کارپوریشن کے سکریٹری حیثیت سے ۱۹۸۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے اپنے ادبی ذوق و شوق کی تسکین کے لئے شغف جاری رکھا۔ موصوف نے ۲۳ ستمبر ۱۹۹۹ء کو اترا ماڈل ٹاؤن

ڈاکٹر نورالدین کے اسلوب بیان کے متعلق عندلیب شادانی رقمطراز ہیں۔

"ڈاکٹر نورالدین کا اسلوب تحریر نہایت شگفتہ، دلکش اور خوش آئند ہے۔ قاری ان کی پڑھنے سے کبھی اکتاتا نہیں۔ ان کی زبان نہایت صاف ستھری، سہل و سادہ فصیح اور بامحاورہ ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

اور انہیں نہ جاننے والا کبھی یہ سوچ نہیں سکتا کہ یہ تحریر ایک بنگالی کے قلم سے نکلی ہے۔ ڈاکٹر نورالدین نے تنقید کا خوش گوار فرض پوری دیانتداری اور سلیقہ مندی سے انجام دیا ان کے مطالعے کا انداز ہمدردانہ ہے معاندانہ نہیں[1]"

ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مذکورہ رائے سے راقمہ کو اعتراف ہے۔ نورالدین ایک اچھے نثر نگار اور معیاری نقاد کہلانے کے مستحق ہیں۔

موصوف نے ۲۳ ستمبر ۱۹۹۹ء کو اترا ماڈل ٹاؤن ڈھاکا (اپنی رہائش گاہ میں) اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے رحلت فرمائی۔

نمونہ نثر:

"[illegible] مسلمان بادشاہوں، نوابوں اور امیروں نے بنگال میں اردو کی خدمات کم انجام نہیں دیں۔ یہاں کے لوگوں پر ایک طرف اگر اولیاء اللہ اور بزرگان دین کا اثر رہا ہے تو دوسری طرف ان فرماں رواؤں کے فیوض و برکات بھی کافی رہے۔ ان فرماں رواؤں کا تعلق ایک لمبی مدت تک دہلی کی مرکزی حکومت سے رہا، اور وہ بنگال میں دہلی کے تمدن و تہذیب کی پوری نمائندگی کرتے رہے۔ زبان بھی وہ دہلی ہی کی استعمال کرتے رہے[2]"

---

[1] تاریخ ادبیات اردو۔ حصہ اول۔ نورالدین۔ مغربی پاکستان اردو اکاڈمی۔ لاہور ص ۸

[2] مشرقی پاکستان میں اردو۔ ماہ نو، کراچی۔ اشاعت خاص اکتوبر ۱۹۶۵ء ص ۴۷

Dhaka University Institutional Repository

احمد سعدی

(۱۹۳۱ء - ۱۹۹۹ء)

نام احمد سعدی۔ تخلص سعدی۔ ولادت بڑی بلیا ضلع مونگیر (صوبۂ بہار) میں ۱۹۳۱ء کو ایک متوسط سید گھرانے میں ہوئی۔ والد کلکتے میں احمد دادا بھائی کمپنی میں شعبہ برآمدات کے منیجر تھے۔ احمد سعدی سات سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحہ کے بعد حصول تعلیم کے لئے اپنے ماموں ربط ہاشمی (افسانہ نگار) کے پاس کلکتہ ہی میں رہے۔ انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک اور بی۔ اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ ربط ہاشمی کی سرپرستی ان کے لئے نیک فال ثابت ہوئی۔ ہائی اسکول کے طالب علم رہنے کے دوران ان کے ماموں اپنا افسانہ انہیں نقل کرنے دیا کرتے تھے اس طرح نقل نویسی کی مشق سے احمد سعدی کو بھی رفتہ رفتہ افسانہ لکھنے کا شوق ہونے لگا اور وہ اس ضمن میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے افسانہ نویسی کا آغاز بچوں کی کہانیوں سے کیا۔ ان کی کہانیاں اس زمانے میں ماہنامہ "قوم" (دہلی) میں بچوں کے صفحات میں شائع ہوتی تھیں۔[1]

احمد سعدی ۱۹۵۵ء میں کلکتے سے ہجرت کر کے سابق مشرقی پاکستان آئے اور سید پور میں بود و باش اختیار کی۔ سعدی ریلوے (سابق مشرقی پاکستان) میں ملازمت کرنے کے علاوہ مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) کے صنعتی اداروں کی سابق مشرقی پاکستان میں نمائندگی بھی کرتے تھے۔ کچھ دنوں تک فلمی دنیا سے بھی منسلک رہے۔ قیام بنگلہ دیش کے بعد بین الاقوامی ریڈ کراس اور ایک امریکی رفاہی ادارے ایم۔ سی۔ سی سے ۹ سال تک وابستہ رہے۔

برصغیر کے اردو ارباب قلم میں احمد سعدی کا تعارف مقبول مترجم، معیاری افسانہ نگار اور اچھے شاعر کی حیثیت سے ہے۔ کچھ دنوں تک صحافت نگاری سے بھی وابستہ رہے۔

احمد سعدی کی ادبی سرگرمیاں تقریباً نصف صدی تک کا احاطہ کرتی ہیں وہ اپنے ادبی تخلیقات کو پیش کرتے ہوئے عہد پاکستان سے عہد بنگلہ دیش میں داخل ہوئے۔ موصوف اپنے آخری ایام تک بنگلادیش میں ادب نوازی سے منسلک رہے۔ انہوں نے ۲ نومبر ۱۹۹۹ء کو اپنی رہائش گاہ نیا بابو پاڑہ سید پور میں رحلت فرمائی۔ اور اتوار کے بعد نماز ظہر سید پور کے قبرستان میں دفن ہوئے۔[2]

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں انہوں نے یہ معلومات فراہم کیں۔

[2] سید پور میں مقیم احمد سعدی کے بیٹے مسعود کا بیان

Dhaka University Institutional Repository

بہ قول احمد سعدی، ان کی پہلی کہانی "شریکِ حیات" ۱۹۴۵ء میں ماہنامہ "جدید اردو" کلکتہ میں چھپی۔ بنگلا افسانے کا پہلا ترجمہ "رات" (مانک بندو پدھیائے کا افسانہ) جولائی ۱۹۴۵ء میں ہفتہ وار "نظام" بمبئی میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ان کی ادارت میں کلکتہ سے "ارمغان" شائع ہوا۔ جو نامساعد حالات کی بنا پر چار شمارے کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۹۵۴ء میں ان کی ادارت میں ماہنامہ "رباب" کے دو شمارے سید پور سے شائع ہوئے[1]۔

احمد سعدی کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصنیفات حسب ذیل ہیں :

دو دِ چراغ محفل : (افسانوی مجموعہ) لیتھو آرٹ پریس ڈھاکا بنگلا دیش۔ بار اول ۱۹۸۳ء

جس میں احمد سعدی کے چھ اور دیگر ۴ بنگلہ کے چھ افسانے شامل ہیں۔ یہ ایک مشترکہ افسانوی مجموعہ ہے۔

مٹی کی خوشبو : (افسانوی مجموعہ) جنتا پرنٹنگ پریس اینڈ بکیجز لمیٹڈ ڈھاکا ۱۹۸۹ء

یہ احمد سعدی کے نو افسانوں کا مجموعہ ہے۔

مطبوعہ تراجم :

کرنافلی (بنگلا ناولٹ) اصل علاء الدین الآزاد

جاڑے کی آخری رات، بہار کا پہلا دن (بنگلا ناولٹ) اصل علاء الدین الآزاد

زخم زخم نغمہ (بنگلا نظمیں) اصل فضل شہاب الدین

ناشر انجمن ادب بنگلا دیش۔ فروری ۱۹۸۰ء

غیر مطبوعہ تصنیفات :

خوبصورت پنکھ والا پرندہ : (افسانوی مجموعہ)

پتھر کی آگ : (افسانوی مجموعہ)

آدھی رات کا سورج : (افسانوی مجموعہ)

تیز ہوا کا موسم : (شعری مجموعہ)

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں احمد سعدی نے اپنی تصنیفات کی فہرست فراہم کی۔

Dhaka University Institutional Repository

غیر مطبوعہ تراجم

کوڑیوں کے مول : (بنگلا ناولٹ) اصل۔ بمل مترا

موسم بہار : (" " ") " ظہیر ریحان

ہزار سال کی کہانی : (" " ") " " "

سراج الدولہ (بنگلا اسٹیج ڈرامہ) " سچین سین گپتا

ٹیپو سلطان : (" " ") " ہمندر ناتھ گپتا

قاضی نذر الاسلام خطوط : (۵۷ خطوط کا ترجمہ)

اجنبی شہر : عبد الغفار چودھری کی منتخب کہانیاں

چراغ شب سیاہ : علاء آزاد کی منتخب کہانیاں

شراب کی بوتل : منتخب بنگلا کہانیاں

نئے پانی کی آواز منتخب بنگلا کہانیاں

برصغیر میں احمد سعدی کی شناخت پہلے پہل ایک باشعور مترجم کی حیثیت سے ہوئی۔ پھر وہ رفتہ رفتہ مختلف اصناف ادب میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے۔ سعدی بنگلا زبان کے علاوہ بنگال کی آب وہوا اور مزاج سے بھی واقف تھے۔ انکی زندگی بنگال میں گزری۔ انہوں نے بنگلا ادب و ثقافت کا بھرپور جائزہ لیا۔ ان میں بنگلا زبان کے نعم البدل اردو الفاظ پیش کرنیکی صلاحیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ترجموں میں اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔

انہوں نے فضل شہاب الدین بنگلا نظموں کے تراجم "زخم زخم نغمہ" کے عنوان سے کیا۔ اس کتاب کے سرورق اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں نے اس مجموعہ میں فضل شہاب الدین کی ان چند نمائندہ نظموں کو یکجا کر دیا ہے۔ جو رومانی، تخلیقی اور فکری پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ اور جن کے مطالعہ سے اردو قارئین کو بنگلا میں بنگالی شاعری کے مزاج اور ارتقائی مدارج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔"[1]

---

[1] احمد سعدی۔ زخم زخم نغمہ، ناشر انجمن ادب ڈھاکا۔ فروری ۱۹۸۰ء ص سرورق

Dhaka University Institutional Repository

فضل شہاب الدین کی نظم "بھالو باشا" کا ترجمہ انہوں نے "محبت" کے نام سے کیا۔ ان تراجم سے چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں :

"محبت نام ہے آہستہ آہستہ اپنی موت کی جانب قدم بڑھانے کا
محبت جو نہ کی تم نے تو یہ سمجھو رہائی پا گئے ہو تم
محبت تو فنا ہونے کو کہتے ہیں
فنا جو تیز بھی ہے، تند خو بھی ہے
فنا تکمیل ہستی ہے
فنا تکمیل خواہش ہے
فنا موسوم ہیبت ہے

احمد سعدی بنگلہ دیش کے سنجیدہ و کہنہ مشق افسانہ نگار کہلانے کے مستحق ہیں۔ گرچہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۷۱ء تک ان کی بیشتر کہانیاں اور نظمیں تراجم ہیں تاہم ۱۹۷۱ء کے بعد سے اپنے آخری ایام تک باضابطہ طبعزاد کہانیاں و نظمیں سپرد قلم کیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ "مٹی کی خوشبو" اور "دود چراغ محفل" (مشترکہ) میں اس دور کی غمازی ملتی ہے۔ احمد سعدی کا قوت مشاہدہ اور نفسیاتی شعور غائر تھا۔ انہوں نے مختلف دور دراز ملکوں کا سفر بھی کیا۔ ایک فطری افسانہ نگار کی طرح ان کا دل حساس اور آنکھیں دور بین تھیں۔ انہوں نے اپنے کل تجربات کو افسانوی شکل میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی "مٹی کی خوشبو" اور دود چراغ محفل" کے عنوان سے ان کتابوں کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مجموعوں میں بنگلہ دیش کی مٹی کی سوندھی خوشبو بھی ہے اور چراغ کی طرح جلتے ہوئے عوام کا دھواں بھی۔ احمد سعدی نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی سیاسی بد اعمالیوں کے نتائج میں مقامی و غیر مقامیوں کی آپس میں غیر تناک خونریزی اور قیام بنگلہ دیش کے بعد نئے ملک کی حیثیت سے اُس کے سیاسی سماجی مسائل معاشی افراتفری کی وجہ سے معاشرہ میں آگ کی طرح پھیلنے والی اخلاقی برائیاں رشوت، چوری، ڈاکہ زنی، زنا کاری، اور عصمت فروشی جیسے ناگفتہ بہ حالات آئینہ داری کی ہے۔ "پہلا آدمی" "تیسرا دن" ان کا علامتی افسانہ ہے جس میں انہوں نے ملک کے سیاسی نظام میں جمہوریت کے فقدان کا پس پردہ شکوہ کیا ہے۔ "تہذیب" مغربی جرمنی کی موجودہ تہذیب کی آئینہ دار ہے

Dhaka University Institutional Repository

اس میں انہوں نے مغربی جرمنی کی فلک بوس سائنسی و مشینی ترقی کے نیچے دبتی ہوئی انسانیت کی غمازی بھی کی ہے اور ان کی ترقی کو تیسری دنیا کے غیر ترقی یافتہ ممالک کے لئے استحصال قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ ساری باتیں انہوں نے افسانے کے کردار جرمنی باشندے ایباہرڈ کی زبان سے کہلوائی ہے۔

" میں مغربی جرمنی کی اس پالیسی کا سختی سے مخالف ہوں جس کے تحت تیسری دنیا کے غیر ترقی یافتہ ممالک کا استحصال کیا جا رہا ہے۔"

"شب گزیدہ" میں آشوب شہر کا بیان بڑے دلسوز انداز میں کیا ہے۔

سعدی کے افسانوں میں کماحقہ طوالت کی خامی رہ گئی ہے۔ تاہم موضوع اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ان نے افسانے مفید و دلچسپ ہیں۔ سعدی کی کہانیوں کو زمان و مکاں کے پیمانے پر ناپا جائے تو یہ تقاضائے وقت کو پوری کرتی دکھائی دیتی ہے۔ بحیثیت مجموعی سعدی کی کہانیاں کارآمد ہیں۔ ان کا افسانہ "شب گزیدہ" سے ایک اقتباس بہ طور مثال ملاحظہ ہوں۔

" شہر میں شام ہی سے کرفیو لگا ہوا تھا اور ہر شخص اپنے اپنے گھر میں دروازہ کھڑکی بند کئے ہوئے، دل میں ایک انجانا خوف سمیٹے سراسیمہ اور حواس باختہ بیٹھا ہوا ہے۔ ہر طرف گہری خاموشی اور موت کی ویرانی چھائی ہوئی تھی کبھی کبھی شاہراہ پر پولیس کی جیپ تیزی سے گزر جاتی۔ چند لمحوں کے لئے فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا پھر سکوت مسلط ہو جاتا۔"

احمد سعدی بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے انہوں نے اپنے دیگر اصناف سخن پر افسانہ نویسی کو ترجیح دی۔ انکے ادبی ذوق و شوق نے انہیں شعر و شاعری کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی لیکن انکی فنی صلاحیت افسانوں میں اجاگر ہے وقتاً فوقتاً وہ نظم اور غزل پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ افسانے کی طرح شاعری میں بھی انہوں نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور عصری حالات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی۔ ان کا رویہ ترقی پسندانہ ہے۔ طرز نگارش سادہ، متین اور دلچسپ ہے۔ مثال کے طور پر انکی نظم " وہ لوگ بڑے ہی مخلص تھے" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جو انہوں نے ۲۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ایک نشست سے متاثر ہو کر لکھی۔

کچھ دیر محفل گرم رہی — کچھ دیر دریا بہتا رہا
پھر شعر کی محفل ختم ہوئی — پھر پیار کا دریا تھم سا گیا
جب ان سے بچھڑ کر آنے لگا — وہ لوگ بہت رنجیدہ تھے
میں ان سے جو کہتا، کیا کہتا — میں خود بھی بہت رنجیدہ تھا

Dhaka University Institutional Repository

نوشاد نوری

(۱۹۲۶ء - ۲۰۰۰ء)

اصل نام محمد مصطفےٰ ہاشمی ۔ قلمی نام نوشاد نوری تھا۔ موضع بسنت پور ضلع دربھنگ صوبہ بہار (ہندوستان) میں ۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ان کی پیدائش ہوئی۔ والد عبدالکافی (بی اے بی ایل بی) کا پیشہ وکالت ۔ نوشاد نے بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی تھی ۔ ۱۹۵۱ء میں سابق مشرقی پاکستان آگئے۔ اور ڈھاکے سے آڈٹ اینڈ اکاونٹس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء تا ۱۹۶۰ء آڈٹ اینڈ اکاونٹس آفیسر کی حیثیت سے ڈھاکا، کراچی اور کوئٹہ میں ملازمت کی۔ ۱۹۶۰ء میں ڈھاکے آگئے۔ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۳ء کچی کاروبار میں مشغول رہے۔ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۷ء انہوں نے پاکستان فیچر سنڈیکیٹ ڈھاکا میں صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔ جنوری ۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۸ء "روداد" ڈھاکا (نیشنل عوامی پارٹی کا اخبار) اور شیخ مجیب الرحمٰن کا ہفت روزہ "جریدہ" ڈھاکا کے ایڈیٹر رہے۔

نوشاد نوری تقسیم ہندوستان کے قبل ہی سے ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ اشتراکی نظریات کے قائل تھے۔ ان کی نگاہ بڑی دوربین اور دل وسیع تھا۔ وہ عالمی بھائی چارگی کے حامی تھے ۔ ان کی شاعری انسانی ہمدردی کے محور پر رواں دواں تھی ۔ پاکستان کے دونوں حصے میں وہ جہاں بھی رہے مقامی شعراء و ادباء سے اخوت و بھائی چارگی کا رشتہ استوار رکھا۔ لسانی و مقامی تعصب سے بیزار رہے۔ یہ ان کی بلند نظری اور بلند حوصلگی کی پہچان ہے۔ پاکستان میں قیام کے دوران (۱۹۶۰ء تک) ان کے بے تکلف دوستوں میں حمایت علی شاعر۔ حبیب جالب، ابراہیم جلیس، احمد فراز، صہبا لکھنوی، محشر بدایونی، سلیم احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔ سابق مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں بنگلہ دیش کے شعراء و ادباء سے ان کا گہرا ربط رہا۔ خاص کر "روداد" و "جریدہ" کی ادارت نے ان کو بنگلہ ادیبوں اور شاعروں میں بے حد مقبول کر دیا تھا۔

وہ ہر ہفتہ کسی نہ کسی شاعر یا نثر نگار کی بڑی تصویر کے ساتھ ان کا انٹرویو قارئین کے لئے شائع کرتے تھے۔ بنگلہ زبان کے ادیبوں میں ان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علیم اللہ صدیقی لکھتے ہیں:

"جنرل ارشاد (سابق صدر بنگلہ دیش) کے دور صدارت میں دو کل ایشائی مشاعرے ڈھاکا میں منعقد ہوئے میں منعقد ہوئے۔ صدر موصوف جو خود بیف پیٹرون تھے اور ایشائی شاعروں کے انتخاب کے لئے نوشاد نوری کو

۰۰ پاکستان فیچر سنڈیکیٹ کی ذمہ داری یہ تھی کہ مشرقی پاکستان سے متعلق مختلف موضوعات پر مغربی پاکستان کے انگریزی اردو اخبارات کے لئے فیچر لکھے جائیں۔ اس کے سربراہ صلاح الدین محمد تھے۔ بحوالہ نوشاد نوری۔ ۱ روداد آشنائی ص ۲۷

Dhaka University Institutional Repository

افسر رابطہ مقرر کیا گیا۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء میں دو شعری تقاریب ڈھاکے میں منعقد ہوئیں۔ پاکستانی شعراء احمد فراز، حمایت علی شاعر، ضمیر حسن جعفری، کشور ناہید اور پروین شاکر نے تقریبات میں شرکت کی۔"[1]

بنگلہ دیش کی اردو ادب کی تاریخ میں نوشاد نوری کے تعاون میں یہ دونوں ایشیائی مشاعرے قابل ذکر ہیں۔ میرا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ۱۹۷۱ء کے بعد بنگلادیش میں نوشاد نوری کی اردو ارباب قلم میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ ہند و پاک کے شعراء سے ان کے مراسلات آخری ایام تک جاری رہے۔

شعر گوئی میں نوشاد نوری کسی کے مقلد نہیں رہے انہوں نے اپنا جادہ آپ بنایا۔ اور اس پر گامزن رہے ویسے قدیم شعرا میں وہ غالب کے پرستار تھے۔ اور ہمعصر شعراء میں میراجی، فیض احمد فیض، حمایت علی شاعر، احمد فراز انکے محبوب شعرا تھے۔ بنگلا زبان کے شعراء میں اسد چودھری ان کے جگری دوست تھے۔ نوشاد نوری نے اپنا شعری مجموعہ "رہ و رسم آشنائی" کا انتساب اسد چودھری کے نام ان الفاظ میں کیا ہے۔

بنگلادیش کے انسان دوست، ادب نواز
اور عظیم بنگلا شاعر
اسد چودھری کے نام!

نوشاد بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔

بقول نوشاد نوری ان کے شعری محرکات اور ادبی رجحان حسب ذیل ہیں۔

"زمیندار گھرانے کی انحطاط پذیری، زبوں حالی، انسانی دکھوں کی فراوانی اور انسانیت کی بے چارگی غور و فکر پر اثر انداز ہوئی۔ میری وابستگی ترقی پسند رجحان سے ہے جس کی بنیاد ادب دوستی، وطن دوستی اور انسان دوستی پر قائم ہے۔ سیاسی تحریک میں مارکسسٹ پارٹی اور ادبی تحریک میں انجمن ترقی پسند مصنفین سے ہوں۔"[2]

نوشاد کا شعری و ادبی لائحہ عمل انسانی زندگی کی تنقید اور ادب دوستی تھی۔ ان کا رجحان ترقی پسند تھا۔ لیکن وہ ادب برائے اسلام کے منکر نہیں تھے۔ انہوں نے حمد یا نعت لکھتے ہوئے مولویانہ رنگ اختیار نہیں کیا۔ نعت گوئی

[1] "رہ رسم آشنائی" "نوشاد نوری ـــــ میرا دوست" علیم اللہ صدیقی۔ ص ۲۷ ۲ میرے سوالنامے کے جواب میں موصوف نے معلومات بہم پہنچائیں

Dhaka University Institutional Repository

میں بھی ان کا ترقی پسند رنگ کار فرما ہے۔ انہوں نے نعت لکھتے ہوئے بھی اس اہم نقطے کی طرف اشارہ کیا کہ اسلام دراصل فوق البشر کا درس دیتا ہے اور اس "فوق البشر" میں انسانیت کے سارے اوصاف پنہاں ہیں! مثال کے طور پر انکی نعت سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

تعارف یہ کہ ہم ہی رہ گئے ہیں
زمیں پر معتبر پہچان والے
بشارت اے جہاں! فوق البشر ہیں
قیامت تک ہمیں قرآن والے

ایک دور بین شاعر کی طرح نوشاد کی نگاہ ماضی، حال اور مستقبل پر رہی۔ انہوں نے ماضی سے رشتہ برقرار رکھ کر حال پر دوستانہ لہجے میں تنقید کرنے کی کوشش کی۔ نوشاد ایک پرسکون مستقبل کی تلاش میں رہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں ظلم و استبداد، حق تلفی، ناانصافی سے حقارت کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عصری حالات سے بیگانہ نہ رہ سکے۔ عالمی سطح پر رونما ہونے والے سیاسی، معاشی اور عام انسانی واقعات پر بھی ان کی گرفت مضبوط رہی۔ انہوں نے مقامی اور عالمی دونوں سطح پر اپنے تعلقات کو استوار رکھا۔

انہوں نے عصری حالات کی تنقید کرتے ہوئے "کاغذ کی ناؤ" میں سابق مشرقی پاکستان کی لسانی تحریک اور مہاجروں سے کشیدگی کو موضوع بنایا ہے۔ "طوفان صحرا" میں عراق پر امریکہ کے بے تحاشہ ہوائی حملے کی ترجمانی کی ہے۔ اور شب آخر" میں آیت اللہ خمینی کی پالیسی پر تنقید کی ہے۔ "قبلۂ اوّل" انہوں نے سرزمین بنگلہ دیش کی محبت میں لکھی ہے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حوالہ بنگلہ دیش کی سرزمین ہے جس میں ایک طویل عمر گزارنے کے بعد وہیں خاک ہوئے۔

الفاظ کا صحیح استعمال، محاوروں کی برجستگی اور زبان و بیان کی صحت کا لحاظ، شیرینی اور ملاحت نوشاد کے کلام کی فنی خوبیاں ہیں۔ انہوں نے موقع و محل کی مناسبت سے جا بجا ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جن سے ان کی نظموں میں قاری کو ہندی کے نرم و نازک گیتوں کی سرود محسوس ہوتی ہے۔ ان کی دیگر انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ نظموں میں تغزل کی شان پیدا کر دی ہے قادی نوشاد کی نظموں میں غزل کا لطف محسوس کرتا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ ایک خامی یہ ہے کہ ان کے کلام میں جا بجا ابہام پائی جاتی ہے۔ نوشاد کی نظم دیباچہ سے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں انہوں نے اپنی شاعرانہ فکر انگیزی پر روشنی ڈالی ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

لمحات کو لفظوں کی طرح پیش کیا ہے

تیرے لب و رخسار کی توصیف میں ہم نے

لمحات کو ہیرے کی طرح ٹانک دیا ہے

تیری روشِ نرم کی تعریف میں ہم نے

نوشاد کی شاعری تقاضائے وقت ہے جو مورخین کے لئے وقعت رکھتی ہے۔ وہ اپنی نظم "روایت" میں لکھتے ہیں:

میرے مخطوطہ کمیاب کو محفوظ رکھو

اس حوالے کی مورخ کو ضرورت ہوگی

اس کٹھن دور کی ناگفتہ صداقت لوگو

میری ہی ذات گرامی سے روایت ہوگی

نوشاد اپنے وطن (بنگلہ دیش) کی مٹی کو سجدے کے قابل سمجھتے ہیں۔ ان کی نظم "قبلۂ اوّل" سے دو اشعار ملاحظہ ہوں

نسل و تاریخ و تمدن کے سپہ سالار و

حفظِ اجزاء کی جنوں خیز گھڑی آپہنچی

یہی مٹی جو مرے پاؤں دھرے بیٹھی ہے

اس پر سجدے کی دلآویز گھڑی آپہنچی

بحیثیت مجموعی نوشاد کی شاعری میں بنگلادیش کی زندگی کی نمایاں جھلک بخوبی دیکھی جاسکتی ہے اس حوالے سے انکی شاعری ایک آئینہ ہے۔ مثال:

کشتیاں میگھنا کی ساحل پر

کھا رہی ہیں ہوائیں ہچکولے

اڑ رہا ہے خیال کی مانند

چاند ہوا میں پر کھولے

Dhaka University Institutional Repository

ہوئے ہوئے کہیں کہیں
ہے کسی ناؤ کا سفر جاری
اور ڈھیوہ یہ ڈگمگاتی ہے
جھلملاتے دیئے کی چنگاری

نوشاد نوری کا شعری مجموعہ "رہ و رسم آشنائی" سنہ ۲ء میں کلکتے سے شائع ہوا۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ "روزنِ دیوار" سنہ ۲ء میں ڈھاکے سے شائع ہوا۔

ان کی نثری خدمات میں چند مفید کتابوں کے دیباچے اور مضامین شامل ہیں۔ جو مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ان کے مضامین کی حیثیت تاریخی ہے۔ نوشاد کی تنقید اپنے اصول کے ڈگر سے ہٹ کر مداحی کے سرحد تک پہنچ گئی ہے تاہم ان کے مضامین "اردو ادب کے بیس سال" "تیسری نسل سے پہلے" "ادب اور قومی ورثہ" وغیرہ مفید مضامین ہیں۔ نظم ہو یا نثر ہر جگہ وہ اپنی تان بنگلادیش تک کھینچتے ہیں۔

نمونہ نثر :

"بنگلادیش کا پاکستان کی سیاسی تاریخ سے تیئیس سال تک ربط رہا ہے اور ان دونوں آزاد ممالک کا ہندوستان کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ سے ہزاروں سال کا رابطہ ہے اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ہماری سیاسی و تہذیبی تاریخ کے بہت سے ابواب مشترک ہیں[1]"

نوشاد نوری نے ۱۷ جولائی سنہ ۲ء کو ڈھاکے میں انتقال کیا۔ محمد پور جامع مسجد سے ملحق قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

---

[1] نوشاد نوری "ادب اور قومی ورثہ" رسالہ "ماحول" چاٹگام ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۱

Dhaka University Institutional Repository

منوّر احمد صدیقی

۱۹۳۶ء - ۶ جون ۲۰۰۰ء

نام منور احمد صدیقی۔ تخلص منوّر ساکن چنوتی۔ تھانہ سات کانیہ ضلع چاٹگام ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ والد محمد ہارون صدیقی تقسیم ہندوستان سے قبل آسنسول میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ منور صدیقی کا گھریلو ماحول علمی تھا۔ انہوں نے چنوتی حکمیہ مدرسہ چاٹگام سے فاضل اور ۱۹۵۱ء میں عالم کی سند حاصل کرنے کے بعد پٹیہ مدرسہ چاٹگام میں داخلہ لیا اور علم حدیث اور کتابت پر مزید تعلیمات حاصل کیں اور فراغت تعلیم کے بعد انہوں نے کتابت کو ذریعہ معاش کی حیثیت سے اختیار کیا۔ کتابت ان کے لئے فال نیک ثابت ہوئی۔ چاٹگام کے اردو تالیفات و تصنیفات و رسالوں کی اشاعت میں بحیثیت کاتب مقدور بھر تعاون جاری رہا ہے[1]

سنہ ۱۹۵۲ء سے سنہ ۱۹۶۸ء مختلف ادبی رسالوں اور ماہناموں کے نام یہ ہیں۔

(۱) ماہنامہ خرام، (مدیر کاوش عمر)

(۲) ماہنامہ کرنافلی (مدیر کاوش عمر)

(۳) ہفتہ وار "مشرق" (مدیر مبین)

(۴) ادبی رسالہ "فالوس" چاٹگام سٹی کالج

(۵) " "کہکشاں" چاٹگرام کالج

(۶) اسلامیہ اردو اسکول کے میگزین

منور صدیقی کو عربی، فارسی و اردو زبان پر دستگاہ حاصل تھی۔ بچپن سے ان کی طبیعت اردو زبان کی طرف مائل رہی۔ اس کے علاوہ کتابت سے ان کی معاشی وابستگی بھی تھی۔ لہذا انہوں یہ کام بڑی دلجوئی اور لگن سے انجام دیئے۔ ان کی اس خدمت سے زبان اردو کو خاطر خواہ فائدہ حاصل رہا۔ اس وقت چاٹگام مقیم ادبی شخصیات مثلاً کاوش عمر، اصغر راہی، مبارک مونگیری، انیس اعجازی، ادیب کاکوی، اقبال عظیم (صدر شعبہ اردو چاٹگام کالج) سعد منیر (شعبۂ اردو چاٹگام کالج) وغیرہ سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ ان اردو ارباب شعر و ادب کی صحبت نے منور صدیقی کے شاعرانہ ذوق کو پنپنے کا مزید موقع فراہم کیا۔ انہوں نے اردو، فارسی و عربی زبان میں شاعری کی ہے۔

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں منور صدیقی نے اپنے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کیں۔ مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۹۶ء

Dhaka University Institutional Repository

نظم ہو یا نثر ہر جگہ ان کی طرز تحریر عام فہم و سنجیدہ ہے۔ حمد، نعت کے علاوہ نظم اور غزل بھی لکھی ہے۔ غزل میں صوفیانہ رنگ غالب ہے

منور صدیقی کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصنیفات حسب ذیل ہیں :

(۱) تنویر المشکوٰۃ : ڈھائی سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مشکوٰۃ شریف کے کچھ اقتباسات کے ترجمے و تشریح و نکات و مسائل کا بیان صاف اور سلیس اردو میں کئے ہیں۔ (مطبوعہ)

(۲) شام و سحر : نو صفحات پر مشتمل حمد و نعت کا مجموعہ (مطبوعہ)

(۳) گل و شبنم : بتیس ۳۲ صفحات پر مشتمل نعتوں کا مجموعہ (مطبوعہ)

(۴) معراج کی رات : متفرق اشعار، صفحات سولہ ۱۶ (مطبوعہ)

(۵) دشتِ انوار : چوالیس ۴۴ صفحات پر مشتمل اردو غزلوں کا مجموعہ (غیر مطبوعہ)

(۶) شورشِ بریلوی : غزلوں کا مجموعہ، صفحات سولہ ۱۶ (مطبوعہ)

(۷) نگارستان : فارسی شاعری کا مجموعہ (غیر مطبوعہ)

(۸) ینابیع الایمان عربی شاعری کا مجموعہ

(۹) دستِ جنوں عربی، فارسی و اردو غزلوں کا مجموعہ (غیر مطبوعہ)

نمونہ کلام یہ ہے۔

نعت

اصولِ ابتدا و انتہا کا رازداں تم ہو
ظہورِ بزمِ قدرت ہو سرورِ عاشقاں تم ہو
ارادہ و مشیت حضرت باری کا تم ہی تم
علوِ مرتبہ حدِ ادب جانِ جہاں تم ہو

غزل

چراغِ راہ ہوں مجھ کو ہوائے تند سے کیا ڈر ہے
مقید ساحلِ دریا نہیں، صحرا مرا گھر ہے

Dhaka University Institutional Repository

منوّر انجمن میں اپنی گرآسودہ نظروں میں
میں اپنے غم کا ساتھی ہوں تو اپنے دل کا سرور ہے

چاٹگام کے اردو ادبی حلقے میں منوّر صدیقی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ بنگالی نژاد ہوتے ہوئے ان کی اردو و فارسی ادب نوازی قابل تحسین ہے۔ ان کے کلام قابل قبول ہیں۔ اردو شاعروں میں ان کا درجہ معیاری کہا جاسکتا ہے۔

منوّر صدیقی طالب علمی کے زمانے سے تادمِ آخر مسلم لیگ کے حامی رہے۔ انقلاب بنگلادیش کے بعد وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکے تھے۔ کچھ دنوں تک ان پر جنون طاری رہا۔ زندگی کے آخری ایام انہوں نے خاموشی اور گوشہ نشینی میں گزارے۔

۶ر جون ۱۹۷۲ء کو موضع چیونی ضلع سات کانیہ (چاٹگام) میں اپنی رہائش گاہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے[1]۔

---

[1] ڈھاکے میں مقیم منوّر صدیقی کی عزیزہ سکینہ بیگم کا بیان

Dhaka University Institutional Repository

ذاکر عزیزی

(۱۹۳۴ء - ۱۱ مئی ۲۰۰۱ء)

ذاکر عزیزی کا نام بنگلا، پاک و ہند کے اردو ادبی محفلوں میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ افسانہ نویس، صحافی اور مضمون نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

ذاکر عزیزی کی پیدائش ۱۹۳۴ء میں ضلع مونگیر بھارت میں ہوئی۔ تقسیم ہندوستان کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ ساتق مشرقی پاکستان آئے اور سید پور میں سکونت اختیار کی[1]۔ انہوں نے سید پور سرکاری ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں جگناتھ کالج ڈھاکا داخلہ لیا اور بی۔ اے کی حاصل کی۔ اسکول میں طالب علمی کے زمانے میں ان کا مشغلہ شعر و شاعری رہا۔ ان کی غزلیں روزنامہ انقلاب ڈھاکا، روزنامہ پاسبان ڈھاکا اور میزان ڈھاکا میں شائع ہوتی رہیں۔ بقول موصوف، ادیب سہیل (افسانہ نگار) کے مشورے سے انہوں نے شاعری ترک کر کے افسانہ نگاری کا شغف اختیار کیا۔ ۱۹۵۶ء سے انہوں نے باضابطہ افسانہ لکھنا شروع کیا۔ ان کی پہلی کہانی "بچھڑے دوست" اور دوسری کہانی "انجام غربت" روزنامہ پاسبان میں شائع ہوئیں۔ افسانہ نویسی اور صحافت ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ آخری سانس تک اس سے منسلک رہے۔ ۱۱ مئی ۲۰۰۱ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے پر ذاکر عزیزی نے انتقال کیا۔ اور سید پور قبرستان میں دفن ہوئے۔

ذاکر عزیزی کے افسانوں کا مجموعہ "میرا جسم کریزہ کریزہ" زیر طبع تھا کہ موصوف اس دار فانی سے گزر گئے۔ انہوں نے متعدد افسانے لکھے جو مختلف اردو ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ذاکر عزیزی کا نفسیاتی شعور اور قوت مشاہدہ اچھا تھا۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش کے سماجی ماحول کا غائرانہ مشاہدہ کیا۔ اور ان تجربات کو سیدھے سادے انداز میں افسانوی جامہ پہنانے میں ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ ان کے افسانوں میں بنگلادیش کی راجدھانی ڈھاکا کی عمارتوں میں رہنے والے نیک و بد اور جھونپڑوں میں بسنے والے مفلسوں کی خانگی زندگی کی عکاسی ہے۔ انہوں نے افسانوں کے دلوں میں پوشیدہ رہنے والے نیک و بد خواہشات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی۔ تکنیک کے لحاظ سے ان کے افسانے اچھے کہے جا سکتے ہیں۔ ذاکر عزیزی کے افسانوں کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں طوالت کا عیب نہیں ہے۔ انکے کردار قاری کو اپنے آس پاس چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاثر کا ارتکاز اور حقیقت نگاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے افسانے

---

[1] "بنگلادیشی اردو چھوٹو گولپو" (بنگلا تراجم افسانوں کا انتخاب) مطبوعہ شاہکار پبلی کیشنز۔ فروری ۱۹۹۲ء ص ۳۶

Dhaka University Institutional Repository

بیانیہ ہیں جس میں روایتی انداز کی ہلکی سی آمیزش ہے ۔ بہ حیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذاکر عزیزی افسانہ نگاری کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ شعلہ شعلہ شبنم" "برگ آوارہ" "دھند" "اندر کا آدمی" اچھے افسانے ہیں ۔

نثری کارناموں میں ذاکر عزیزی کا سفر نامہ مفید ہے ۔ "شہر شہر دیوانہ" کے عنوان سے ان کا سفرنامہ پاکستان اور بھارت کے چند شہروں کی سیاحت پر مشتمل ہے ۔ اس مضمون میں مصنف نے پاکستان اور ہندوستان کے اردو شعراء و ادباء سے ملاقات اور ادبی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا ہے ۔ جو ان کا بخی رسالہ "انتخاب" نومبر ۱۹۸۶ء اور دسمبر ۱۹۸۶ء میں قسط وار شائع ہوا ۔ اردو ادب سے منسلک رہنے والوں کے لئے یہ مضمون کارآمد کہا جا سکتا ہے ۔

صحافت کے میدان میں ذاکر عزیزی کا بہترین کارنامہ سید پور سے "انتخاب" کا اجرا ہے ۔ اس کے پانچ شمارے شائع ہوئے جن میں بنگلا، پاک و ہند کے معتبر شعراء و ادباء کی تخلیقات شائع ہوتے رہے ۔

نمونہ افسانوی ادب :

... "بیلو نے بڑے کرب کے ساتھ مکرم علی کو بتایا کہ 'مکرم یار! میں سچ کہتا ہوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ دھندا مجھے قطعی اچھا نہیں لگتا ۔ میرا ضمیر الیا دھندا کرنے سے مجھے روکتا ہے ۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں بہت بڑا گناہ کر رہا ہوں اور کبھی کبھی جانے کیوں میرا جی یہ چاہنے لگتا ہے کہ میں بھی ان کوٹھیوں میں رہوں ۔ میں بھی کار میں بیٹھ کر ادھر اُدھر کی سیر کروں ۔"[1]

---

[1] ذاکر عزیزی ۔ "برگ آوارہ" "مجلس" ڈھاکا (ادبی رسالہ) جنوری ۱۹۸۸ء ص ۸۶

Dhaka University Institutional Repository

شام بارکپوری

(۱۹۴۴ء - دسمبر ۲۰۰۶ء)

اصل نام شاہ محمد۔ قلمی نام۔ شام بارکپوری۔ یکم نومبر ۱۹۴۴ء کو موضع بارک پور۔ ضلع چوبیس پرگنہ مغربی بنگال کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہندوستان کے بعد بچپن میں والدین کے ہمراہ کھلنا آئے اور مستقل رہائش اختیار کی۔ خاندانی پیشہ تجارت تھا۔ ۱۹۶۱ء میں کھلنا سے میٹرک اور ۱۹۶۳ء میں دولت پور کالج کھلنا سے انٹرمیڈیٹ کا پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور اورنٹیل کالج لاہور سے پوسٹ گریجویٹ کی ڈگری حاصل کی[1]۔ لاہور میں حصول تعلیم کے دوران انہیں پروفیسر وقار عظیم، قیوم نظر، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی جیسے ادبی اکابر کی مفید ادبی مشوروں سے فیضیاب ہونے کا موقع حاصل رہا۔ جس سے ان کے ادبی ذوق و شوق کو پنپنے کا بھرپور سہارا ملا۔ وہ اپنے قلمی کاوش میں لگے رہے۔ رفتہ رفتہ انکی پہچان ایک معیاری افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوگئی۔ شام کا شمار ان ادبی حلقوں میں ہے جنہوں نے ۱۹۷۱ء کے بعد بنگلہ دیش کی سرزمین کو دل و جان سے قبول کیا۔

شام اپنی افسانہ نگاری کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

"۱۹۵۵ء میں جب میں پانچویں جماعت کا طالبعلم تھا تو سب سے پہلے بچوں کی کہانی "حمید چڑیوں کے دربار میں" لکھی تھی۔ جو ماہنامہ کراچی مئی ۱۹۵۶ء میں چھپی۔ سب سے پہلا ڈرامہ "کالی بلی" ماہنامہ نفسیات کراچی (عورت نمبر) ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ میرے قلم نے سب سے پہلا افسانہ صفحۂ قرطاس پر بکھرا وہ آنسو" تھا۔ یہ افسانہ فروری ۱۹۵۷ء کے فنکار کراچی میں "آنکھوں کا چین" کے عنوان سے شریک اشاعت ہوا تھا۔ اس کے بعد میرے تمام افسانے ہند و پاک کے تمام معیار رسالوں میں شائع ہوتے رہے[2]"

پروفیسر گوپی چند نارنگ شام کی افسانہ نگاری پر اپنی رائے الفاظ میں کرتے ہیں۔

---

[1] سرور ق رجنی گندھا (افسانوی مجموعہ) شام بارکپوری [2] شام بارکپوری "کرشنا چوڑا کے سائے میں"۔ ص ۴

[2] صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

Dhaka University Institutional Repository

"شام پارک پوری ان ادیبوں میں سے ہیں جو بنگلہ دیش میں اردو کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔ ان کے افسانے دراصل دریچے ہیں۔ جن سے بنگلہ دیش کی سرسبزی اور شادابی کھیتوں اور کھلیانوں کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں ایشیائی ملکوں کی بڑھتی ہوئی آبادی اور بھوک کی تصویریں بھی ہیں۔ جن سے نبرد آزما ہونے کے لئے مصنف کی روح بے قرار ہے[1]"

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی (شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی) شام کی افسانہ نگاری پر رائے ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"آپ نے علاقائی پس منظر میں جو تصاویر پیش کی ہیں انہوں نے ایک طرف تو منظر نگاری کا حق ادا کیا ہے اور دوسری طرف اس رشتہ کو ان اقدار سے ملا دیا ہے جن کی تبلیغ آپ کرنا چاہتے ہیں کرداروں کی نفسیات کا مطالعہ دلچسپ ہے[2]"

افسانہ نگاری میں شام کسی خاص حلقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ موصوف کے زبانی بیان کے مطابق انہیں بچپن ہی سے افسانہ پڑھنے اور لکھنے کا شوق رہا۔ ٹالسٹائی، چیخوف، موپاساں کے علاوہ پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی کے متعدد افسانوں کا مطالعہ کیا۔ ان کے اسلوب تحریر سے متاثر ضرور ہوئے لیکن کسی کا خاص پیرو ہونا گوارا نہیں کیا۔ افسانہ نویسی میں ان کا ایک انفرادی رنگ ہے۔

شام پارک پوری کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

(۱)	پدما کی موجیں (بیس مختصر افسانوں کا مجموعہ)	مطبوعہ لیتھو آرٹ پریس ڈھاکا۔	ستمبر ۱۹۷۹ء افسانہ
(۲)	میگھنا کی لہریں	" " "	۱۹۸۰ء "
(۳)	جمنا کے دھارے (سولہ مختصر افسانوں کا مجموعہ)	" " "	۱۹۸۴ء "
(۴)	سورج مکھی	" " "	۱۹۸۶ء "
(۵)	رجنی گندھا	برقی آرٹ پریس زندہ بہار لین ڈھاکا	۱۹۹۰ء "
(۶)	کرشنا چوڑا کے سائے میں	مطبوعہ لیتھو آرٹ پریس ڈھاکا	۱۹۸۷ء (ناول)
(۷)	آتشی چنار	کلچرل اکیڈمی اقبال روڈ۔ محمد پور ڈھاکا۔	یکم نومبر ۱۹۹۱ء (ناولٹ)

---

[1] سرورق۔ جمنا کے دھارے۔ شام پارک پوری [2] سرورق جمنا کے دھارے

Dhaka University Institutional Repository

(۸) رنگ ویو کی سرزمین — کلچرل اکیڈمی اقبال روڈ محمد پور ڈھاکا۔ — دسمبر ۱۹۹۱ء — (سفرنامہ)

(۹) چاند ستاروں کی کہانی — 〃 〃 〃 — یکم نومبر ۱۹۹۱ء — (بچوں کی کہانیاں)

ڈاکٹر ابو سعید نور الدین شام بارکپوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

ان کا پہلا مجموعہ "پدما کی موجیں" جو ستمبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ نہ صرف بنگلا دیش میں اردو کا پہلا افسانوی مجموعہ تھا بلکہ سابق مشرقی پاکستان کے چوبیس سالہ دور میں بھی اردو کا کوئی افسانوی مجموعہ اس سرزمین شائع نہیں ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں افسانہ نگار نے وہ تمام افسانے شامل کر لئے تھے جو ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۶ء کے عرصے میں لکھے گئے۔ انہوں نے اشاعت کے دوران چیدہ چیدہ افسانے شامل نہیں کئے کہ مستقبل کے محقق اور نقاد کو افسانہ نگار کی ذہنی پرداخت اور قوت تخلیق کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو اسی طرح انہوں نے اپنا دوسرا افسانوی مجموعہ "میگھنا کی لہریں" میں بھی کوئی ردوبدل نہیں کیا۔ اور ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک اپنے تمام افسانوں کو شریک کر کے اپنی اصلیت برقرار رکھی۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۵ء تک افسانہ نگار بالکل خاموش رہا۔ طویل خاموشی کے بعد ۱۹۷۵ء میں "آٹھ کروڑ کا زخم" منصۂ شہود پر آیا۔ یہ افسانہ بنگلا زبان میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ اس کے بعد افسانوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو آج بھی جاری ہے۔[1]

شام بارک پوری کا افسانوی موضوع بنگلا دیش ہے۔ کچھ کہانیوں کے موضوعات دور دراز ملکوں سے وابستہ ہیں لیکن ان میں بھی بھی جن اقدار میں بنگلا دیش سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کا انہوں نے بھرپور انکشاف کر دیا ہے۔ اس ضمن میں ان کی ناولٹ "آتشی چنار" کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ مثلاً جب کشمیری خاتون کشمیر کے نفیس "شال" کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ

"مغلیہ دور حکومت میں جب اس صنعت کو فروغ حاصل ہوا تو ایسی نفیس قسم کی شال بنتی کہ ڈیڑھ گز کا ٹکڑا لپیٹ کر ایک انگوٹھی کے بیچ سے نکالا جا سکتا تھا۔"

مذکورہ بیان کو سن کر شام بارک پوری جو اپنے ناولٹ "آتشی چنار" میں ایک کردار کی حیثیت رکھتے ہیں ڈھاکے کی ململ کی خصوصیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر نور الدین "نئی نسل کے افسانہ نگار شام بارک پوری" انکشاف ڈھاکہ فروری ۱۹۸۶ء ص ۵۷

Dhaka University Institutional Repository

"ڈھاکے کی ململ کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ ململ کی ایک تھان ماچس کی ایک ڈبیا کے اندر سے گزر سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ انگریزوں نے وہاں کے کاریگروں کی انگلیاں کٹوا دیں تاکہ لندن سے آئے ہوئے مال کی فروخت بہ آسانی ہو سکے۔"

شام بارک پوری کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا مقامی رنگ اور منظر نگاری ہے ان کے افسانوں میں دریاؤں میں رواں دواں کشتیاں، ملاحوں کے رسیلے گیت، پن گھٹ پر بھیگی ساڑی میں ملبوس حسن بنگالہ، جھیلوں میں تیرتے ہوئے کنول، دریاؤں میں منڈلاتے آبی پرندے، سندربن کے خوبصورت جنگلات، رانگا ماٹی کی پہاڑیاں، دریائے پدما، گنگا و کرنا فلی کی لہریں، سرسبز دھان کے کھیت، بانس کے جھنڈ، چائے کے باغات، ناریل اور سپاری کے درختوں کی قطار، کرشنا چوڑا کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت، بُو کُھا کوُ" (بنگال کی مخصوص چڑیا) کی آواز" بڑے دل کش انداز میں نمایاں ہیں۔

شام کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کی ترجمانی زیادہ ہے۔ گاؤں کے غریب کسان، مزدور، ماہی گیر، مختلف حالات میں نفسیاتی الجھاؤ اور کرب کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ طبقاتی کشمکش میں ان کی زندگیاں کس طرح مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان کیفیات کا بیان بڑے دل سوز لہجے میں کیا ہے۔ دوسری طرف شہری زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے انہوں نے شہر میں رہنے والے امراء کی فرعونیت پر بھی بھرپور تازیانہ لگایا ہے۔ ان کی کہانی "بلّی" اور ناول "کرشنا چوڑا کے سائے میں" ان خصوصیات کے حامل ہیں۔

شام بارک پوری کا انداز بیان سادہ مگر فکر انگیز ہے۔ وہ واقعات اور ماحول کی مدد سے کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ اور پہلی سطح پر ان کے افسانے عام کہانی سے زیادہ تاثر مرتب نہیں کرتے ہیں۔ مگر بغور مطالعہ کرنے سے قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کے مفہوم کتنے وسیع ہیں۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ مقصدی اور کردار جاندار ہیں۔ پلاٹ اور کردار کی مناسبت سے کچھ مقامی الفاظ اور محاورے استعمال کیے ہیں۔ لیکن انداز بیان کی دلکشی، تذبذب کا پہلو قاری کو اس قدر محو کر دیتا ہے کہ خامیاں پس پردہ رہ جاتی ہیں۔ ان کے افسانے کسی کسی مقام پر افسانہ نگاری کی تکنیک سے دور ہیں۔ مثلاً انہوں نے اپنے ناول "کرشنا چوڑا کے سائے میں" رانگا ماٹی کی رانی کی زبان سے جو کہانی کہلوائی ہے وہ حقیقی زندگی سے دور ہے۔ "سانپ اور انسان" میں بنگلا لوک کہانی کی چھاپ ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ لیکن ان خامیوں کے باوجود بنگلادیش میں اردو کے نامساعد حالات کے تناظر میں ان کے افسانوں کا ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو بلا تامل قابل ستائش ہے۔ شام بارک پوری کے افسانے بنگلادیش کے اردو ادبی اور قومی ورثہ کہے جا سکتے ہیں۔

Dhaka University Institutional Repository

انہوں نے قومی تقاضے کو افسانوی جامہ پہنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں، میں ان کے افسانے "آٹھ کروڑ کا زخم"، جل کٹل جمنا بھیگے ہاتھ، توپ، سانپ اور انسان، آکٹوپس، آنسو، دھرتی کو آکاش پکارے، وغیرہ خاص طور پر عمدہ کہے جا سکتے ہیں۔ "آٹھ کروڑ کا زخم" میں پڑوسی ملک کے فرقہ بندی کی تعمیر سے پیدا ہونے والے نتائج کی نشاندہی کی ہے۔ "آکٹوپس" میں ہمارے دفتری نظام کی بداعمالیوں اور رشوت خوری پر گہرا طنز ہے۔ "سانپ اور انسان" میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود منافقت اور درندگی میں سانپ سے بھی ایک قدم آگے ہے۔ "توپ" ایک علامتی کہانی ہے جس میں ڈھاکے کا علاقہ گلستان میں رکھا ہوا تاریخی توپ، ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۷۱ء تک اپنی آنکھوں دیکھی سیاسی تاریخ بیان کرتا ہے مقصد کے لحاظ سے یہ کہانی عمدہ کہی جا سکتی ہے۔

افسانہ نویسی کے علاوہ شام بارک پوری نے سفرنامے بھی لکھے ——— وہ فارغ البال تھے۔ انہوں نے متعدد ملکوں کا سفر بھی کیا تھا۔ وہ جہاں بھی گئے وہاں کے عوام کی طرز زندگی، مسائل، شرافت، محبت کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ اور اس سیاحت سے انہیں جو تجربات حاصل ہوئے اسے کتابی شکل میں محفوظ کر دیا۔ "رنگ و بو کی سرزمین" تھائی لینڈ کا سفرنامہ ہے اور "آتشی چنار" کشمیر کے پس منظر میں ایک مفید ناولٹ ہے۔ اس ناولٹ کے دیباچے میں کلیم سہسرامی لکھتے ہیں:

"شام بارک پوری نے آتشی چنار میں وہاں کی زیبائی کے ساتھ ساتھ بے چارگی کی مسلسل داستان بیان کی ہے۔ اس سے کشمیریوں کے دل کی بات اور وہاں کے مسائل پر بھی فنکارانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔"[1]

شام بارک پوری کا دوسرا ناول "کرشنا چوڑا کے سائے میں" ہے۔ اس ناول کے بارے میں مصنف خود رقمطراز ہیں۔

"یہ ناول "کرشنا چوڑا کے سائے میں" عرصہ دراز پہلے "آہ" کے نام سے لکھا گیا تھا۔ مشرقی بنگال کا قدرتی حسن اور رچی بسی جاگتی زندگی اس میں جلوہ گر ہے۔۔۔۔۔ اس میں مختلف کردار ہیں جو اس سرزمین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار نہ آسمان سے اترے ہیں اور نہ فضا میں معلق ہیں۔ یہ اسی دور کی حقیقت کے ترجمان ہیں اور اسی ماحول میں سانس لیتے ہیں۔ ان سے نفرت بھی ہوتی ہے اور محبت بھی۔ میں نے انسان کو ہر مرحلے میں حقیقی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"[2]

---

[1] پروفیسر کلیم سہسرامی۔ دیباچہ "آتشی چنار"۔

[2] شام بارک پوری "حرفِ خامہ" کرشنا چوڑا کے سائے میں، ص ۴

Dhaka University Institutional Repository

"کرشنا چوڑا کے سائے میں" مصنف کا رومانی اور معاشرتی ناول ہے۔ ناول کو پُر لطف بنانے کی کوشش میں
شام کے قلم سے کسی کسی واقعے کے بیان میں داستان گوئی کی چھاپ نمایاں ہو گئی ہے۔ تاہم یہ ناول اپنے وقت اور ماحول کا ترجمان کہا جا سکتا ہے
بنگلہ دیش میں رہنے بسنے والے شہری اور علاقائی طبقے کی طرز زندگی کی عکاسی ہے ناول کے کردار جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ معاشرہ میں پرورش
پانے والی خود فریبی، ناانصافی، راہ روی پر بھرپور طنز کیا ہے۔ بنگلادیش کے ادبی ذخیرے میں یہ ایک مفید اضافہ ہے۔

نمونۂ افسانوی ادب :

تیستا اور جمنا کا جہاں سنگم ہے۔ وہاں چور ڈانگا کا گاؤں آباد تھا۔ یہ ماجھیوں کی بستی تھی۔ جن کی
زندگی ندی میں مچھلیاں پکڑنے یا ندی پار کرنے پر بسر ہو رہی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں زندگی کی
ناؤ چلا رہے تھے۔ مسجد سے اذان کی اور مندر سے ناقوس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ دونوں
دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔ ہندوؤں کے تہواروں میں مسلمان اور مسلمانوں کے جشن میں ہندو شریک
ہوتے تھے۔ ان میں حسد، نفرت اور بغض نام کو نہ تھا۔ ندی کے پانی سے سب ہی مستفیض ہوتے تھے۔
شام بارک پوری نے ۶ دسمبر ۱۹۷۲ء کو کھلنا میں انتقال کیا اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔

لہ شام بارک پوری سوبکرشنا چوڑا کے سائے میں"

Dhaka University Institutional Repository

ایوب جوہر

(۱۹۳۴ء - ۲ فروری ۲۰۰۲ء)

مکمل نام محمد ایوب صدیقی۔ قلمی نام ایوب جوہر۔ ولادت ۱۹۳۶ء موضع ہریہر گنج ضلع آرہ شاہ آباد (بھارت) میں ہوئی۔ والد محمد ابوبکر صدیقی والدہ مرحومہ ولیہن بی بی تھیں۔ روزی روٹی کے سلسلے میں والدین کا قیام کلکتے میں رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سابق مشرقی پاکستان آئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ بنگلہ دیش کے اردو ادبی حلقے میں ایوب جوہر کا تعارف صحافی، شاعر اور افسانہ نویس کی حیثیت سے ہے۔

ایوب جوہر اپنے مضمون "بنگلہ دیش میں ادبی انجمنوں کا سفر" (۱۹۴۷ء - ۱۹۸۶ء) میں اردو ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس ادارے (محاذ پبلی کیشنز، بنگلادیش) کے روح رواں ایوب جوہر ہیں۔ اس ادارے نے بنگلادیش میں معیاری ادب کے فروغ اور اس کی ترویج و اشاعت سے متعلق بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ ایوب جوہر ۱۹۷۱ء کے بعد ہی سے اردو ادب سے متعلق نہ صرف سرگرم عمل رہے ہیں بلکہ ان کا تخلیقی سفر بھی ۷۱ء سے تاحال جاری رہا ہے۔ نیز راجدھانی ڈھاکہ سے پہلا اردو جریدہ "رفتار" کے نام سے ایوب جوہر ہی نے شائع کیا۔ ان کے نجی ادارے محاذ پبلی کیشنز کے تحت بہت ساری ادبی اشاعتیں منظر عام پر آئیں جن میں سہ ماہی جریدہ "محاذ" کے کئی شمارے، شعری مجموعہ "چراغ لالہ" (پروفیسر شمس شیدائی) افسانوی مجموعہ "سادہ کاغذ" (ایوب جوہر) کے علاوہ سہ ماہی جریدہ "انکشاف" (ڈھاکا) اور ماہنامہ الاخبار بنگلادیش (ڈھاکا) کی اشاعتیں قابل ذکر ہیں۔ اس ادارے نے بنگلادیش میں اردو صحافت کو ہندوستان، پاکستان کی معیاری صحافت سے نہ صرف ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی بلکہ بنگلادیش میں پہلی بار بنگلادیشی اردو ادب کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ اس ادارے کو بنگلادیش، ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں بسنے والے معتبر و مستند قلم کاروں کا تعاون حاصل رہا ہے اور بنگلادیش

---

[1] ایوب جوہر۔ بنگلادیش میں ادبی انجمنوں کا سفر" ، مجلس ڈھاکا (خصوصی نمبر) جنوری ۱۹۸۸ء ص ۵۲

Dhaka University Institutional Repository

میں ایک اہم اشاعتی مرکز کی حیثیت سے اندرون اور بیرونِ ملک ہمیشہ پذیرائی حاصل رہی ہے۔"[1]

آخری دم تک ایوب جوہر کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ انکشاف کچھ دنوں تک بند رہنے کے بعد حال میں دو شماروں کا اضافہ ہو چکا ہے۔

ایوب جوہر صحافت نگاری کے علاوہ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ افسانہ نویس ہیں۔ انہیں بنگلادیش کے کہنہ مشق افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔ ایوب جوہر کے بیان کے مطابق اُن کا سب سے پہلا افسانہ ستمبر ۱۹۶۳ء فلمی رسالہ شمع کراچی میں شائع ہوا۔ ایک ناول "نیا سورج" فلمی جریدہ "گل رخ" کراچی میں قسط وار شائع ہوا۔ ان کے تقریباً ڈیڑھ سو افسانے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں چیدہ چیدہ تیرہ کہانیوں کا مجموعہ "سادہ کاغذ" کے نام سے یکم مئی ۱۹۸۶ء میں محاذ پبلی کیشنز ڈھاکا سے اشاعت پذیر ہوا۔

ایوب جوہر ۱۹۷۱ء کے بعد سے باضابطہ کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ایوب کی چند کہانیاں تاریخی پس منظر میں ہیں۔ جن میں تقسیم ہند ہجرت، لسانی تحریک کے نتائج اور اس سلسلے میں ۱۹۷۱ء کے انقلاب کو انہوں نے موضوع بنایا ہے۔

شفیق احمد شفیق ایوب جوہر کے افسانوں کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> "ایوب جوہر چونکہ بنگلا زبان جانتے ہیں اور اپنے ابتدائی دور میں بنگلا کہانیوں کا بے تحاشا کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ جو ماہنامہ "الشجاع" کراچی میں اکثر و بیشتر چھپتی رہی ہیں۔ ان کے یہاں علاقائی رنگ کے انجذاب و اکتساب کا عمل زیادہ مثبت، زیادہ گہرا اور زیادہ فطری ہے۔ ایوب جوہر کے افسانوں میں بنگلادیش کی عوامی و سادہ زندگی، وہاں کے خانگی مسائل اور اندرونی انفرادی کیفیات کی عکاسی ایک مخصوص تخلیقی مناظر میں پائی جاتی ہے۔"[2]

ایوب جوہر کے افسانوں میں پرانا ڈھاکا کے مخصوص علاقوں کے علاوہ محمد پور اور میر پور میں رہنے بسنے والی مقامی اور غیر مقامی متوسط اور مفلس طبقے کی گھریلو زندگی، نفسیاتی الجھن، سماجی مسائل، لسانی تنازعہ سے پیدا ہونے والے آپس میں نفرت کی نشاندہی ہے۔ ان کے افسانوں میں بھیک مانگنے والوں کی مجبوریوں کے دلسوز واقعات کی ترجمانی بھی ہے اور دولتمند طبقوں کی عبرتناک حرکتوں پر مزمت کے تازیانے بھی۔ ان کے افسانے نیم علامتی ہوتے ہیں۔ انہوں نے روایت سے رشتہ جوڑ کر جدیدیت کی طرف بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کرداروں میں کما حقہ تمثیلی کردار بھی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں ایک خامی یہ ہے کہ وہ جس دلچسپی سے کہانی کا آغاز کرتے ہیں

---

[1] راقمہ کے سوال نامے کے جواب میں ایوب جوہر نے یہ تمام معلومات فراہم کیں۔

[2] شفیق احمد شفیق، ادراک، حلقۂ آفینگ لٹریچر کراچی ۱۹۹۱ء ص ۱۲۹

Dhaka University Institutional Repository

اختتام تک اس طرز پر برقرار نہیں رہ سکتے۔

"بسم اللہ" "ہجرت" "روٹ لیس" وغیرہ ان کے نمائندہ افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ انکی کہانی "بسم اللہ" کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک متوسط طبقے کی عورت سماج کی ناانصافیوں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

"ہجرت" میں تقسیم ہندوستان کے بعد مقامی باشندوں کی مہاجرین کے ساتھ والہانہ ہمدردی پھول باڑیا ریلوے اسٹیشن (ڈھاکہ کا سابق ریلوے اسٹیشن) پر مہاجرین کا پرخلوص خیر مقدم، پھر رفتہ رفتہ لسانی تنازعہ میں مقامی و غیر مقامی میں پیدا ہونے والی نفرت اور اس کے نتیجے میں ۱۹۷۱ء میں انقلاب بنگلادیش کے نتائج میں پیدا ہونے والے اثرات کی عکاسی ہے۔ کہانی کے اختتام میں مصنف یہ مشورہ دیتے ہیں کہ سرزمین بنگلادیش کو اپنا قومی سرمایہ سمجھتے ہوئے اس کی ثقافت کو زبان کو اپنانا بہترین دانشمندی ہے۔ اس افسانے میں ایوب خود بھی مرکزی کردار ہیں۔ شروع سے آخر تک تاثر کا ارتکاز بدرجہ اتم موجود ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایوب جوہر کو کہانی لکھنے کی صلاحیت تھی۔ سماج پر ان کا قوت مشاہدہ اچھا تھا۔ مقصد و موضوع کے لحاظ سے ان کی کہانیاں اچھی کہی جا سکتی ہیں۔

افسانہ نگاری کے علاوہ انہوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے اشعار مختلف ادبی جریدوں میں شائع ہوتے رہے۔ شاعری میں ان کا طرز نگارش مقصد کے تحت ہے اور روایت و جدیدیت کا امتزاج ہے۔ ذیل میں ان کی نظم "۲۱ فروری سے چند اشعار بطور مثال ملاحظہ فرمائیے۔

یہ گیت میرا، یہ نظم میری : ہے قلب میرا ہے چشم تری
تری عنایت ہے اتنی بھاری : اٹھا نہ پاؤں گا عمر ساری
تجھے بھلانا ہے خود بھلانا
اے ماہِ دوئم ۔ اے ماہ دوئم تجھے ہمارا سلام پہنچے

نمونہ افسانوی ادب۔ "۔۔۔ اور پھر وہ واقعہ تو زندگی کے کسی موڑ پر وہ فراموش نہیں کر سکتے جب پہلی بار ملازمت کی خاطر انہوں نے ایک مقامی شخص کے خلوص پر دستک دی تھی۔ تو اس نے نہ صرف انہیں ملازم رکھ لیا تھا بلکہ لفظ مہاجر سن کر پورے سو روپے کی رقم بلا جھجک پیشگی بھی دیدی تھی۔ جسے انہوں نے الہ دین کا چراغ ہی سمجھ لیا تھا۔"[1]

ایوب جوہر نے ۲۰ فروری ۱۹۸۲ء کو انتقال کیا اور ۲۱ فروری ۱۹۸۲ء بعد نماز ظہر عظیم پور قبرستان میں دفن ہوئے۔

---

[1] ایوب جوہر۔ "سادہ کاغذ" (افسانوی مجموعہ) ص ۲۷

Dhaka University Institutional Repository

خوشتر منگرولی

(- ۱۸۹۲ء)

مکمل نام عبدالرحمن خوشتر منگرولی ۔ تخلص خوشتر ۔ والد کا نام حسن تھا ۔ ان کے آبا و اجداد عرب سے آکر منگرول (جوناگڈھ) میں آباد ہوئے ۔ خوشتر کی ولادت یکم مارچ ۱۸۹۲ء کو منگرول (جوناگڈھ) میں ہوئی ۔ بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہوگئے بمبئی کے میمن حاجی ذاکر ٹیپل کے یتیم خانہ میں رہے ۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی اس کے بعد میونسپل اسکول میں تعلیم پائی ۔ خوشتر نے نہ کسی تعلیمی ادارے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور نہ کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا ۔ ان کی فن سخن گوئی کثرت مطالعہ اور شاعرانہ ذوق کا نتیجہ ہے ۔ خوشتر کی شاعری تقریباً اسّی سال پر محیط ہے جو ان کے ذاتی تجربات اور اکتساب کا ماحصل ہے۔[1]

خوشتر گجرات کے باشندے تھے ۔ ان کے بیٹے محمد محسن اور خالد احمد کی رہائش گاہ ڈھاکے میں ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ خوشتر اکثر اپنے بچوں سے ملنے ڈھاکا آتے رہے ۔ اور یہاں کے شاعروں میں کلام سنا کر داد سخن لیتے رہے ۔ ان کا شعری مجموعہ "حسنِ خیال" پہلی مرتبہ ۱۹۷۶ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۸۵ء میں حلقۂ فکر و دانش (چاٹگام) کی نگرانی میں ڈھاکا سے شائع ہوا بعد ازاں زیر نگرانی نوشاد نوری "میرے نام" (خوشتر کے نام خطوط کا مجموعہ) شائع ہوا ۔ و تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے ۔ کلیاتِ خوشتر (کتابت شدہ) غیر مطبوعہ سے "حسنِ خیال" کا دیباچہ نوشاد نوری نے تلمبند کیا ۔

خوشتر منگرولی نے غزل، نظم، مثنوی، قطعات، قصیدہ وغیرہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ۔ انہوں نے غزل میں روایتی طرز کو بحال رکھتے ہوئے مضامین میں نئی قدروں کو اپنانے کی کوشش کی ۔ نظم گوئی میں وہ جدید شاعری سے متاثر ہیں ۔ خوشتر کی شاعرانہ فکر میں عالمی جنگ، تقسیم ہندوستان، انقلاب بنگلادیش سے رونما ہونے والے واقعات کی عکاسی ہے ۔ عصری واقعات اور عالمی مسائل پر ان کی نگاہ گہری ہے ۔ ان کی شاعری میں سماجی، اخلاقی، دینی اور سیاسی مضامین کی نشاندہی ہے ۔ عربی، فارسی کے علاوہ وہ ہندی الفاظ کے استعمال کا شعور رکھتے ہیں ۔

ان کی نظمیں "جوگی" اور "ڈھاکا ۱۹۶۲ء میں" وغیرہ کا مرکزی خیال سیاسی ہے "ڈھاکا ۶۲ء میں" حکومت پاکستان کی غلط پالیسی کے نتائج میں سابق مشرقی پاکستان کے مقامی عوام کا حکومت سے بڑھتے ہوئے کھنچاؤ کی ترجمانی ہے "مناظرۂ چشم و دل" ان کی تمثیلی نظم ہے "خوابِ عبرت" دنیا داری کے خلاف منظوم نصیحت ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ غالباً ۱۹۸۰ء میں وہ اپنے

---

[1] خوشتر منگرولی، "حسنِ خیال" (شعری مجموعہ) حلقۂ فکر و دانش بنگلادیش ۔ باردوم ۱۹۸۵ء ص ۵

Dhaka University Institutional Repository

بچوں سے ملنے ڈھاکا آئے اسی دوران ان کا انتقال ہوگیا اور ڈھاکے میں سپردِ خاک ہوئے۔

نمونۂ نظم :

بت آشا کا ہے امریکہ
اب ان داتا ہے امریکہ
بھگوان بنا ہے امریکہ

جا دیس میں اپنے اے بابا
(جوگی)

نمونۂ غزل :

پھر دل میں ہو رہی ہے خلش دردِ عشق کی
بے لطف زندگی تو کوئی زندگی نہ تھی
سودا یہ وہ گراں تھا کہ جاں دیتے ہی بنی
خوشتر یہ عاشقی تھی، ہنسی دل لگی نہ تھی

Dhaka University Institutional Repository

حسنین بھاگلپوری

(۱۹۲۳ء)

خاندانی نام سید محمد حسنین بھاگلپوری قلمی نام حسنین بھاگلپوری ۔ ولادت ۱۹۲۳ء بھاگلپور کے ایک پہاڑی گاؤں حسین آباد میں ہوئی ۔ والد کا نام ایس۔ ایم ۔ ادریس تھا ۔ کریسچن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی سے بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔ انکی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا ۔ بھاگلپور کے سہ روزہ "پیغام مسلم" (مدیر سید مجید العالم) کے لئے، انگریزی اخبار "امرت بازار پتریکا ہندوستان ٹائمس کے" اہم خبروں کا اردو میں ترجمہ کرتے تھے ۔ کچھ دنوں تک صوبہ بہار کے لئے دکن ٹائمس کی نمائندگی بھی کی ۔ ۱۹۴۷ء میں ہندو مسلم فسادات سے مجبور ہو کر صحافت کو خیرباد کہا ۔ اور سنٹرل گورنمنٹ ریلوے میں ملازمت کرنے لگے ۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں سابق مشرقی پاکستان آگئے اور یہاں ریلوے میں ان کی ملازمت دوبارہ ہوگئی ۔ قیام بنگلہ دیش کے بعد پرائیوٹ فرم سے وابستہ ہوگئے ۔

حسنین بھاگلپوری کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق رہا ۔ وقتاً فوقتاً ان کے اشعار رسالوں میں شائع ہوتے رہے ۔ ان کا شعری مجموعہ "اشکِ غم" کے نام سے ۱۹۹۲ء میں مجلس پبلی کیشنز کے ماتحت جمال مشرقی کی نگرانی نورانی پریس ڈھاکا سے چھپ کر منظر عام پر آیا ۔ اس پر "سخن ہائے گفتنی" ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر (صدر ادارۂ مجلس) نے لکھی ۔ "اشکِ غم" موصوف کی غزلیات، قطعات اور نظموں کا مجموعہ ہے ۔

حسنین بھاگلپوری مہر دلعزیز شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری برائے زندگی ہے ۔ ان میں شاعرانہ فنکاری کی صلاحیت ہے ۔ وہ روایات کو برقرار رکھ کر جدید فکری رجحان کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ حسنین کی شاعری عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کی ترجمان ہے ۔ غزل ہو یا نظم انہوں اپنے دلی جذبات، کیفیات اور مشاہدات کو شعری جامہ پہنایا ہے ۔ ان کی غزلوں میں دہلی کی داخلیت، متانت اور پاکیزگی ہے ۔ نظموں میں منظر نگاری اور واقعات کی ترجمانی کے علاوہ سیاسی کشمکش کی واردات بھی بیان کی ہیں ۔ طرز نگارش میں سادگی اور سچائی ہے ۔ بحیثیت مجموعی ان کا رنگ انفرادی ہے ۔ "میرا گاؤں" "انقلاب" "کاروان آرزو" "جنگ کے دوران" اس نوع کی نظمیں لکھیں ۔

بطور نمونہ حسنین کے متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

خدائے برتر ترے جہاں کا عجیب رنگِ بہار دیکھا
جو کل غنی تھے ہیں آج مفلس طلسمِ لیل و نہار دیکھا

---

۱ اشکِ غم، دیباچہ

Dhaka University Institutional Repository

وہ کاغذی چہرے والے ہیں تزئین نمائش کے پیکر
جو لوگ مذاق اڑاتے ہیں محفل میں کسی انساں کا

انسان کی بستی میں اکثر ملتے ہیں درندہ خصلت بھی
حسنین سنو میری باتیں اب رستے لے بیاباں کا

ایک قیدی زیست کے زنداں میں ہے
ایک قیدی کی رہائی ہو گئی

ہر برائی ان کی اچھائی ہوئی
میری اچھائی برائی ہوئی

ابن آدم ہوں بھول ممکن ہے
ورنہ عادت نہیں برائی کی

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر یوسف حسن

(۱۹۲۶ء -)

سید یوسف حسن ۴ نومبر ۱۹۲۶ء کو پٹنہ سٹی، بہار (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید اشرف حسین تھا۔ یوسف حسن نے پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک اور آئی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد بی۔ اے اور ایم۔ اے کی سند مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے لی۔ تقسیم ہندوستان کے بعد مستقل طور پر ڈھاکا آ گئے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی رہنمائی میں "بنگال میں اردو" آغاز سے ۱۹۴۷ء تک کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈھاکا یونیورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ڈاکٹر یوسف حسن ایک مقبول محقق اور صحافی ہونے کے ساتھ سیاست سے بھی منسلک ہیں ان کی ادبی و سیاسی سرگرمیاں حسب ذیل ہیں۔[1]

سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۴۷ء - ۱۹۴۸ء
سکریٹری انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۴۸ء - ۱۹۴۹ء
سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین سابق مشرقی پاکستان	۱۹۵۵ء
ممبر سنٹرل لنگویج کمیٹی آف انگلش	۱۹۵۲ء
ایڈیٹر اردو ماہنامہ رفتار اور ماہنامہ "مشعل" ڈھاکا	
سکریٹری عالمی امن کونسل سابق مشرقی پاکستان	۱۹۵۱ء
ممبر پاکستانی وفد بیجنگ۔ امن کونسل	۱۹۵۲ء
ممبر سنٹرل کمیٹی پاکستان کمیونسٹ پارٹی	۱۹۹۳ء - ۱۹۵۷ء
ممبر ورکنگ کمیٹی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی	۱۹۵۷ - ۱۹۷۱ء
نائب صدر آدمجی جوٹ ملز مزدور یونین۔ نرائن گنج	۱۹۵۲ء - ۱۹۵۴ء

سیاسی قیدی کی حیثیت سے ۱۹۵۴ء اور ۵۹ء میں ڈھاکا سنٹرل جیل میں نظر بند رہے۔

۱۹۷۰ سے ۱۹۷۱ء تک رحمۃ اللہ اکیڈمی نرائن گنج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۷۹ء لائنز انٹرنیشنل اسکول میں پرنسپل رہے۔ ان دنوں اپنی درسگاہ پری پرائمری اسکول (کھلنا) میں ۱۹۷۹ء سے صدر کے

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں ڈاکٹر یوسف حسن نے مذکورہ معلومات فراہم کیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۲ء

Dhaka University Institutional Repository

فرائض انجام دے رہے ہیں یوسف حسن کا تعلق تحقیق تفتیش سے ہے۔ ان کا مفید ادبی کارنامہ تحقیقی مقالہ "بنگال میں اردو۔ (۱۹۴۷ء تک) ہے۔ یہ ضخیم مقالہ سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں مصنف نے بارہ صدی کے قبل کی تاریخ سے ۱۹۴۷ء تک سیاسی، ثقافتی و ادبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو زبان و ادب کا آغاز و تدریجی ارتقا کا مدلل جائزہ پیش کیا ہے اس مقالہ کو کئی ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا دور - زمانہ قبل از تاریخ - ۱۲۰۰ء تک۔

دوسرا دور - ۱۲۰۰ء تک ۱۵۷۶ء تک (ترکوں اور پٹھانوں کا عہد)

تیسرا دور - ۱۵۷۶ء سے ۱۷۷۳ء تک (مغلوں اور نیم خود مختاروں کا عہد)

چوتھا دور ۱۷۷۳ء سے ۱۸۵۷ء تک (انگریزوں کا عہد)

پانچواں دور ۱۸۵۸ء سے ۱۹۴۷ء تک (انگریزوں کا عہد)

مقالہ ضخیم ہے اس لئے مصنف نے اس کو تین جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ پہلی جلد جو پہلے، دوسرے اور تیسرے ادوار پر مشتمل ہے[1]۔

مقالے کی تصنیف میں ڈاکٹر یوسف حسن نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ بنگال کی تقریباً سات سو سالہ تاریخ خصوصاً ادب و ثقافت کے گوشے کو جن پر دبیز چادر پڑی ہوئی تھی۔ یوسف حسن نے اس چادر کو اتار کر بنگال کے ان فنکاروں کی خدمات کا اعتراف کیا ہے جن کے وہ مستحق ہیں۔ مگر تاریخی واقعات بیان کرتے ہوئے یوسف حسن نے اس قدر طول کھینچا ہے کہ بعض عبارت تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ شعراء کا تعارف اور نمونۂ کلام پیش کرتے ہوئے انہوں نے قدیم تذکروں مثلاً تذکرہ گلزار ابراہیم، تذکرہ میر حسن، تذکرہ نکات الشعراء، تذکرہ گلشن ہند وغیرہ سے حوالے پیش کئے ہیں۔ ان پر اپنی ناقدانہ رائے بہت کم پیش کی ہے۔ لہٰذا میرا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ڈاکٹر یوسف حسن کی یہ کتاب "بنگال میں اردو" تحقیقی ہے، تنقیدی نہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسن بلاشبہ باشعور محقق ہیں۔

یوسف حسن کے لکھے ہوئے کتابوں کے دیباچے، تبصرے اور تحقیقی مضامین مثلاً "ڈاکٹر عندلیب شادانی (مجلس ڈھاکا) "دو بھاشی" (انتخاب سلہٹ) "سلہٹ کے چند اردو شعراء (سہ ماہی ادب ڈھاکا) وغیرہ اردو ادب کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ ہیں۔

---

[1] بنگال میں اردو، مقدمہ

Dhaka University Institutional Repository

نمونۂ نثر :

"۔۔۔ سلطان الیاس شاہ کے بعد سلطان غیاث اعظم ، شاہ کا نام بنگلہ زبان کی سرپرستی کے لئے آتا ہے ۔ اس کے زمانے میں بنگلا زبان اور ماتھیلی زبان کو بڑا فروغ حاصل ہوا ۔ اس نے اپنے دربار میں ایک طرف حافظ شیرازی کو دعوت دی تو دوسری طرف ماتھیلی زبان کے شاعر ودیاپتی کو بھی مدعو کر کے بڑی عزت بخشی ۔ فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے برقرار رہی ۔ اس طرح بنگال میں عربی، فارسی، ترکی، ماتھیلی، برجی اور بنگلا کے ساتھ مل کر ایک مخلوط بولی کا پیکر تیار ہو رہا تھا ۔"

(بنگال میں اردو)

Dhaka University Institutional Repository

عطاءُ الرحمٰن جمیلؔ

(۲۲ جون ۱۹۲۹ء)

مکمل نام عطاء الرحمٰن محمد جمیل اور تخلص جمیلؔ۔ ان کی ولادت ۲۲ جون ۱۹۲۹ء کو بہار شریف نالندہ (پٹنہ) میں ہوئی۔ والد کا نام جلال الدین احمد تھا۔[1] انہوں نے گرونانک ہائی اسکول سے ۱۹۴۳ء میں میٹرک اور پٹنہ سائنس کالج سے ۱۹۴۵ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کئے۔ تقسیم ہندوستان کے ناموافق حالات سے مجبور ہوکر ۱۹۴۸ء میں ڈھاکا آئے۔ انجینرنگ کالج ڈھاکا سے ۱۹۵۲ء میں انجینری کے امتحان میں کامیاب ہونے کے ساتھ ان کا تقرر سی۔ آئی۔ بی میں اسسٹنٹ انجنیر کے عہدے پر ہوا۔ ۱۹۸۵ء میں چیف انجنیر کے عہدے تک پہنچے۔ اور ۱۹۸۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔[2]

عطاء الرحمٰن جمیل کو شعر و شاعری کا چسکا بچپن ہی سے لگ چکا تھا۔ لیکن باضابطہ شاعری کا آغاز ۱۹۴۶ء میں ان کی نظم "شیش محل" کی اشاعت سے ہوا۔ "شیش محل" ادبی حلقے میں پسند کی گئی۔

عطاء الرحمٰن جمیل کی شاعری دراصل سابق مشرقی پاکستان کی پیداوار ہے۔ ان کی شاعری عہد پاکستان (۱۹۴۷ء - ۱۹۷۱ء) سے لیکر موجودہ دور بنگلادیش تک پھیلی ہوئی ہے۔ سابق مشرقی پاکستان کے دور میں اُبھرتے ہوئے ترقی پسند نوجوان شعراء میں شامل تھے اور وہ بنگلادیش کہنہ مشق بزرگ شعراء میں شامل کئے جاتے ہیں۔ جمیل فطری شاعر ہیں۔ انہوں نے نظم و غزل دونوں اصناف پر کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ جمیلؔ نے وقتاً فوقتاً تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ لیکن ان کا اصل میدان شاعری ہے۔ عطاء الرحمٰن جمیلؔ نے ایک حساس شاعر کی طرح حسنِ بنگالہ اور کربِ بنگال کی غمازی کے علاوہ بنگلادیش کے دلفریب قدرتی مناظر کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ جمیلؔ کا نفسیاتی شعور اچھا ہے۔ ان کی شاعری ان کے تجربات و مشاہدات کی آئینہ دار ہے۔ وہ انسانی زندگی پر ناقدانہ نگاہ رکھتے ہیں۔ شعر گوئی کے معاملہ میں آغاز ہی سے ان کا طبعی رجحان ترقی پسند ہے۔ وہ فرسودہ روش کو اپنانے کے قائل نہیں۔ جمیلؔ روایت سے رشتہ جوڑ کر صحت مند مفید شاعری تخلیق کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کا رنگ جارحانہ نہیں منصفانہ ہے۔ ان کی شاعری ایک حد تک مبالغہ سے پاک ہے وہ صداقت اور حقیقت سے قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جمیلؔ اپنی بات اپنے لہجے میں کہتے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود گویا ہیں:

یہ غزل ہے جمیلؔ صاحب کی ÷ میں نے لہجے سے صاف پہچانا![3]

---

[1] ایوب جوہر "عطاء الرحمٰن جمیل سے چند گذارشات" سہ ماہی انکشاف ڈھاکا۔ جون۔ جولائی۔ اگست ۱۹۹۹ء ص ۱۶

[2] یہ تمام معلومات عطاء الرحمٰن جمیل نے خود اپنی زبان سے بیان کئے۔

[3] سہ ماہی انتخاب سیدپور۔ فروری ۱۹۸۴ء ص ۵۱

Dhaka University Institutional Repository

جمیل کی شاعری میں مشکل پسندی نہیں لیکن تخیل اور موضوع باریک ہے جس کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں۔

مشکل پسند اتنے نہ تھے ہم مگر جمیلؔ ∴ کہنے جو بیٹھے شعر تو مضمون ادق ہوا

کاکس بازار سے چاٹگام تک"، "ڈھاکے کی ایک شام" "مسافر" وغیرہ معیاری نظمیں ہیں جمیل کی نظموں میں غزل کا ترنم ہے ذیل میں ان کی نظم "ڈھاکے کی ایک شام"[1] سے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

لمس کس کا یہ سرِ شام ہوا ہے محسوس
کتنے آغاز کا انجام ہوا ہے محسوس
کوئی سایہ کہیں چپکے سے گزر جاتا ہے
اک اُجالا سا ہے تا حدِّ نظر جاتا ہے
میں نے خار و خس و خاشاک میں جینا سیکھا
میں دامِ تہہِ افلاک میں جینا سیکھا
بوڑھی گنگا کے کناروں پہ ہے کشتی کی قطار
ڈولتے ڈولتے آجائے گی بجروں میں بہار

نمونہ غزل :

مانا کہ ستارے سرِ افلاک بہت ہیں
ہم کو بھی ہمارے خس خاشاک بہت ہیں
اتنا نہ ہنسو صاحبِ ادراک بہت ہیں
آہستہ چلو لوگ تہہِ خاک بہت ہیں
اب تاکتا پھرتا ہے شکاری کو شکاری
نخچیر ہیں کم دہر میں، فتراک بہت ہیں
ان کو بھی جمیلؔ اپنے مقدر سے گلہ ہے
وہ لوگ جو سنتے تھے کہ چالاک بہت ہیں

---

[1] ادبی رسالہ مجلس ڈھاکا۔ جنوری ۱۹۸۸ء ص ۹۹

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر کلیم سہسرامی

(۱۲ر جنوری ۱۹۳۰ء)

خاندانی نام محمد کلیم --- معروف کلیم سہسرامی ۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۳۰ء کو سہسرام ضلع رہتاس صوبۂ بہار (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد کریم تھا۔ عربی و فارسی کی بنیادی تعلیم مدرسہ کبریا سہسرام ہوئی۔ میٹرک سہسرام اسکول سے پاس کرنے کے بعد نیشنل کالج پٹنہ (بہار) میں آئی۔ اے کی طالب علمی کے دوران ہندو مسلم خلفشار سے تنگ آکر سابق مشرقی پاکستان چلے آئے۔ اور ڈھاکے میں بود و باش اختیار کی۔ چار ماہ ڈھاکا ڈگری کالج سے منسلک رہکر آئی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں شعبۂ اردو فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے اردو میں بی۔ اے آنرز اردو (۱۹۵۷ء) اور ایم اے اردو (۱۹۵۹ء) کے امتحانات میں اول درجے سے کامیاب ہوئے۔ اسی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی ملازمت کا آغاز فارسی اردو لکچرر کی حیثیت سے ڈگری کالج راجشاہی سے ہوا دو سال بعد گورنمنٹ ڈگری کالج ڈھاکہ میں بھی معلم رہے۔ ۱۹۶۲ء میں بحیثیت لکچرر راجشاہی یونیورسٹی کے شعبہ السنہ میں ان کا تقرر ہوگیا۔ اس شعبے میں وہ ترقی کرکے پروفیسر کے عہدے تک پہنچے اور ۱۹۹۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

۱۹۶۵ء میں وہ فارسی زبان میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے تہران روانہ ہوگئے۔ تہران یونیورسٹی میں ان کا چار سال تک قیام رہا۔ ڈاکٹر حسن منوچہر کی رہنمائی میں ۱۹۷۰ء میں ڈی لٹ کی ڈگری تہران یونیورسٹی سے حاصل کی۔ تحقیقی مقالے کا عنوان تھا۔ بنگال میں اسلامی تصوف اور اس کے ادبی و ثقافتی اثرات" مزید برآں انہوں نے فارسی قدیم اوستا، پہلوی اور زبان فارسی میں تعلیم حاصل کی۔[1] تہران سے واپس آکر وہ شعبہ السنہ راجشاہی یونیورسٹی میں درس و تدریس میں منہمک رہے۔ ان کی علمی و ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے حکومت پاکستان نے ۱۹۵۹ء میں انعام خصوصی اور ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر لاہور میں منعقد سیمینار میں تحقیقی مقالہ پیش کرنے پر علامہ اقبال طلائی تمغہ" سے نوازا۔[2]

بنگلا دیش کے اردو و فارسی ارباب قلم میں کلیم سہسرامی کا تعارف معلم، شاعر، نقاد اور ممتاز محقق کی حیثیت سے ہے۔

---

[1] کلیم سہسرامی ۔ "روایت و درایت" نقاد پبلشرز پٹنہ دسمبر ۱۹۹۱ء، سرورق متعارف

[2] کلیم سہسرامی ۔ خدمت گزاران فارسی در بنگلادیش رائیزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران ۔ ڈھاکہ ۱۹۹۹ء ص ۲۲۸

Dhaka University Institutional Repository

کلیم سہسرامی کی کتاب روایت و درایت کے مرتب اشفاق عادل کی رائے کہ "عجیب اتفاق ہے کہ استاد محترم ڈاکٹر عندلیب شادانی کے بعد وہ بنگلہ دیش میں اردو و فارسی کے تنہا پروفیسر مقرر کئے گئے ایک جزوی صحیح نہیں۔ بنگلہ دیش میں کلیم سہسرامی کے علاوہ ڈاکٹر عبد اللہ، ڈاکٹر کلثوم ابو البشر، ڈاکٹر ام سلمیٰ، شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر بحال ہیں۔

کلیم سہسرامی کی ادبی تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہیں :

بیمار بلبل یا (تدوین با مقدمہ) مغربی بنگال اردو اکاڈمی کلکتہ

بیمار بلبل (مطبوعہ ۱۸۶۷ء) واجد کا لکھا ہوا ناٹک ہے کلیم سہسرامی نے "بیمار بلبل" کی ہیت سے سے متعلق تحقیقی مقدمہ لکھ کر اسے مرتب کیا۔ یہ مصنف کی تحقیق و تالیف کا مفید نمونہ ہے۔

بنگال میں غالب شناسی۔ پبلیشر، کلچرل اکاڈمی۔ اقبال روڈ۔ ڈھاکا

بنگال میں غالب شناسی، غالب سے متعلق پانچ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین کے عنوانات ہی سے اس کی نوعیت نمایاں ہے۔ مثلاً "بنگال میں غالب شناسی" غالب کے ایک ایک حریف" غالب کے ایک بنگالی شاگرد (خواجہ عبد الغفار اختر)" "کلام غالب کے بنگلا تراجم" غالب کے تکروفن کا تجزیہ، ہر مقالے کا رنگ انفرادی ہے جس میں غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹ء) کا آقا احمد علی سے علمی معرکہ آرائی۔ بنگال میں غالب کے تلامذہ، مقلد، مترجم مختلف شعرو ادب کے تذکروں کے علاوہ غالب کا بنیادی ادبی رویہ و ادبی رجحان کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے مصنف نے مختلف تذکرہ نگاروں کے معائب کی بھی نشاندہی کی ہے۔ کلیم سہسرامی کی یہ تصنیف اردو ادب کے تحقیقی ذخیرے میں قابل قدر اضافہ ہے۔

روایت و درایت (تنقید و تحقیق) ناقد پبلشر عالم گنج گھیا پٹنہ ۱۹۹۱ء

۲۰۴ صفحات پر مشتمل روایت و درایت کلیم سہسرامی کی تحقیق و تنقید کا گرانقدر تصنیف ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے تیرہ مقالوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں سات مقالے تنقیدی اور فکر انگیز ہیں۔ دوسرے حصے میں چھ مقالات تحقیقی ہیں۔ مجموعی طور پر دونوں حصوں کا تعلق تحقیق و تنقید سے ہے مقالوں کے عنوانات اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہوں۔

Dhaka University Institutional Repository

پہلے حصے میں "پرکھ ۔ایک جائزہ" "مانوس کی شاعری کے المیہ عناصر" "جگر کا ساقی نامہ" "مثنوی طور معرفت" "مانوس عظیم آباد میں" "دامنِ گلستاں ۔۔۔ میری نظر میں" "چراغِ لالہ پر ایک نظر۔

دوسرے حصے میں "نواب نصیر حسین خیال کی ایک نادر تحریر" "ادیب الملک نواب نصیر حسین خیال کی آپ بیتی" "سہسرام کا اردو اسٹیج" "رسالہ جہاد یہ" صفیر بلگرامی کی ایک بیاض، صفیر کی ایک نایاب نظم" وغیرہ تحقیقی مضامین ہیں۔ اس حصے میں نصیر حسین خیال کی ایک نادر تحریر کا جائزہ پیش کر کے مصنف نے تحقیق کا قابل ذکر فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ تحریر ڈھاکا یونیورسٹی کے مخطوطات میں محفوظ ہے۔ جس پر پہلی بار مصنف نے روشنی ڈالی ہے۔

روایت و درایت میں مصنف نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے لے کر پانچویں دہائی تک بہار کی چند ادبی شخصیتوں اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں موصوف نے ان تخلیقات اور مخطوطات پر روشنی ڈالی ہے۔ جو کتب خانوں کے گمنام گوشوں میں پڑے تھے۔

مآثر بنگال نیو ارچنا پرنٹنگ پریس پٹنہ۔ اشاعت اول ۱۹۹۳ء

۹۶ صفحات پر مشتمل مآثر بنگال صرف پانچ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس کا تعلق صرف بنگال سے ہے۔ بنگال نے فارسی و اردو کی کیا خدمات انجام دیں ہیں اور کیا تصنیفات پیش کئے۔ ان پر ناقدانہ روشنی ڈالی ہے۔ مضامین یہ ہیں۔

"بنگال کی پہلی فارسی تالیف" "حافظ شیرازی اور بنگال، بنگال کی ایک قدیم فارسی فرہنگ" "وحشت ۔۔۔ حالات و کلام" "آزادی سے پہلے بنگال میں اردو نثر" مآثر بنگال بنگلادیش کے قومی ورثہ میں شامل رہنے کا مستحق ہے۔

خدمت گزاران فارسی در بنگلادیش رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، ڈھاکا ۱۹۹۹ء

یہ کتاب فارسی زبان میں بنگلادیش میں فارسی ادباء و شعرا کی خدمات کا قابل قدر نمونہ ہے۔ جس میں مصنف نے عہد ترک (تیرہویں صدی عیسوی) سے عہد بنگلادیش (بیسویں صدی عیسوی) تک فارسی زبان و ادب سے منسلک فنکاروں کا تعارف اور خدمات پر تحقیقی ضیا پاشی کی ہے۔ چونکہ بنگال کے فارسی فنکاروں کا اردو سے گہرا رابطہ رہا ہے اس لئے یہ تصنیف اردو محقق کے لئے کارآمد ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

مذکورہ تصانیف کے علاوہ کلیم سہسرامی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین بنگلا، پاک و ہند کے اردو و فارسی کے موقر جرائد دلربا، ڈھاکا ساقی، کراچی، ماہ نو، کراچی، خاور، ڈھاکا، ندیم، ڈھاکا، روح ادب کلکتہ نوائے ادب پٹنہ انتخاب، سیدپور، ادب، ڈھاکا وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مجموعی طور پر کلیم سہسرامی بنگلادیش کے ممتاز محقق اور مقبول نقاد کہلانے کے مستحق ہیں۔ تحقیق و جستجو ان کا پیشہ نہیں ذوق طبع ہے فنکار کے معائب ہوں یا محاسن مدلل بیان کرتے ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے فنکار کو بھی خاطر میں نہیں لاتے حق گوئی و سچائی ان کی تنقید کی شان ہے لیکن تنقید کرتے ہوئے ان کے جملے کرخت اور طنز آمیز ہو جاتے ہیں۔ شاید یہ ان کی نکتہ چیں جبلت کا تقاضا ہے جو ان کے ناقدانہ تحریر میں کارفرما ہے۔ تاہم ان کی تنقید عملی تنقید کی مترادف ہے۔ اس نوعیت میں وہ حالی اور عبدالحق کے مقلدوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

تحقیق و تنقید کے علاوہ کلیم سہسرامی کو شعر و شاعری سے بھی شغف حاصل ہے شاعری میں وہ روایتی غزل گوئی کے پابند رہتے ہوئے۔ جدید رجحانات کے مفید پہلوؤں کو بھی اپنانے کے قائل ہیں۔ ان کی شاعرانہ طرز نگارش صاف ستھرا اور رواں ہے

نمونہ شاعری:

ضبط کی انتہا معاذاللہ ہم مصیبت میں مسکراتے ہیں
ہم محبت میں اے کلیم حزیں جیتی بازی بھی ہار جاتے ہیں

نمونۂ نثر:

"..... وحشت صاحب نے غالب کے اتباع کی آرزو ہی نہیں کی بلکہ غالب دوراں بننے کے لئے اپنی شاعری میں ان کے انداز بیان اور طرز ادا کا سہارا بھی لیا۔ لیکن غالب کی طرح ان کے یہاں نہ تو مضامین کی جدت و ندرت ہے اور نہ فکر و خیال میں وسعت۔ وہ غالب نہ بن سکے اور نہ یہ ان کے لئے کمال شاعری ہوتا۔ البتہ جس عہد میں ان کی شاعری عروج پر تھی۔ وہ "غالب دوراں" ضرور تھے۔"

Dhaka University Institutional Repository

احمد الیاس

(۱۹۳۱ء)

خاندانی نام محمد الیاس۔ قلمی نام احمد الیاس۔ ولادت ۱۷ اگست ۱۹۳۱ء کو کلکتے میں ہوئی۔ والد کا نام عبدالرحیم تھا۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں سابق مشرقی پاکستان آئے اور ڈھاکے کو وطن ثانی بنایا۔ ان دنوں غیر سرکاری ادارہ "الفلاح" بنگلادیش کے ڈائرکٹر ہیں۔[1]

احمد الیاس سابق مشرقی پاکستان میں ۱۹۶۰ء کے درمیان نمایاں ہونے والے ترقی پسند نوجوان شعراء کے صف اوّل میں شامل ہیں۔ اور قیام بنگلادیش کے بعد اردو شعر و ادب کے فروغ میں تخلیقی نگارشات کے ذریعہ ترقی پسند خیالات و رجحانات کی ترویج و ارتقا میں جن مشاہیر ادب نے حصہ لیا ان میں احمد الیاس ایک اہم فنکار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں

۱۹۶۰ء میں روزنامہ "پاسبان" سے ان کی صحافتی خدمات کا آغاز ہوا۔ وہ ہفتہ وار اردو "جریدہ" ڈھاکا "ساحل" ڈھاکا روزنامہ "وطن" ڈھاکا اور روزنامہ "آزاد" لاہور سے بطور صحافی وابستہ رہے۔

احمد الیاس کا طبعی رجحان بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل رہا۔ شعر گوئی میں وہ فیض احمد فیض سے متاثر ہیں۔ ان کو فیض سے جنون کی حد تک عشق ہے۔ الیاس اپنے شعری مجموعہ "آئینہ ریزے" میں اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"۱۹۶۰ء میں فیض صاحب نے مجھے اپنے ساتھ "لیل و نہار" کی مجلس ادارت میں شامل کر لیا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز یہی ہے۔"

احمد الیاس کی ادارت میں رسالہ "انجمن" ۱۹۷۸ء میں "انجمن ادب بنگلادیش" کی نگرانی میں شائع ہوا۔ ڈھاکا سے شائع ہونیوالا رسالہ "شاہکار" کی مجلس ادارت میں احمد الیاس شامل ہیں۔ ان دنوں وہ کراچی کے اردو ماہنامہ "شوٹائم" سے منسلک ہیں اور ریڈیو بنگلادیش کی بیرونی سروس میں شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔

احمد الیاس کا شعری مجموعہ "آئینہ ریزے" ۱۹۸۹ء میں شاہکار پبلی کیشنز ڈھاکا کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ سینتیس ۳۷ غزلوں اور انتیس ۲۹ نظموں پر مشتمل ہے۔ مجموعہ کے ابتدائی صفحوں میں عطاء الرحمٰن جمیل نے "فن کے آئینے میں" کے

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں احمد الیاس کا زبانی بیان مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۹۳ء

Dhaka University Institutional Repository

عنوان سے احمد الیاس کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔ اور سرور ق پر ان کی شاعری پر ڈاکٹر یوسف حسن نے مختصر مگر جامع تبصرہ پیش کیا ہے۔
احمد الیاس کی ۱۹۷۱ سے قبل کی شاعری انقلاب بنگلہ دیش کے خلفشار کے دوران ضائع ہوگئی۔ اس مجموعے کی تمام نظمیں اور غزلیں قیام بنگلہ دیش کے بعد کی ہیں۔ "دیدۂ تر" ۱۹۷۱ کی آخری رات" "دھوپ اور چاندنی" "خوابوں کا کرب" ان کی معیاری نظمیں ہیں بحیثیت مجموعی اس شعری مجموعہ کو بنگلا دیش کی ترقی پسند اور صحت مند شاعری کا انتخاب کہا جاسکتا ہے

احمد الیاس کی شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی جس کا عنوان "سرخ سویرا" تھا۔ اس وقت یہ نظم ادبی حلقوں میں سراہی گئی۔

احمد الیاس کی شاعری تجربات و مشاہدات کی شاعری ہے۔ وہ فطری شاعر ہیں ان کی شاعری کا حوالہ بنگلا دیش ہے۔ انہوں نے یہاں کے جمہوری تقاضوں کو سمجھا، محسوس کیا اور ایک اچھے شاعر کی طرح اسے شعری و نثری نگارشات میں پیش کرتے آرہے ہیں۔ انہوں نے نظم و غزل دونوں اصناف پر مہارت کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے اور خوب کی ہے۔ احمد الیاس طرز نگارش میں روایتی اسلوب کی پاسداری کرتے ہوئے جدید صحت مند فکری رجحان کو اپنانے کی کامیاب سعی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری پر سو فیصد فیض کا تاثر نمایاں رہتا ہے۔ لیکن انہوں نے فیض کی نقالی نہیں کی۔ ان سے اکتساب کیا ہے۔ وہ فیض کے مقلدوں میں ایک منفرد شاعر ہیں۔ غزل گوئی میں عام روایتی شاعر کی طرح ان کے یہاں درد عشق میں سوز نہیں مٹھاس ہے۔ وہ غم سے سمجھوتہ کرنے کی نصیحت کرتے ہیں اور فراق یار میں بھی خوش رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ردیف اور قافیے کا التزام ہر جگہ برقرار نہیں ہے۔ یہ بھی ان کا ایک جداگانہ رنگ کہا جاسکتا ہے۔ ان کی نظم "سنو!" میں بنگلا دیش کے قومی شاعر نذرالاسلام کی نظم "دھوم کیتو" کا تخاطبی انداز نمایاں ہے۔

سنو! میں سب سے کہتا ہوں
میری آواز، خوشبو، روشنی، رقص و رباب و جنگ
میری آواز! چہرہ، آئینہ، نقش و نگارِ جاں
میری آواز! شعلے کی لپک بھی اور شرر بھی ہے
میری آواز! برگِ گل پہ شبنم کا سفر بھی ہے

Dhaka University Institutional Repository

غزل کے متفرق اشعار :

اس پہ شک بھی بہت اس پہ اعتبار بھی ہے
حریفِ جاں بھی ہے وہ اور غمگسار بھی ہے
تمام ترکِ تعلق کے باوجود الیاس
ہر ایک رشتۂ غم اس سے اُستوار بھی ہے

سائے کی طرح ساتھ رہے شام تک جو لوگ
کس سمت ساتھ دھوپ کے وہ ہم سفر گئے

جب دلِ فراق یار میں بھی شادماں رہا
الیاس ہم پہ ایسے بھی لمحے گزر گئے

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر محمد عبداللہ

(۱۹۳۲ء - ۲۰۰۸ء)

محمد عبداللہ کی پیدائش یکم اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع لکھی پور موضع بنگا گاؤں میں ایک مسلم شریف گھرانے میں ہوئی۔ والد مرحوم مخلص الرحمن اپنے علاقے کے مشہور عالم تھے۔

عبداللہ نے ۱۹۴۵ء میں کرامتیہ مدرسہ نواکھالی سے فاضل، ۱۹۴۷ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ممتاز المحدثین، ۱۹۴۹ء میں آئی۔ آئی کالج چاٹگام (حاجی محمد محسن کالج) سے آئی۔ اے کے امتحانات امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں بی۔ اے آنرز (اردو) کے امتحان میں اول درجے میں اول آئے۔ ۱۹۵۳ء میں ایم۔ اے اردو کے امتحان میں دوم درجے میں اول ہوئے۔ بی۔ اے آنرز کے امتحان میں آرٹس فیکلٹی کے کل طلباء میں اول پوزیشن حاصل کر کے گولڈ مڈل کے مستحق بنے۔ انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے ۱۹۸۱ء میں ایم۔ فل اور ۱۹۸۳ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں ان کے تحقیقاتی مقالوں کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں۔ "سرسید احمد خاں کے مذہبی اور سماجی افکار" (ایم۔ فل) بنگلہ دیش میں فارسی ادب۔ انیسویں صدی میں" (پی۔ ایچ۔ ڈی)

ڈاکٹر عبداللہ نے بنگلہ دیش کے مختلف سرکاری کالجوں میں تقریباً اٹھارہ برس (۱۹۵۵ء تا ۱۹۷۲ء) بحیثیت معلم اردو خدمات انجام دیں۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء میں ان کا تقرر اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ہوا۔ مذکورہ شعبے میں وہ اس منصب سے ترقی پاکر پروفیسر کے عہدے تک پہنچے اور ۳۰ جون ۱۹۹۷ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ یکم جولائی ۱۹۹۷ء سے وہ اسی شعبے میں سپر نیومیریری معلم (SUPER NUMERARY) کی حیثیت سے تعلیم و تدریس کی ذمہ داری سنبھال رہے ہیں۔[1]

بنگلہ دیش کی اردو اور بنگلا حلقۂ ادب میں ڈاکٹر عبداللہ کی مقبولیت ایک کامیاب مدرس، محقق، نقاد اور مضمون نگار کی حیثیت سے ہے۔ ڈھاکا یونیورسٹی کی طالب علمی کے زمانے میں انہیں ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر حنیف فوق جیسے اساتذہ سے درس

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں ڈاکٹر عبداللہ کا زبانی بیان۔ ۲۵ جون ۲۰۰۲ء

Dhaka University Institutional Repository

لینے کا شرف ملا۔ بنگلہ، اردو اور انگریزی زبانوں میں ابتک انکی تقریباً انتیس[۲۹] تحقیقی اور عوامی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اس کے علاوہ انہوں نے کثیر التعداد تحقیقی مضامین سپرد قلم کئے جو ماہنامہ "فاران" کراچی "ماہنامہ "سیارہ" لاہور ماہنامہ "ساقی" کراچی روزنامہ "پاسبان" ڈھاکا میں شائع ہوتے رہے۔ ادبی خدمات میں ڈاکٹر عبداللہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے فن اردو اور فن کاران اردو کو بنگلا حلقوں میں اور بنگالی کے مشاہیر ادب کو اردو داں طبقوں میں متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی۔

ان کی تصنیفاتِ اردو میں "قاضی نذرالاسلام قابل ذکر ہے جو ۱۹۷۱ء میں ڈھاکا سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پیش لفظ لکھتے ہوئے قاضی دین محمد سے کچھ تسامح ہو گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

"یہ اردو بولنے والوں سے روشناس کرانے کی پہلی جامع کوشش ہے"۔

توضیح کے لئے میں قاضی صاحب کی رائے کے ساتھ کچھ اضافہ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہ سب سے پہلے اختر حسین رائے پوری کلہی نے قاضی نذرالاسلام کو اردو داں حلقوں سے روشناس کرایا۔ ان کی کتاب "پیامِ شباب" ۱۹۴۷ء سے قبل ہی شائع ہوئی تھی۔ یونس احمر کی کتاب "قاضی نذرالاسلام ۔ زندگی اور فن" ۱۹۶۷ء میں نذرل اکیڈمی کراچی سے شائع ہوئی۔ یونس احمر نے نذرل کی شاعری پر پس منظر کے ساتھ ان کے شاعرانہ پہلوؤں پر بھی ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔ نیز یونس احمر نے اپنی کتاب کو اختر حسین رائے پوری کے نام یوں انتساب کیا۔

"انتساب

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے نام

جنہوں نے سب سے پہلے قاضی نذرالاسلام کو اردو داں طبقہ سے

متعارف کرایا"

ڈاکٹر عبداللہ کی کتاب "قاضی نذرالاسلام" اپنی نوع کی پہلی کتاب ہے۔ انہوں نے قاضی نذرالاسلام کے تصورات اور جذبات پر ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔ اس کتاب میں ان کے جو تنقیدی مضامین ہیں ان میں "نذرالاسلام

---

[۲۹] شعبہ بنگلا ڈھاکا یونیورسٹی کے سابق پروفیسر

Dhaka University Institutional Repository

اقبال اور ٹیگور۔ ایک نظر میں" کے عنوان سے ان کا مقالہ اپنی نوع کا پہلا مضمون ہے۔ جس میں برصغیر کے تین عظیم شاعروں کے تفکرات اور تخیلات کا موازنہ ناقدانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں مصنف کی ناقدانہ صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے۔

"مفید اردو مضامین" ڈاکٹر عبداللہ کی ایک درسی کتاب ہے۔ ان کی انگریزی کتاب "سم مسلم اسٹال وارٹس" SUME MUSLIM STALWARTS میں "غالب"، "نواب محسن الملک" اور مولانا شبلی نعمانی کے عنوانات سے جو مضامین ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ ان کی بنگلا کتابیں "مسلمانوں کی قومی بیداری میں چند ادیبوں اور شاعروں کے حصے"، "سرسید احمد کے مذہبی اور سماجی افکار"، "مولانا عبیداللہ عبیدی سہروردی"، "مولانا عبیداللہ سندھی"، مولانا محمد علی جوہر، حکیم حبیب الرحمٰن، مغربی بنگال میں فارسی، بنگلادیش میں فارسی ادب" ان کی تمام تر کتابیں برصغیر کے مسلم رہنماؤں، ادیبوں اور شاعروں کے سیاسی، سماجی اور ادبی کارناموں پر مشتمل ہیں۔ اب تک نظرانداز کی ہوئی مسلمان رہنماؤں کی سیاسی و قومی خدمات کو منظرعام پر لانا ہی ان کا نصب العین ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے برصغیر کے مسلم سیاست دانوں، ادیبوں اور شاعروں کے قومی، سماجی اور ادبی کارناموں پر مشتمل کئی بنگلا کتابیں لکھیں اور موقر اردو رسالوں میں تقریباً تیس ۳۰ سے زیادہ معیاری اردو مضامین بھی سپرد قلم کئے ہیں۔ میرے خیال میں وہ اپنے مشن میں کامیاب ہیں انکے چند مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

"بنگلا ادب میں اسلامی اثرات" (پاسبان ڈھاکا) "نذرل اور جوش کا موازنہ" (ماہ نو، کراچی) "ادب اور آرٹ" (ماہ نامہ سیارہ لاہور)

ڈاکٹر عبداللہ کی تحقیق و تفتیش کی صلاحیت اچھی ہے۔ وہ اپنی رائے مدلل بیان کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان سادہ سلیس اور متین ہے۔ طرز تحریر میں وہ مولانا الطاف حسین حالی سے متاثر ہیں۔

نمونۂ نثر ..... نذرالاسلام، رابندر ناتھ اور اقبال تینوں کو انسانیت سے والہانہ محبت تھی تینوں نے انسانیت کے گیت گائے۔ فرق صرف یہ ہے کہ رابندر ناتھ اور اقبال نے عوام سے دور رہکر انہیں محبت کا پیغام سنایا۔ لیکن نذرل نے دلدل میں پھنسے ہو انسانوں کے قریب پہنچ کر انہیں نکالنے کی کوشش کی۔

Dhaka University Institutional Repository

اسد الحق شیدائی

(۱۹۳۲ء - ــــــــ)

نام اسد الحق شیدائی۔ والد کا نام حکیم عبد الوحید تھا۔ پیدائش ۱۹۳۲ء میں موجودہ ضلع رہتاس صدر مقام سہسرام (بہار) میں ہوئی۔[1] اسد الحق شیدائی کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ شمس شیدائی کے برادر خرد ہیں جن کا تذکرہ پچھلے اوراق میں ہو چکا ہے۔ موصوف تقسیم ہندوستان کے بعد بہار کے فسادات سے متاثر ہو کر سلہٹ چلے آئے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی شمس الحق شیدائی مراری چند گورنمنٹ کالج سلہٹ میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ اسد الحق نے سلہٹ سے پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے میٹرک پاس کرنے کے بعد مراری چند گورنمنٹ کالج سے آئی۔ اے پاس کیا۔ شعبۂ اردو فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے انہوں نے بی۔ اے آنرز اردو اور ۱۹۵۵ء میں ایم۔ اے اردو کے امتحانات اول درجے میں پاس کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کشٹیا کالج میں اردو لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ اسی کالج سے ۱۹۸۹ء میں پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انکی اہلیہ نور النہار بیگم کشٹیا کالج میں بنگلا کی پروفیسر تھیں۔ وہ بھی ملازمت سے سبکدوش ہو چکی ہیں۔ نور النہار بیگم نے اسد الحق کی کتاب "تاریخ کے جھروکے سے" کا بنگلا ترجمہ "ایتی ہاشیر جھروکا تھیکے" کے عنوان سے کیا ہے۔

اسد الحق شیدائی کا رجحان تحقیق و تنقید ہے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے انہیں تحقیق مقالہ نویسی کا ذوق تھا۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں عندلیب شادانی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور پروفیسر حنیف فوق جیسے اساتذہ کے علم و فن، تحقیق و تنقید نے ان کے ناقدانہ ذہن کو اور علمی معیار میں بلندی پیدا کر دی تھی۔ ان کے اردو مضامین ماہنامہ "ساقی" (کراچی) ماہنامہ "مشرق" (لاہور) ماہنامہ "دلربا" (ڈھاکا) "تذکرہ" (کراچی) "شاعر" (آگرہ) "بگڈنڈی" (امرتسر) میں شائع ہوتے رہے۔[1]

ان کے انگریزی مضامین مورننگ نیوز (ڈھاکا) پاکستان آبزرور (ڈھاکا) میں شائع ہوئے۔ اسد الحق شیدائی نے اردو اور انگریزی میں پچاس سے زائد مقالے سپرد قلم کئے۔ ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

مطبوعہ کتابیں

(۱) نئی اور پرانی شمع — سبزی باغ (پٹنہ)

(۲) تاریخ کے جھروکے سے۔ — اس میں اسلامی تاریخ کے چھوٹے چھوٹے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں انہوں نے تمام معلومات فراہم کیں۔

Dhaka University Institutional Repository

(۳) اینڈم ہارولیسٹ — انگریزی مضامین کا مجموعہ

غیر مطبوعہ کتابیں :

"تنقیدی چراغ" اور "تبصرے کی روشنی میں" زیر طبع ہیں۔

"نئی اور پرانی روشنی" اسد الحق کی اردو تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں تنقید کا مادہ برائے نام ہے۔ تحقیق کا مادہ قابل قدر ہے۔ موصوف نے داستان اردو کے چند اہم شخصیت اور اصناف کا محققانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ مثلاً "ڈرامہ کی ابتدا اور عہد بہ عہد ترقی" "مرثیۂ غالب پر ایک نظر"، "مثنوی کی مختصر تاریخ"، "نذرالاسلام - شاعر انقلاب" وغیرہ مصنف کے بہترین تحقیقی مضامین ہیں۔ ان کا اسلوب بیان سادہ سلیس اور رواں ہے۔ خلوص اور صداقت نے طرز تحریر کو جاندار بنایا ہے۔

نمونۂ اسلوب :

نذرالاسلام ہی پہلا شاعر ہے جس نے بنگلہ شاعری میں اردو اور فارسی غزلوں کے نمونے پر غزلیں لکھیں۔ اس سے پہلے بنگلہ شاعری میں یہ ناپید تھی۔ دیکھتے دیکھتے دوسرے شعرا نے بھی اس کی پیروی کی اور غزلوں کا رواج عام ہو گیا۔ اس کی شاعری اردو، فارسی شاعری کی حسین و دلکش ترکیبوں، محاوروں، استعاروں اور اصطلاحوں سے مالا مال ہے۔ آج جن بنگالی شعراء کے کلام میں اردو، فارسی کے الفاظ اور غزل کا سرمایہ ملتا ہے وہ محض نذرالاسلام کی فارسی دانی اور اردو نوازی کی رہین منت ہے۔[1]

---

[1] اسد الحق۔ "نئی اور پرانی روشنی"، مطبوعہ پٹنہ ۱۹۹۶ء ص ۱۴۷

Dhaka University Institutional Repository

قاضی محی الدین وکرم پوری

(۲۲ رجون ۱۹۳۳ء)

اصل نام قاضی محی الدین۔ معروف قاضی محی الدین وکرم پوری۔ ولادت ۲۲ رجون ۱۹۳۳ء کو موضع قمرگاؤں تھانہ سرینگر (وکرم پور) ضلع منشی گنج میں ہوئی۔ والد کا نام قاضی ہلال الدین تھا۔ کتابوں کی تجارت کے سلسلے میں کلکتے میں رہتے تھے۔ قاضی محی الدین نے کلکتے کے اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ وہ کلکتے کے ادبی ماحول میں پروان چڑھے۔ اس صاف ستھرے ادبی ماحول اور کثیر تعداد میں اردو کتابوں کے مطالعے سے ان کی تحریری ذوق کو تقویت ملی۔ ۱۹۵۶ء میں ہوٹل مجسٹک کلکتہ میں آنجہانی کرشن چندر سے ان کی اچانک ملاقات انکے لئے نیک فال ثابت ہوئی۔ کرشن چندر نے محی الدین کے ادبی رجحانات کو تاڑ کر ان کی ہمت افزائی کی اور کہانی لکھنے کے فنی لوازم سے آگاہ کیا۔ اس طرح قاضی محی الدین کی افسانہ نویسی اور تحریری رفتار تیز ہوگئی۔ کرشن چندر کی ہدایات سے مزید فائدہ حاصل ہوا ان کی پہلی کہانی "ریہ کی عورت" ۱۹۵۸ء میں کلکتہ کے ایک ماہنامہ میں شائع ہوئی۔ ان کی افسانہ نویسی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کہانی کے علاوہ قاضی محی الدین نے مضامین، انشائیہ، ڈرامے، ریپورتاژ، طنز و مزاح، شخصیت نگاری وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی۔ ان کی ان ادبی تخلیقات کی تعداد تقریباً دو سو ہے۔ جس کا کثیر حصہ مصنف کے پاس محفوظ ہے۔[1]

قاضی محی الدین کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

"گلشن گلشن صحرا صحرا" (ناولٹ) قاضی محی الدین اینڈ سنز۔ ڈھاکا ۱۹۸۰ء

یہ ایک رومانی ناولٹ ہے اس ناولٹ کا پلاٹ اور کردار سب بنگلادیش کے دیہی ماحول سے وابستہ ہیں۔

اپنی جنتری: (اردو ادبی جنتری) قاضی محی الدین ہر سال پاکٹ سائز کی ادبی جنتری نکالتے ہیں جس میں ماہ و سال کی تاریخوں کے علاوہ کچھ ادبی نگارشات بھی شائع ہوتی ہیں

قاضی محی الدین نے طبع زاد کہانیوں کے علاوہ بنگلا کہانیوں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ ان کی مادری زبان بنگلا اور تعلیمی زبان اردو ہونے کی وجہ سے انہیں دونوں زبانوں کے مزاج اور اصول سے واقفیت ہے۔ وہ تراجم نگاری کے گُر سے واقف ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی سعی کماحقہ کامیاب کہی جا سکتی ہے۔ ان کی کہانیاں "چور چور" "ناقابل تسخیر" وغیرہ بنگلا سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں قاضی محی الدین نے اپنی سوانح بہم پہنچائیں۔ مورخہ ۵ رجولائی ۱۹۹۳ء

Dhaka University Institutional Repository

ان کی طبعزاد کہانیوں میں "کال بیساکھی" (انتخاب، سیدپور) "شاپلہ کے پھول" (سیارہ ڈائجسٹ لاہور، مارچ ۱۹۸۲ء) "بنجارن" (لوک کہانی) (تنویر، ڈھاکا ۱۹۷۱ء) "ڈپلومیسی" (فکاہیہ) ماہنامہ افکار کراچی جنوری ۱۹۸۲ء) وغیرہ ان کی اچھی کہانیاں ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے بعد قاضی محی الدین کی کہانیوں میں بنگلادیش کی دیہاتی زندگی اور قدرتی مناظر کی صحیح عکاسی ہے۔ نیز ان کی کہانیوں میں کرشن چندر کا تاثر ہے۔ طرز تحریر میں اہل زبان سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ لیکن رسم و رواج کی ترجمانی کے علاوہ واقعات کے تناسب سے بنگلہ محاوروں کے استعمال میں ان کی صلاحیت اہل زبان سے برتر ہے۔ ان کی تقریباً پچاس کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔

بنگلادیش ریڈیو کی بیرونی سروس کا پروگرام "بزم ادب" کے لئے بھی کہانیاں اور انشائیہ تحریر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی چند اہم ادبی نگارشات کے عنوان یہ ہیں۔

"پدما" (مضمون) قاضی نذرالاسلام (مضمون) "اردو کی کہانی اردو کی زبانی (انشائیہ)" دھوپ چھاؤں (کہانی) "عربی ریال" اور "شاپلہ کے پھول (کہانی) وغیرہ

بحیثیت مجموعی قاضی محی الدین کی اردو ادبی خدمات قابل قدر ہیں۔

نمونہ کے طور پر "گال بیساکھی" سے چند سطور ملاحظہ ہوں:

"لانچ کا حادثہ اور فضلو کی گمشدگی کے بعد اس کے بھائی نے کئی بار نوری کو مشورہ دیا کہ وہ یہاں سے ڈیرہ اکھاڑ کر اس کے ساتھ چلے مگر اسے تو ہر لحظہ فضلو کا انتظار تھا۔ لانچ کے ڈوبنے اور لوگوں کے مرنے کی خبر وہ سن رہی تھی اور محسوس بھی کر رہی تھی لیکن اس حادثے میں اس کا شوہر یوں گم ہو جائے گا اس بات کا اسے یقین نہیں۔ نہ جانے اس کے دل میں یہ خیال کیسے بیٹھ گیا کہ اس کا فضلو ضرور واپس آئے گا۔ اور اسی انتظار میں وہ گاؤں میں گھوم پھر کر ڈھیکی[1] میں چاول کوٹنے کی مزدوری میں لگ گئی۔

---

[1] چاول کوٹنے کا آلہ جسے بنگلا زبان میں "ڈھیکی" کہتے ہیں

Dhaka University Institutional Repository

مولانا محمد سلطان ذوق چاٹگامی

(۱۹۳۶ء)

نام محمد سلطان۔ تخلص ذوقؔ۔ والد کا نام صوفی ابوالخیر تھا۔ ذوقؔ چاٹگام کے ایک موضع مہیش کھالی میں ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مدرسہ ضریہ پٹیہ (چاٹگام) سے علمی سند حاصل کرنے کے بعد بنگلا دیش کے مختلف مدرسوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ فی الحال مدرسہ ضریہ میں استاد الحدیث کے عہدے پر مقرر ہیں۔ ذوقؔ کی مادری زبان بنگلا ہے۔ عربی، فارسی و اردو تینوں زبان میں شعر کہتے ہیں۔ الفاظ اور اظہاروں پر کماحقہ گرفت حاصل ہے۔ انکی شاعری میں مولویانہ رنگ غالب ہے۔ نظم ہو یا نثر ان کا اسلوب بیان سنجیدہ، صاف اور رواں ہے۔ لیکن ان کے مزاحیہ کلام میں وقتاً فوقتاً ابتزال نمایاں ہیں۔ ۱۹۰ صفحات پر مشتمل "کلیات ذوقؔ" اردو، فارسی و عربی شاعری کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے حمد، نعت، رباعی غزل، نظم، مرثیہ، فکاہیہ، اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔[1]

نمونہ کلام

مشہ انبیا ہے ہمارا رسولؐ
امام الورٰی ہے ہمارا رسولؐ
دو عالم کی رحمت ہے پیارا نبیؐ
وہی رہنما ہے ہمارا رسولؐ

یادِ ماضی (نظم)

مجھ کو طفلی کا وہی پیارا زمانہ یاد ہے
شوق سے مکتب میں آنا اور جانا یاد ہے
یاد ہے وہ بھولے بھالے ساتھیوں کا اتفاق
ان طیور خوشنوا کا چہچہانا یاد ہے

غزل :

جب وہ منزل قریب آتی ہے : یادِ ماضی مجھے ستاتی ہے
بادلو! راہ دو ذرا ہٹ کر : سوزِ دل لیکے آہ جاتی ہے

۱۔ ذوقؔ۔ کلیات ذوقؔ اسلامیہ لیتھو پریس چاٹگام ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۵ء صـ ۲ - ۱۷

Dhaka University Institutional Repository

وقتِ غم ذوقؔ یوں بسر ہو گا : دن گزرتا ہے رات آتی ہے

فکاہیہ

لوٹے کے گلے میں زنجیر

پینے نے کے لوٹے میں سدا لوٹ چلی

دنیا کی ہر اک چیز میں ہے نام کی تاثیر

اے اہل چمن حق یہ ہے انصاف تمہارا

لوٹے کے گلے میں جو لگائی گئی زنجیر!

ذوقؔ کی اردو نثری خدمات:

اردو نثر میں ذوقؔ کی وہ تمام کتابیں شامل ہیں جو انہوں نے مدرسہ کے طالب علموں کے لئے تصنیف کئے۔ تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) رہبر اردو یعنی قواعد اردو جدید مع رسالہ تذکیر و تانیث

(۲) الطریق الی الانشاء (معجم الکلمات) عربی اردو ڈکشنری

(۳) الطریق الی الانشاء سلیس اردو میں جدید عربی خط و کتابت اور مضمون نگاری کے قواعد۔

شاعرانہ صلاحیت کی حیثیت سے ذوقؔ اپنے ہم عصر بنگالی نژاد شعراء حکیم ہلالی چاٹگامی۔ منور صدیقی چاٹگامی، شیدا سلہٹی وغیرہ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ تاہم بنگلا دیش کے اس نامساعد حالت میں ان کی علمی و شعری خدمات قابل قدر ہیں۔

لہ ذوقؔ ۔ کلیات ذوقؔ

Dhaka University Institutional Repository

اختر آنولوی

(۱۹۳۵ء)

اصل نام فیروز احمد تخلص اختر۔ ولادت ۱۹۳۵ء میں بہ مقام آنولہ ضلع بریلی اتر پردیش (بھارت) ایک مہذب و تجارت پیشہ گھرانے میں ہوئی۔ والد کا نام منصور احمد تھا۔

اختر آنولوی سابق مشرقی پاکستان کے دور سے شعر و شاعری کا چرچا کرتے آرہے ہیں۔ ان کی نگارشات "پاسبان (ڈھاکا) رگِ سنگ (کانپور) شمسی آواز (کلکتہ) شمسی پنجابی گزٹ، سوداگر (کراچی) میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے حمد، نعت، غزل و قطعہ وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے حمد و نعت عشق خدا و رسول ؐ کے جذبے سے سرشار ہیں۔ جس کا بنیادی تصور کارِ ثواب ہے۔ غزلوں میں رنگ تغزل کے علاوہ جدید فکری رجحان کو بھی کما حقہ اپنانے کی کوشش کی ہے۔ بنیادی طور پر اختر روایتی شاعر ہیں۔ آشعار میں بحر و وزن کی کچھ خامی نظر آتی ہے۔ نفس شاعری اچھی ہے۔

اختر آنولوی کی حمد و نعت کا مجموعہ (۶۴ صفحات پر مشتمل) سراجاً منیرا کے نام سے حلقۂ فکر و دانش کی سرپرستی میں برقی آرٹ پریس ڈھاکا سے چھپ کر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ ان کی ادارت میں رسالہ "دین و دانش" کے کل تین شمارے ڈھاکا سے شائع ہوئے انکے کل شعری و نثری تخلیقات تبلیغ اسلام و مدحت سرورِ کائنات ؐ سے مزین ہیں۔ اختر آنولوی کی ادارت میں دیگر رسالہ "علم و دانش" بھی ڈھاکے سے شائع ہوا۔ یہ ڈائجسٹ نما رسالہ دینی و علمی معلومات پر مبنی ہے۔ بحیثیت مجموعی اختر آنولوی کی شعری و دینی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔

نمونۂ غزل :

ہم کو جتنے لوگ بھی اب تک جہاں دیدہ ملے
جاگنے کا وقت جب آیا تو خوابیدہ ملے

بتکدے میں ایک بت بھی دادرس پایا نہیں
سب ہی دستِ خود پرستی کے تراشیدہ ملے

اللہ اللہ سرخروئی کی تمنا کا کمال
دوسروں کے خوں میں اختر لوگ غلطیدہ ملے

Dhaka University Institutional Repository

نمونۂ نعت :

توحید کا چراغ جلایا ہے آپؐ نے
اللہ ایک ہے یہ بتایا ہے آپؐ نے
عرفان اپنی ذات کا انسان کو ملا
انسان کا مقام بنایا ہے آپؐ نے
بیدار ہو گیا میرا سویا ہوا نصیب
شاعر جو مجھ کو اپنا بنایا ہے آپؐ نے
نعت نبیؐ کے شوق میں ہو آسمان پر
اخترؔ مقام خوب یہ پایا ہے آپ نے

Dhaka University Institutional Repository

زین العابدین

(۱۹۳۶ء)

بنگلہ دیش کی ادبی محفل میں زین العابدین کی پہچان ایک معروف افسانہ نگار اور معتبر صحافی کی حیثیت ہے۔ ان کی ولادت الہ آباد (یو پی) انڈیا میں ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ والد کا نام مصطفےٰ تھا۔ زین العابدین ۱۹۴۷ء کے بعد سابق مشرقی پاکستان آئے اور اسے اپنا وطن ثانی بنایا۔ انہوں نے قائداعظم ہائی اسکول سے ایس ایس سی۔ ڈھاکا کالج ڈھاکا سے ایچ ایس سی اور جگناتھ کالج سے بی کام کی ڈگری لی۔ ۱۹۶۰ء میں شعبہ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا!

صحافت ان کا ذریعہ معاش اور افسانہ نگاری مشغلہ ہے۔ بنگلہ دیش میں وہ روزنامہ جنگ کراچی کے نمائندہ ہیں۔ بنگلہ دیش کا انگریزی روزنامہ "بنگلہ دیش ٹائمز" کے علاوہ دیگر انگریزی اخبار سے بھی منسلک ہیں۔

زین العابدین کا شمار ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۶۰ء سے ہوا۔ انہوں نے متعدد افسانے اور کئی فلموں کی کہانیاں تحریر کیں۔ ان کا قوت مشاہدہ اور نفسیاتی شعور اچھا ہے۔ سماج ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب کے مانند ہے جس سے وہ افسانوں کا پلاٹ اخذ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے لکھنے کی رفتار بہت سست ہے۔ ان کی کہانیوں میں شہر میں بسنے والے متوسط طبقے کی روزانہ زندگی کی ترجمانی کے علاوہ گاؤں کے مزدوروں، کسانوں، مچھیروں کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور دکھ سکھ کی عمدہ عکاسی افسانوں کے پلاٹ مقصد کے تحت ہوتے ہیں۔ کردار نگاری میں ارتقا ہے۔ زین العابدین کی کہانیاں کرشن چندر کی کہانیوں سے متاثر ہیں۔ انہوں نے بنگلا الفاظ مناسب جگہ میں استعمال کئے ہیں۔ ساتھ ہی اس کا نعم البدل اردو الفاظ لکھ دیا ہے اس سے کہانی کی حقیقت بین بین توانائی پیدا ہو گئی ہے۔ "گوالا"۔ "راکھال" "کسان وغیرہ ان کی اچھی کہانیاں ہیں۔ زین العابدین کے افسانوں کی جڑیں بنگلہ دیش کی زمین میں پیوستہ ہیں۔ اس لحاظ سے امید کی جاتی ہے کہ ان کے افسانوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے۔ زین العابدین افسانوں میں ۱۹۷۱ء کے بعد بنگلہ دیش کی دیہاتی زندگی کی عکاسی ہے۔ انہوں نے دیہات کا مقامی رنگ اور منظر نگاری کا مرقع ایک مصور کی طرح کھینچا ہے۔ انکی افسانہ نگاری کا رنگ منشی پریم چند سے مماثل ہے۔ کہانیاں دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کی قابل ہیں۔ زین العابدین کے بعض افسانے اس قدر حقیقت پر مبنی ہیں کہ اسے پڑھتے ہوئے کبھی کبھی خبرنامے کا کالم محسوس ہوتا ہے۔ یعنی افسانویت پر حقیقت غالب رہتی ہے۔ ان کا کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ زین العابدین کے افسانے بنگلا، پاک و ہند کے مختلف معیاری رسائل سیپ (کراچی) قومی زبان (کراچی) افکار (کراچی)

مبنی زین العابدین کا زبانی بیان

Dhaka University Institutional Repository

انتخاب (ڈھاکا) "مجلس" (ڈھاکا) وغیرہ میں منتشر حالت میں بکھرے ہوئے ہیں۔

ان کی کہانی "راکھال" کا مرکزی کردار ایک چرواہا ہے جسے "ملن جودّھا" ہونے پر فخر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بنگلادیش کے باشندے پرسکون دن گزاریں۔ گاؤں سے تمام برائیوں کی بیخ کنی کر دی جائے۔ وہ اپنے عزم پر عمل پیرا ہوتا ہے کہ گاؤں سے تمام خلفشار اور برائیوں کی جڑوں کو اکھاڑ کر امن و سکون قائم کرے۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ لوٹ، تاراج، ڈاکازنی کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ خود لاش بن جاتا ہے۔ شرپسند اسے قتل کر دیتے ہیں اور اس کی ساری محنتیں اور جدوجہد رائیگاں جاتی ہیں۔

نمونہ :

"آج کلیم اللہ ہاٹ سے دودھ بیچ کر لوٹ رہا تھا تو دیکھا کہ اٹھان (آنگن) میں بہت سارے لوگ جمع ہیں۔ سر جھکائے بیٹھے ہیں جیسے کسی گہری سوچ میں ہوں۔ اس نے بیٹھے ہوئے دینو مانجھی سے پوچھا کس بات کی بھیڑ ہے۔ پھر لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جہاں غم و غصہ کی دھوپ چھاؤں پھیلی ہوئی تھی۔ مگر دینو مانجھی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ میاں بھائی بولے۔ کل رات منجو تانتی کے گھر ڈاکہ پڑا ہے ڈاکو اس کی ساری کمائی، ہل، بیل اور فصل کاٹ کر لے گئے۔ سرحد پار سے آئے تھے۔

لہ میرے سوالنامے کے جواب میں زین العابدین کا زبانی بیان۔

سہ زین العابدین۔ "راکھال" افسانہ ۳۔ گاؤں کا ہفتہ وار بازار

Dhaka University Institutional Repository

قاسم انیس

(۱۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء)

خاندانی نام محمد قاسم ۔ معروف قاسم انیس ۔ تخلص انیس ۔ ولادت ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں ہوڑہ (مغربی بنگال) میں ہوئی ۔ والد مرحوم کا نام محمد یٰسین تھا ۔ ۱۹۵۰ء میں اپنے خاندان والوں کے ہمراہ ہجرت کر کے سابق مشرقی پاکستان آ گئے، میمن سنگھ میں سکونت اختیار کی ۔ قاسم انیس پانچ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے ۔ مالی پریشانی دامنگیر رہی ۔ خواہش کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے ۔ بنگلادیش کے دبستان ادب میں ان کی اول پہچان ایک کاتب (خوش نویس) کی حیثیت سے ہے ۔ بحیثیت شاعر و افسانہ نگار ان کی پہچان ثانوی ہے ۔ قاسم انیس کی شاعری و افسانہ نویسی کثیر اردو ادبی کتابوں کا مطالعہ اور ڈھاکا کے شعری و ادبی ماحول کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے ۔ ۱۹۷۶ء میں حافظ دہلوی کی حوصلہ افزائی پر پہلی مکمل غزل لکھی اور ان سے مزید استفادہ حاصل کیا[1]

قاسم انیس ۱۹۶۶ء سے فن کتابت میں مشغول ہیں ۔ خوشنویسی ان کا پیشہ بھی ہے اور شوق بھی ۔ اس فن میں وہ ماہر ہیں ۔ وہ در سابق مشرقی پاکستان میں روزنامہ "پاسبان" "ہماری آواز" اور ہفت روزہ "انصاف" ڈھا کا بحیثیت کاتب خدمات انجام دیتے رہے ۔ ہفت روزہ "انصاف" بند ہو جانے کے بعد وہ سید پور چلے گئے ۔ ۱۹۷۳ء کے بعد ڈھا کا آئے اور کتابت کے پیشے سے منسلک ہو گئے ۔

قاسم انیس کی شاعری میں روایت و جدت کا امتزاج ہے ۔ ان کی شاعری غم جاناں اور غم دوراں کی ترجمان ہے ۔ بعض اشعار زندگی سے قریب ہیں ۔ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو شعری جامہ پہنایا ہے ۔

بطور نمونہ چند اشعار :

صبح کو روٹی ڈھونڈنے نکلے اپنے اپنے گھر سے لوگ
شام کو ایسے لوٹے، جیسے لوٹے ہیں محشر سے لوگ (غیر مطبوعہ)

اب تو معیارِ شرافت کی سند ∴ آدمی جسم کے اوپر مانگے
دیکھ کر دہر کی رعنائی کو ∴ آج ہر شخص مقدر مانگے (غیر مطبوعہ)

---

[1] ۔ قاسم انیس کا زبانی بیان

Dhaka University Institutional Repository

کوڑے کرکٹ سے مقدر کا لکھا چُننے کو
پھول سے بچّے چلے پاؤں میں چکّر لیکر (غیر مطبوعہ)

جیسے سیرت کی جھلک صورت میں ہو اس خوف سے
آئینہ اب سامنے رکھنے سے گھبراتے ہیں لوگ (غیر مطبوعہ)

قاسم انیس کو افسانہ نگاری کا بھی شوق ہے۔ ان کے افسانے پاک و بھارت کے علاوہ بنگلادیش کے مختلف اردو رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ مقصدیت کے لحاظ سے ان کے افسانے مفید ہیں۔ وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے افسانے کا پلاٹ اخذ کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سچائی اور حقیقت نگاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں محمد پور کیمپ میں محصور افراد کی زندگی کے مسائل، نفسیاتی الجھاؤ اور معاشی بدحالی کی عکاسی ہے۔ ان کی کہانی "آخری رنگ" ایک رومانی کہانی ہے جس میں متوسط زندگی اور رسم و رواج کی عکاسی ہے۔ "بہتے الاؤ" نچلے طبقے میں پرورش پانے والے مرد اور عورت کی ذلیل فطرت اور چھوٹی ذہانت کی ترجمانی ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

صابر علی صابر

(۲۰ دسمبر ۱۹۴۵ء)

خاندانی نام محمد صابر علی۔ تخلص صابر۔ والد کا نام عاشق محمد۔ ولادت ۲۰ دسمبر ۱۹۴۵ء کو بلیا (یوپی) بھارت میں ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں سابق مرقی پاکستان آئے اور ایس ڈی میں سکونت اختیار کی۔ ناظم الدین ریلوے ہائی اسکول سے میٹرک، جناح کالج ایس ڈی سے انٹرمیڈیٹ (۱۹۶۴ء) پاس کرنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں قائداعظم کالج ڈھاکا سے بی کام اور ڈھاکا یونیورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں ایم کام کا امتحان پاس کیا۔

ان کے اشعار میں روایت اور جدیدیت کا امتزاج ہے۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ زبان و بیان پر گرفت ہے۔

صابر علی صابر شعر گوئی کے علاوہ ادبی سرگرمیوں سے بھی وابستہ ہیں۔ وہ جلال عظیم آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ سہ ماہی "ادب" کے حلقہ ادارت میں شامل ہیں۔ ڈھاکے میں منعقدہ مشاعرہ و ادبی نشستوں میں خوش الحانی سے شرکت کرتے ہیں۔ صابر کی غزلوں میں فکری پہلوؤں کے ساتھ ان کی زندگی کے تجربات و کیفیات بھی عیاں ہیں۔ ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ان کے اشعار بنگلا، پاک و ہند کے رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ صابر کا تعارف ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے ہے۔

نمونہ کلام :

جو کام تھا دشوار وہ آسان بہت تھا
ہمت و جواں مردی کا فقدان بہت تھا
وہ میرا ہم نشین بھی اعدا میں تھا شامل
اور اس کے لئے میں بھی پشیمان بہت تھا
جو مجھ کو رُلا کر گیا ڈھاکے سے کراچی
اس بے وفا سے ملنے کا ارمان بہت تھا
اک منفرد آواز تھا اس دور کا صابر
اس کی غزل میں دانش و وجدان بہت تھا

؎ یہ تمام معلومات صابر سے حاصل ہوئیں۔

Dhaka University Institutional Repository

ارمان شمسی

(۱۹۴۵ء)

خاندانی نام محمد ارمان۔ قلمی نام ارمان شمسی۔ ولادت ۲۱ر اگست ۱۹۴۵ء قصبہ آنولہ ضلع بریلی کے ایک تجارت پیشہ مہذب گھرانے میں ہوئی۔ تین سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔

ارمان شمسی نے نہایت کسمپرسی میں آنولہ سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان کیا۔ پھر جامعہ اردو علی گڑھ سے پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس کئے۔ بی۔ اے کی تیاری میں مشغول تھے کہ ۱۹۶۴ء میں ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے مجبوراً سابق مشرقی پاکستان آ گئے۔ اور مستقل طور پر ڈھاکے میں سکونت اختیار کی۔ اور کسب معاش کی کوشش میں منہمک ہو گئے۔[1]

ارمان شمسی کو بچپن ہی سے افسانہ نویسی کا شوق تھا۔ بچوں کے لئے کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ افسانہ نویسی کا ذوق و شوق نے انہیں بنگلادیش کے افسانہ نگاروں کے گروہ میں شامل کر دیا۔

ارمان شمسی ۱۹۷۱ء کے بعد بنگلادیش میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ افسانہ نویسی میں انہیں مختصر کی تکنیک اپنانے کی صلاحیت ہے۔ زبان بامحاورہ لکھتے ہیں مگر ان کے افسانوں کا پلاٹ زیادہ تر کلکتہ اور دہلی کے ماحول سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ارمان شمسی کے افسانوں میں کلکتہ، دہلی اور بمبئی کی شہری زندگی کی عکاسی ہے۔ "پیاسی ندیا" "دہکتی جنت" "اسیرِ فطرت" بچھیا ان کی اچھی کہانیاں ہیں۔ ارمان شمسی کے افسانے "بیسویں صدی (نئی دہلی) میں شائع ہوتی آ رہی ہیں۔ بنگلادیش کے اردو رسالوں میں بھی ان کی کہانیاں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں ارمان شمسی کا بیان۔ ۶ر مارچ ۲۰۰۲ء

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر

(۱۹۴۷ء)

مکمل نام کلثوم ابوالبشر مجموعہ دار۔ قلمی نام کلثوم ابوالبشر۔ ولادت ۱۱ فروری ۱۹۴۷ء کو بمبئی (ہندوستان) میں ہوئی۔ ان کا آبائی وطن موضع حسین پور ضلع نواکھالی (بنگلادیش) ہے۔ والد مرحوم راجہ میاں تجارت کے سلسلے میں بمبئی میں سکونت پذیر تھے۔

ڈاکٹر کلثوم نے ۱۹۶۳ء میں پونا بورڈ (ہندوستان) سے میٹرک کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ اس کے بعد بمبئی یونیورسٹی سے ۱۹۶۵ء میں ایچ۔ ایس۔ سی اور ۱۹۶۸ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۶۸ء کے بعد اپنے شوہر ابوالبشر مجموعہ دار کے ہمراہ مستقل طور پر ڈھاکہ آگئیں۔ ازدواجی زندگی کی مصروفیات میں منہمک رہنے کے باوجود تحصیل علم کی پیاس نے انہیں بے چین رکھا۔ انہوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے ۱۹۷۱ء میں ایم۔ اے (اردو) کا امتحان دیا۔ اور اول درجے میں اول نمبر سے کامیاب ہوئیں۔ ۱۹۷۲ء میں اسی یونیورسٹی سے ایم۔ اے فارسی کا امتحان بھی اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ ڈھاکا یونیورسٹی میں حصولِ علم کے دوران انہوں نے موتی جھیل گورنمنٹ گرلز اسکول ڈھاکا میں تدریسی فرائض بھی کچھ دنوں تک انجام دیئے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ حیات اور کارنامے" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر بمبئی یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی اعلیٰ ڈگری لی۔ علاوہ ازیں فردوسی یونیورسٹی مشہد (ایران) سے پرشین ایڈوانس کورس کا ڈپلوما لیا۔

۲ جولائی ۱۹۷۳ء کو ان کا تقرر شعبہ اردو و فارسی (ڈھاکا یونیورسٹی) میں لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ اسی شعبے میں ترقی کر کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔[1]

بنگلہ دیش کے اردو ارباب قلم میں ڈاکٹر کلثوم کی پہچان کامیاب معلمہ، اچھی نثر نگار و محققہ کی حیثیت سے ہے۔ اردو فارسی کے علاوہ انہیں انگریزی، بنگلا و ہندی زبان سے بھی واقفیت ہے۔ اردو و فارسی میں انہوں نے مفید درسی و ادبی تخلیقات سپرد قلم کئے۔

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں ڈاکٹر کلثوم نے یہ تمام معلومات فراہم کیں۔

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر کلثوم کی اہم تصنیفات و تالیفات حسب ذیل ہیں۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی ــ حیات اور کارنامے ۔ اشاعت اوّل ۱۹۹۲ء برقی آرٹ پریس ڈھاکا

یہ کتاب ڈاکٹر کلثوم کے تحقیقی مقالہ کے چند ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں مصنفہ نے شادانی کی حیات شخصیت، ان کی شاعری اور تنقید نگاری کے مختلف پہلوؤں پر محققانہ روشنی ڈالی ہے۔

آسان اردو : کتاب درسی برائے کلاس نہم و دہم۔

گلشنِ فارسی : 〃 〃 〃

ان کتابوں کی تدوین و ترتیب کی خدمات ڈاکٹر کلثوم نے انجام دیں۔

فلسطین (کتابچہ) (ترجمہ از فارسی بہ بنگالی)

گزیدہ احوال و آثار قاضی نذرالاسلام مطبوعہ رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی پاکستان

(شاعرِ ملّی بنگلادیش) ۱۹۹۸ء بنگلادیش

۱۶۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب قاضی نذرالاسلام کی نظموں کے منظوم فارسی تراجم اور مختصر سوانح ہے

یہ ڈاکٹر کلثوم اور عیسیٰ شاہدی کا مشترکہ فارسی ترجمہ ہے۔

حکیم حبیب الرحمٰن کا مخطوطہ "ثلاثۂ غسالہ" کی اشاعت میں ڈاکٹر کلثوم کا پرخلوص تعاون حاصل ہے۔ کتاب کے مرتب عارف نوشاہی "حرفِ تشکر" میں رقمطراز ہیں۔

"خدا کا شکر ہے کہ یہ لعل گم شدہ دستیاب ہو گیا ہے اور یہ قیمتی کتاب اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔

ڈھاکے سے ڈاکٹر کلثوم ابو البشر سابق صدر نشین شعبہ اردو فارسی دانش گاہ ڈھاکا بنگلادیش نے "ثلاثۂ غسالہ" کے اردو حصے کی عکسی نقل اور فارسی اور عربی حصے کی دستی نقل فراہم کی ہے۔"[1]

اس کے علاوہ ڈاکٹر کلثوم نے تقریباً چالیس تحقیقی و ادبی مضامین سپردِ قلم کئے جو برصغیر کے مختلف معیاری جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی اردو و فارسی ادبی تخلیقی سرگرمیاں ہنوز جاری ہیں۔ ان کے چند اہم مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

مشرقی بنگال کی صحافت کا سنگ میل "المشرق" (ماہ نامہ روشن ادب دہلی)

---

[1] ثلاثۂ غسالہ" حکیم حبیب الرحمٰن۔ ترتیب و تعلیقات۔ عارف نوشاہی۔ حرفِ تشکر، مغربی پاکستان اردو اکاڈمی لاہور ۱۹۹۵ء

Dhaka University Institutional Repository

"فورٹ ولیم کالج کا ایک نادر نسخہ گل ہرمز یعنی حسن و عشق" ("نوائے ادب" بمبئی)

"بنگلہ دیش کے چند اہم اردو جرائد" ("ماہنامہ قومی زبان" اسلام آباد)

"بنگال کی فارسی، اردو اور عربی تصانیف کی فہرست" ("سہ ماہی دانش" اسلام آباد)

ثلاثہ غسالہ - ایک تعارف

"مثنوی جہاں شاہ و جہاں بانو" ("رسالہ مجلس" ڈھاکا)

ڈھاکا یونیورسٹی میں موجود واحد قلمی نسخہ

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر کلثوم نے ڈھاکا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں گمنامی میں پڑے ہوئے بیشتر اردو و فارسی مخطوطات کو اپنے قلمی کد و کاوش سے منظر عام پر لاکر قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ وہ ایک باشعور محقق کہی جاسکتی ہیں۔ بنیادی طور پر وہ تحقیق سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر رواں اور دلنشیں ہے۔ ڈاکٹر کلثوم اپنے مافی الضمیر کو بے تکلفی کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کے مضمون میں بے تکلفی اور شگفتگی قاری کو دوسری طرف متوجہ ہونے نہیں دیتی۔ تنقید جیسی خشک صنف کو وہ اپنی رنگین بیانی اور عبارت آرائی سے قاری کے لئے پُر لطف بنا دیتی ہیں۔ ان کے اسلوب کی شگفتہ بیانی ذہن کو ایسا متاثر کرتی ہے کہ قاری کلثوم ابوالبشر کی نگارشات کو شروع سے آخر تک مطالعہ کئے بغیر نہیں رکتا۔ اور چھوٹی بڑی تخلیقی خامیاں قاری کی نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔ ان کی کتاب "ڈاکٹر عندلیب شادانی - حیات اور کارنامے" میں مصنفہ کی تحقیق و تفتیش قابل ذکر ہے۔ اس میں ان کی تنقید کما حقہ تاثراتی کہی جاسکتی ہے۔ تاہم ان کی یہ تحقیقی کتاب اردو شعر و ادب کے ذخیرے میں اہم اضافہ ہے۔ یہ کتاب صرف شادانی کے کارناموں تک محدود نہیں بلکہ سابق مشرقی پاکستان کی اس وقت کے ادبی حلقوں میں شعری و ادبی سرگرمیوں کی آئینہ داری کرتی ہے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً شوقیہ افسانے بھی لکھے لیکن ان کا ادبی میدان تحقیق و تنقید ہے۔

نمونہ نثر ..... مشرقی بنگال (موجودہ بنگلادیش) میں اردو فارسی ادب کا جائزہ لیتے ہی ڈاکٹر عندلیب شادانی کا چہرہ اپنی تمام تر جلوہ افروزیوں کے ساتھ ابھر آتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ بنگلادیش میں اردو ادب اور ڈاکٹر شادانی لازم و ملزوم بن چکے ہیں ایک کے بغیر دوسرے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر شادانی نے اپنی زندگی کا طویل ترین حصہ بنگلادیش کے دارالسلطنت ڈھاکا میں گزارا ہے۔"

Dhaka University Institutional Repository

ڈاکٹر اُمِّ سلمیٰ

(۱۹۴۷ء ۔۔۔ ۲۰۰۸ء)

مکمل نام اُمِّ سلمیٰ۔ ولادت ۲ر جون ۱۹۴۷ء بیرہمن باڑیہ بنگلادیش میں ہوئی۔ والد مرحوم شمس الدین منسٹری آف ڈیفینس میں انجینئر تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد پاکستان میں کچھ عرصہ تک قیام رہا۔ اُمِّ سلمیٰ کی تعلیم و تربیت اسلام آباد میں ہوئی[1]۔ انہوں نے ۱۹۶۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۰ء میں اسی یونیورسٹی سے بی۔ایڈ کی ڈگری لی۔ شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے ۱۹۷۶ء میں ایم۔اے فارسی کی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۹۱ء میں اسی یونیورسٹی سے شعبۂ عربی کے پروفیسر ڈاکٹر ابوبکر صدیق کی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی کی سند لی۔ تحقیقاتی مقالے کا عنوان تھا "بنگلادیش کے اردو و فارسی ادب میں تاریخی ماخذ" (انیسویں صدی میں)

۱۹۷۴ء میں ام سلمیٰ کا تقرر بحیثیت اردو لیکچرر شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی میں ہوا۔ فی الحال وہ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔

بنگلادیش کے دبستان اردو میں ام سلمیٰ کی پہچان کامیاب اچھی معلمہ، محققہ اور نثر نگار خاتون کی حیثیت سے ہے۔ ام سلمیٰ نے تقریباً ۵۴ تحقیقی و ادبی مضامین بھی سپرد قلم کئے۔ جن میں چند اہم مضامین کے عنوان یہ ہیں۔

"ٹیپو سلطان کے خاندان میں فارسی کا چرچا" "نواب سید محمد آزاد کی خدماتِ اردو" "بنگلادیش کے لوک گیت" "اقبال کی نگاہ میں عورت" "اردو کا پہلا نثری ڈرامہ" "نوابی دربار" "مرزا جان طپش کی ادبی اور سیاسی سرگرمیاں" "محمد اقبال اور قاضی نذرالاسلام ــــ ایک تقابلی جائزہ" وغیرہ

اُمِّ سلمیٰ کو اردو، فارسی اور بنگلا کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی دسترس حاصل ہے۔ ان کی قلمی نگارشات چاروں زبان میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ موصوفہ میں تحقیق و تفتیش کا مادہ اچھا ہے۔ ان میں نئی نئی باتوں کے جاننے کی لگن ہے۔ تحقیق و تفتیش کا کام بڑی دلجوئی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں۔ ان کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بات کو سمجھ کر لکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان میں خودنمائی و احساس برتری نہیں ہے۔ ان کا ناقدانہ لہجہ نرم اور دوستانہ ہے۔ ام سلمیٰ کی اسلوب نگارش

---

[1] ڈاکٹر ام سلمیٰ کا زبانی بیان ۔ ۱۵ر جون ۲۰۰۲ء

Dhaka University Institutional Repository

میں سلاست، گھلاوٹ اور سنجیدگی ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کے اسلوب کو ادیبانہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ان متعدد فن اور فن کاروں پر ضیا پاشی کرنے کی مفید کوشش کرتی ہیں جو کتب خانوں کے تاریک گوشوں میں پڑے ہیں یا ان پر تبصرہ نگاروں کی نظریں نہیں پڑیں۔ ان کی تمام تحقیقی خدمات کے پس پردہ یہی مقصد کارفرما ہے۔ ان کا تحقیقی مقالہ "بنگلادیش کے فارسی و اردو ادب میں تاریخی ماخذ" (انیسویں صدی) تشنہ گان ادب کے لئے مفید تحفہ ہے۔ یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب کے عنوانات سے مضامین کے موضوعات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ مقالہ بنگلادیش میں انیسویں صدی کی سماجی، سیاسی ادبی و ثقافتی زندگی کی معلومات کے لئے دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے ۔۔۔ یہ دبستان اردو و فارسی میں شعبۂ تاریخ کے محققین کے لئے روشن منارہ ہے۔ اس مقالہ کی طباعت بہت ضروری ہے۔ مقالہ کے ابواب حسب ذیل ہیں:

باب اوّل : بنگلادیش ایک مختصر تعارف

باب دوم : بنگال میں فارسی ادب کی تاریخ

باب سوم : بنگال میں اردو ادب کی تاریخ

باب چہارم : بنگلادیش کے فارسی اور اردو ادب میں سیاسی تاریخ کا ماخذ

باب پنجم : بنگلادیش کے فارسی اور اردو ادب میں سماجی تاریخ کا ماخذ

باب ششم : بنگلادیش کے فارسی اور اردو ادب میں مذہبی تاریخ کا ماخذ

باب ہفتم : بنگلادیش کے فارسی اور اردو ادب میں ادبی تاریخ کا ماخذ

باب ہشتم : بنگلادیش کے فارسی اور اردو ادب میں شخصی تاریخ کا ماخذ

بطور نثری نمونہ غیر مطبوعہ تحقیقی[1] مقالہ سے چند سطور ملاحظہ فرمائیں۔

"ڈھاکہ نہایت قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ لیکن مغل دور حکومت ہی میں اسے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ ۱۶۰۸ء میں مغل سپہ سالار اسلام خاں یہاں کے صوبہ دار متعین ہوئے اور اسلام خاں نے شہنشاہ جہانگیر کے نام پر اس علاقہ کا نام جہانگیر نگر رکھا۔ اورنگ زیب کے زمانہ تک یہ نام یونہی برقرار رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ علاقہ ڈھاکا کے نام سے موسوم ہو گیا۔"

---

[1] تحقیقی مقالہ "بنگلادیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی ماخذ" (غیر مطبوعہ)

Dhaka University Institutional Repository

شمیم زمانوی

(۱۹۴۷ء)

بنگلہ دیش میں ۱۹۷۱ء کے بعد ابھرنے والے شعراء میں شمیم زمانوی قابل ذکر ہیں۔ ان کی ولادت ۱۹۴۷ء میں غازیپور (یو پی) بھارت میں ایک پٹھان گھرانے میں ہوئی ہیں ہوئی۔ موصوف تقسیم ہندوستان کے بعد اپنے اعزا کے ساتھ سابق مشرقی پاکستان آئے اور خالصپور (کھلنا) میں سکونت اختیار کی۔ کھلنا میں بی۔ اے تک تعلیم مکمل کی۔ شمیم زمانوی زمانۂ طالب علمی سے مشق سخن کر رہے ہیں۔ مولوی صبرالدین صابر عظیم آبادی سے مشورہ سخن لیا کرتے تھے۔ وہ شعر و شاعری کے علاوہ دیگر ادبی سرگرمیوں سے منسلک رہے۔ اردو انجمن "بزم شاہین" خالص پور (کھلنا) کے (۱۹۶۵ء میں) معاون ناظم اور ۱۹۶۷ء میں صدر منتخب ہوئے قیام بنگلادیش کے بعد خالص پور (کھلنا) سے قلمی رسالہ "پرواز" نکالا۔ اس رسالے کی کتابت بھی خود ہی انجام دی جو ان کی اردو دوستی کا بیّن ثبوت ہے۔

شمیم زمانوی ہر صنف پر طبع آزمائی کرتے ہیں مگر ان کا بنیادی میدان نظم گوئی ہے۔ شعر و شاعری میں فیض احمد فیض احمد ندیم قاسمی، اور احمد فراز سے بہت متاثر ہیں۔ غالب ان کا پسندیدہ شاعر ہے۔ شمیم زمانوی ترقی پسند نظریات کے حامی اور رجائی شاعر ہیں۔ یاس و حرماں سے انہیں نفرت ہے۔ ان کی شاعری قنوطیت سے مبرّا ہے۔ شمیم کے اشعار میں تفکر اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔ وہ سماج اور زمانے کی ستم ظریفیوں کا شکوہ جرأت مندی سے کرتے ہیں۔ شمیم کے کلام میں فکر و فلسفہ کی پر پیچ باتیں نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو شاعرانہ پیکر میں پیش کیا ہے۔ ان کی خودداری اور رجائی طبع کبھی کبھی انتہا کو پہنچ کر احساس برتری کے زمرے میں آجاتی ہے جیسا کہ ان کے شعر سے ظاہر ہے۔

میرا قد ناپنے والوں سے کوئی کہدے شمیم
میرے سائے کے بھی ہوتے ہیں برابر کتنے

نظم گوئی میں ان کا اسلوب بیان دل نشیں اور رواں ہے۔ "دوسرا رخ" "جمود" "اے ہماری جان ڈھاکا جامعہ" "لمحۂ فکر" وغیرہ اچھی نظمیں ہیں۔

لہ شمیم زمانوی کا زبانی بیان۔ ۷ر اگست ۱۹۸۲ء

Dhaka University Institutional Repository

نظم "دوسرا رخ" سے چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں:

اجالے سے کہا بڑھتی ہوئی تاریکیوں نے
تمہاری زیست کا اب تو وقتِ شام آپہنچا
جوانی ڈھل چکی اب موت کا پیغام آپہنچا
تمہاری تمکنت کا آخرش انجام آپہنچا

اجالا ڈوبتی آواز میں گویا ہوا اس سے
تمہارا خواب بس اک خواب ہے، تعبیر ناممکن
کبھی ہوتی بھی ہے ظلمت میں ضم تنویر ناممکن
حقیقت چھپ نہیں سکتی کبھی باطل کی ظلمت سے
نکل سکتی نہیں ہرگز کبھی سورج کو تاریکی

Dhaka University Institutional Repository

س۔م۔ ساجد

(۱۹۴۹ء)

س۔م۔ ساجد ۱۹۴۹ء میں نیا بابو پاڑہ سید پور (نلفاماری) میں پیدا ہوئے[1]۔ بنگلادیش کے ہونہار نوجوان افسانہ نگاروں کے صف اول میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ پیشہ تجارت ہے تجارت سلسلے میں اکثر بیرونی ممالک کا سفر کرتے رہتے ہیں جس نے ان کے قوت مشاہدہ کو توانائی بخشی ہے۔

س۔م۔ ساجد کی قلمی تخلیق بنگلادیشی ماحول میں پروان چڑھی۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۶۷ء میں کسی رسالے میں شائع ہوا۔ اب تک انہوں نے تقریباً اڑتیس ۳۸ کہانیاں سپرد قلم کیں۔ جو مختلف معیاری رسالوں میں شائع ہوئیں ہیں۔ فنی اعتبار سے ان کے افسانے قابل قبول ہیں۔ پلاٹ مقصد کے تحت ہوتے ہیں۔ واقعات میں تسلسل اور حقیقت نگاری، زبان کی روانی، تاثر کا ارتکاز ان کی کہانیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں انقلاب بنگلادیش کی زد میں آنے والے مقامی وغیر مقامی افراد کے مصائب، قیام بنگلادیش کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی ابتری، ریڈ کراس کی امدادی کارروائی وغیرہ کی ترجمانی ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں بنگلادیش کی سیاسی اور سماجی پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ ساجد کہانیوں میں ماضی سے رشتہ جوڑ کر حال پر تنقید کرتے ہوئے ایک پرسکون مستقبل کے متلاشی ہیں، انہوں نے کہانیوں میں عصری تقاضوں کو بھی پوری کرنے کی سعی کی ہے۔ "دود چراغ محفل" کے نام سے احمد سعدی اور س۔م۔ ساجد کا افسانوی مجموعہ شاہکار پبلی کیشنز ڈھاکا سے ۱۹۸۳ء شائع ہوا۔ اس میں ساجد کے چھ افسانے حسب ترتیب ہیں۔ "صلیب کے سائے" "کہانی کا قتل"، "معمولی سی بات" "بوڑھی آنکھیں"، "سوندھی مٹی" "کتے"

مذکورہ افسانوں میں "کتے" کا پلاٹ انہوں نے امریکہ کے مفلوک الحال طبقے سے اخذ کیا ہے۔ اس کہانی میں بطور مسافر وہ بھی ایک کردار ہیں ــــ اس میں انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ امریکہ جیسے دولتمند ملک جو غیر ممالک میں غذا فراہم کرنے پر قادر ہے وہاں بھی ایسے افراد موجود ہیں جنہیں اچھی غذا میسر نہیں وہ کتے کی غذا پر گزر بسر کرتے ہیں۔ کہانی کا اختتام پر اثر ہے۔ بحیثیت مجموعی افسانہ نگاری میں ساجد کا فنی شعور اچھا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کا سلسلہ جاری ہے۔ بنگلادیش کا دبستان اردو ان سے ترقی کی توقع رکھتا ہے۔

ساجد کسب معاش کی مصروفیت کے پہلو بہ پہلو اردو ادبی سرگرمیوں اور صحافت سے بھی منسلک ہیں وہ یہاں شاہکار

---

[1] بنگلادیش اردو افسانے، مرتب، س۔م ساجد و ایوب حسن۔ شاہکار پبلی کیشنز ڈھاکا۔ ۱۹۹۲ء ص ۶۷

Dhaka University Institutional Repository

پبلی کیشنز کے روح رواں ہیں۔ ان کی ادارت میں مجلہ "شاہکار" اور "دستک" جنوری ۱۹۹۲ء میں اسی ادارے کے تحت شائع ہوئے

بہ طور نمونہ ان کا افسانہ "کتے" سے اختتام کے چند سطور ملاحظہ ہوں۔

"..... تب تو تم بہادر ہو ـــــ تمہارے پاس کتنے کتے ہیں؟ کتے ـــ؟ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے انتہائی مایوس کن انداز میں جواب دیا۔ "ہمارے پاس تو ایک بھی نہیں"۔

"ایک بھی نہیں ....؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"اگر ایک بھی نہیں تو یہ ڈاگ فوڈ تمہارے ہاتھ میں کیوں ہے؟"

"او میلن دِس فوڈ ـــ ہے" بچے نے پیکٹ پر ایک نگاہ ڈالی۔ اور پھر مجھ سے نگاہ ملاتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا۔

"یہ تو ہم لوگوں کا ہے۔ ہم لوگ اسے کھاتے ہیں"۔

Dhaka University Institutional Repository

جلالؔ عظیم آبادی

(۷ر فروری ۱۹۵۲ء)

خاندانی نام سید جلال الدین احمد۔ معروف جلال عظیم آبادی۔ تخلص جلالؔ۔ ولادت ۷ر فروری ۱۹۵۲ء کو عظیم آباد پٹنہ میں ہوئی۔ والد مرحوم کا نام سید معیز الدین تھا۔ بچپن میں والدین کے ہمراہ ڈھاکا آئے۔ ابتدائی تعلیم ڈھاکے میں ہوئی۔ علم حیوانات میں بی۔ ایس آنرس کشمیر یونیورسٹی سے مکمل کی۔ پیشہ تجارت ہے۔ شعر گوئی اور سفر جلالؔ کا محبوب مشغلہ ہے۔ اب تک تقریباً بارہ ملکوں کا سفر کر چکے ہیں۔ جن میں جاپان، کوریا، چین، فلپائن، سنگاپور، ملائیشیا، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ، انڈونیشیا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جلالؔ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۵ء تک جاپان میں مقیم رہے۔ قیام جاپان کے دوران ٹوکیو میں جامعہ مطالعات خارجی کے اردو طلبا، و طالبات کو (بلا معاوضہ) اردو زبان کی تعلیم دیتے رہے۔ جاپان کے ولیعہد کی "مساکو اوادا" سے شادی کے موقع پر شاہزادہ اور شاہزادی کی توصیف میں ایک قصیدہ لکھ کر شاہی محل میں بذریعہ ڈاک بھیجا۔ جو جاپان کے شاہی محل میں اردو شاعری کی رسائی کا توسط کہا جا سکتا ہے۔

جلالؔ زمانہ طالب علمی ہی سے مشق سخن کرتے آ رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے کبھی آگے ذانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ جلال کی شاعری اردو شعر و ادب کا کثیر مطالعہ اور فطری ذوق و شوق کا نتیجہ ہے۔ جلالؔ شعر گوئی میں روایت کے پابند ہیں لیکن ان کا فکری رجحان جدید ہے انہوں نے حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم سب ہی اصناف شاعری پر شعر کہنے کی سعی کی ہے۔ ان میں شعر کہنے کی صلاحیت ہے پھر بھی مشق سخن جاری ہے انہیں مزید توجہ دینی چاہیئے انہوں نے شاعری کے علاوہ ادبی مضامین اور وقتاً فوقتاً افسانے بھی سپرد قلم کئے۔ ادبی نشستوں اور مشاعروں میں بڑے شوق سے شرکت کرتے ہیں۔

جلالؔ کی ادارت میں بنگلہ دیش سے سہ ماہی رسالہ "ادب" کا اجرا مفید خدمت ہے اس رسالے کا پہلا شمارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔

جلال بنیادی طور پر سائنس کے طالبعلم ہیں۔ اردو ادب نوازی ان کا فطری ذوق و شوق ہے۔ وہ نہ بڑے شاعر ہیں

لہ میرے سوالنامے کے جواب میں جلالؔ عظیم آبادی نے اپنے بارے میں کل معلومات فراہم کیں۔ مورخہ ۲۵ر فروری ۱۹۹۹ء

Dhaka University Institutional Repository

اور نہ افسانہ نگار۔ لیکن بنگلادیش کے نامساعد حالات میں اردو شعر و ادب کی ترویج و اشاعت میں ان کی خدمات سراہنے کے قابل ہیں۔ ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ جلالؔ کے اشعار بنگلا، پاک و بھارت کے ادبی رسائل کے علاوہ جاپان سے شائع ہونیوالا پہلا اردو جریدہ "نوائے ٹوکیو" میں شائع ہوتے آرہے ہیں!

نمونۂ منقبت :

جس طرح آپ کے نانا ہیں رسولوں کے امام
ہیں حسینؑ آپ بھی اس طرح شہیدوں کے امام
جان دے ڈالی مگر دین کا سودا نہ کیا
حق پرستوں کا حسینؑ آپ پہ ہوں لاکھوں سلام

تری ہشیاریوں کے ہم بھی آخر ہو گئے قائل
مسیحائی میں خنجر تو نے دل کے درمیاں رکھدی

چارہ گر ڈھونڈ کے لاؤں تو کہاں سے لاؤں
جب مسیحا بھی میرا درد بڑھانے آئے
جن کو سمجھا تھا کہ تقلید کو آئے ہیں مری
وہ مرے نقشِ کفِ پا کو مٹانے آئے
ٹوٹی کشتی پہ نہیں چھوڑ دیا جس نے جلالؔ
بیچ منجدھار میں ہم اس کو بچانے آئے

---

۱ نوائے ٹوکیو، شمارہ ۲۵

Dhaka University Institutional Repository

شعیب عظیم

ولادت ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۱ء

کچھ ایسے بھی ذی علم اور اہل قلم ہوتے ہیں جو اپنی افتادِ طبع کے سبب خود سامنے نہیں آتے لیکن ان کے واقف حال مصنف ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں انہیں محققین کے سامنے لے آتے ہیں۔ ایسی ہی ایک ہستی کا نام شعیب عظیم ہے دبستان اردو میں ان کی سب سے بڑی پہچان ایک بے لوث خادمِ اردو اور مقبول محقق کی حیثیت سے ہے۔

شعیب عظیم تقسیم ہندوستان کے بعد اپنے اعزا کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کر کے ڈھاکا آئے اور اسے اپنا مسکن ثانی بنایا۔ انہوں نے نیو گورنمنٹ اسکول ڈھاکا سے میٹرک اور جگناتھ کالج ڈھاکا سے بی۔ایس۔سی کی سند حاصل کی سائنس کے طالب علم ہوتے ہوئے ان کی ادب نوازی قابل قدر ہے۔ اردو ادب پر ان کی معلومات وسیع ہیں خصوصاً بنگلہ دیش کے تقریباً ستو سال پر محیط اردو شعراء و ادباء کے کارنامے ان کے ازبر ہیں۔ میرا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ بنگلہ دیش کے اردو ادب کی حیثیت چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہیں فطرتاً وہ شریف النفس اور مہذب طبع کے انسان ہیں۔ ان میں نہ خود نمائی ہے اور نہ احساس برتری۔

شعیب عظیم کی کوئی تصنیف شائع نہیں ہوئی ان کے متعدد مضامین بنگلہ دیش کے علاوہ غیر ممالک کے رسائل میں بھی شائع ہوتے آئے ہیں۔ ان کا انداز بیان محققانہ ہے۔ وہ بات سمجھا کر مدلل لکھنے کی کوشش کرتے ہیں شعیب کا مطمحِ نظر تعمیر ادب ہے۔ تخریب ادب نہیں۔ تنقید کرتے ہوئے ان کا رویہ نرم رہتا ہے۔ وہ دوستانہ لہجے میں فنکار کو اس کی خامی سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان میں ادبی تحقیق و جستجو کی اچھی صلاحیت ہے۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنی کتاب "اردو ادب اور بنگالی کلچر" کو حسب ذیل الفاظ میں شعیب عظیم کے نام انتساب کر کے بنگلہ دیش میں انکی اردو خدمات کا بہترین صلہ عطا کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"انتساب

بنگلہ دیش میں ایک خادمِ اردو

شعیب عظیم کے نام!" [1]

شعیب عظیم کے چند مضامین یہ ہیں۔ "رسالۂ عقاب" (اردو مجلس جنوری ۱۹۸۸ء) "سہ ماہی دائرہ" (انتخاب ۱۹۸۸ء نومبر) "سہ ماہی خرام" (انتخاب دسمبر ۱۹۸۸ء) سہ ماہی بادبان" (قلم کار اگست ۱۹۸۷ء) وغیرہ

---

[1] "اردو ادب اور بنگالی کلچر" مغربی بنگال اردو اکاڈمی کلکتہ ۱۹۸۲ء

Dhaka University Institutional Repository

خلیل الرحمٰن زخمی

اصل نام خلیل الرحمٰن اور تخلص زخمی ہے۔ ادبی حلقے میں خلیل الرحمٰن کی پہچان شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ خلیل الرحمٰن تقسیم ہندوستان کے بعد سابق مشرقی پاکستان آئے اور کھلنا میں سکونت اختیار کی۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کا طبعی رجحان نظم گوئی کی طرف مائل ہے۔ شعر و ادب پر ان کی نگاہ گہری ہے۔ وہ روایت سے رشتہ استوار رکھ کر مستقبل کے مفید قدروں کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے اصناف سخن میں غزل اور نظم کے علاوہ سانیٹ بھی لکھے۔ ان کی نظموں میں تغزل کے رنگ نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری فیض کا اثر ہے۔ خلیل الرحمٰن کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ان کی نگارشات مختلف ادبی جرائد میں منتشر حالات میں ملتے ہیں۔ زخمی کی شاعری میں دہلی کی داخلیت اور پاکیزگی ہے۔ الفاظ سیدھا سادہ اور عام فہم لکھتے ہیں۔ طرز نگارش میں انہیں انفرادیت حاصل ہے۔

شعر و شاعری کے علاوہ خلیل الرحمٰن کو افسانہ نویسی سے بھی دلچسپی ہے۔ وقتاً فوقتاً افسانہ لکھتے رہتے ہیں۔ وہ افسانہ نگاری میں منٹو سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی مہذب طرز نگارش شاعری تک محدود رہی۔ افسانہ نگاری میں جنسی معاملات کے بیان میں کچھ عریانی آگئی ہے۔ زخمی کے افسانوں کے پلاٹ میں کوئی خاص مقصدیت نہیں انہوں نے صرف اپنے گرد و پیش کے واقعات کو افسانے کا جامہ پہنایا ہے جن کا تعلق رومان یا انقلاب بنگلادیش کی زد میں آنے والے ناگفتہ بہ حالات سے ہے۔ ان کے کردار مثالی نہیں۔ خلیل الرحمٰن کا افسانہ "مار گزیدہ" انقلاب بنگلادیش کے المناک حادثے کی زد میں آنے والی عورت کی کہانی ہے۔ جسے نہ بنگلادیش میں عزت مل رہی ہے نہ پاکستان قبول کرتا ہے۔ "درد کا سفر" ایک رومانی کہانی ہے۔ ان کی کہانی تھوڑی دیر کے لئے قاری کو فرحت بخش سکتی ہے اس میں تاثر کا ارتکاز کم ہے۔ اسلوب بیان دلنشیں ہے۔ زخمی کی کہانی آنکھوں دیکھا حال کہی جا سکتی ہے۔

نمونہ غزل :

نالۂ غم نارسا ہے یار تک
دل کو کیا سمجھائیں ہم دیدار تک

ذرہ ذرہ شعلہ پُر نور ہے
عاشق دلگیر سے دلدار تک

دیکھ زخمی سلسلۂ عشق دیکھ
آتش نمرود سے گلزار تک [1]

---

[1] روزنامہ پاسبان ڈھاکا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۷۷ء

Dhaka University Institutional Repository

باب چہارم

بنگلادیش میں اُردو صحافت ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء

کسی ملک کے ادب، سیاست اور زبان کی ترقی کے اہم ذرائع وہاں کے اخبارات، رسائل وجرائد ہوتے ہیں بنگلہ دیش میں بھی انہی تناظر کے تحت اخبارات و رسائل وجرائد کا ذخیرہ ۱۹۴۷ء سے حال تک منظر عام پر آیا۔

تقسیم ہندوستان سے قبل ہی یہاں اردو صحافت کی بنیاد حکیم حبیب الرحمٰن کا جریدہ ماہنامہ "المشرق" سے پڑ چکی تھی۔ پھر خواجہ محمد عادل کی ادارت اور حکیم حبیب الرحمٰن کی نگرانی میں ماہنامہ "جادو" اور خالد بنگالی کا ماہنامہ "اختر" شائع ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد جب یہاں اردو داں طبقے کی تعداد میں وسعت ہوئی تو اردو شعر و ادب کے دیگر شعبوں کی طرح صحافت نگاری کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ شاعر ہو یا ادیب فطرتاً کبھی خاموش نہیں رہتا چاہے ملکی و ذاتی حالات پریشان کن ہوں یا خوشگوار وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے بے چین رہتا ہے یہاں کے شعراء اور ادبا بھی ان خصوصیات سے بیگانہ نہیں رہے۔

باب اول میں یہ تذکرہ ہو چکا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے قبل ہی سے یہاں مشاعروں کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں ادبی بحث و مباحثے بھی ہوتے تھے۔ لیکن صحیح معنوں میں ادیبوں کے تخلیقی جذبے کو اس وقت تقویت ملی جب اردو روزنامے، ماہنامے و ادبی رسائل شائع ہوئے۔ دور پاکستان سے حال تک یہاں شائع ہونے والے اخبارات وجرائد کی فہرست طویل ہے۔ اس سلسلے میں اخبارات و رسالوں کی بازیابی کی بہت کوشش کی گئی لیکن تمام تر نمونے دستیاب نہ ہو سکے۔ لہٰذا جو اخبارات وجرائد میسر ہوئے ان کی فہرست پیش کی گئی ہے۔

روزنامے

نام اخبار	مقام اشاعت	ایڈیٹر	تاریخ اجراء
"پاسبان"	ڈھاکا	چیف ایڈیٹر سید مصطفےٰ حسن	قائم شدہ ۱۹۴۸ء

غالباً ۱۹۶۸ء تک جاری رہا۔ اس میں ملکی و بیرونی خبروں کے علاوہ شعری و ادبی نگارشات بھی شائع ہوتے تھے۔ اپنے زمانے

Dhaka University Institutional Repository

نامِ اخبار	مقامِ اشاعت	ایڈیٹر	تاریخِ اجراء
	کا کثیر الاشاعت روزنامہ تھا۔ "پاسبان" کے بند ہو جانے		
ہماری آواز	ڈھاکا		کے بعد ہماری آواز شائع ہوا۔
"وطن"	ڈھاکا	ایڈیٹر نسیم احمد	۱۹۶۸ء۔ اس کے مالک

سابق وزیر خارجہ (پاکستان) حمید الحق چودھری تھے۔

"انقلاب"	ڈھاکا	مدیر غلام محمد بعد میں اختر لکھنوی	اجرا؟
"ستارہ"	ڈھاکا	مدیر رفیع احمد فدائی	۱۷ مارچ ۱۹۵۲ء
"انگارہ"	ڈھاکا	مدیر یوسف رضوی	۱۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء
"سہ روزہ مشرقی پاکستان"	ڈھاکا	نگراں عندلیب شادانی	اکتوبر ۱۹۴۷ء
"میزان"	سید پور	مدیر سلمان عثمانی	۱۶ مارچ ۱۹۵۴ء

ہفت روزہ

"روداد"	ڈھاکا	مدیر اعلیٰ نوشاد نوری / سید اعظم حبیب	۱۹۶۸ء

یہ مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی کا اخبار تھا جس کے سرپرست مسیح الرحمٰن جادو میاں تھے۔ یہ سیاسی اخبار تھا[1]

"جریدہ"	ڈھاکا	مدیر اعلیٰ نوشاد نوری، سید محمود حسین	۱۹۶۹ء

عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمن کا اخبار تھا۔ تاج الدین احمد اس کے سرپرست تھے۔ اس رسالے کا اول مقصد سابق مشرقی پاکستان کے جمہوری قدروں کی نمائندگی تھی۔ اس میں بنگالی شعراء و ادباء مثلاً شوکت عثمان، لیلیٰ صمد۔ ابوالکلام شمس الدین، ظہیر ریحان، جتی پرکاش دت، کوی الحمود، سکندر ابو جعفر کے انٹرویو مع تصویروں کے شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۷۱ء میں اسے پاکستان حکومت نے بند کر دیا[2]

"قوم"	کھلنا	ناشر و مدیر ایم۔ اسلم	دسمبر ۱۹۶۹ء

۲۰ اپریل اور ۴ مئی ۱۹۷۰ء کے دو شمارے راقم السطور کے زیر نظر ہیں۔ ظاہر ہے

[1] روداد سیم آشنائی۔ ص ۲۷
[2] ایضاً

Dhaka University Institutional Repository

سنہ ۱۹۷۱ء میں یہ مسلسل شائع ہوتا رہا۔ پاکستان اور پاکستانی قوم کی فلاح و بہبود تھی۔ اس کے بیشتر مضامین اسی تناظر میں لکھے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ ملکی اور بیرونی خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔

"سب رنگ" ڈھاکا مدیر پروفیسر اظہر قادری تاریخ اجراء ؟

معاون رفیع احمد فدائی اور اشتیاق احمد

"انصاف" ڈھاکا مدیر بدر عالم ۷ جون سنہ ۱۹۶۹ء

"جترالی" ڈھاکا مدیر ایس۔ ایم پرویز

یہ فلمی ہفتہ وار ہر جمعہ کو شائع ہوتا تھا۔ سن اجراء سنہ ۱۹۶۴ء اس کے مالک حمید الحق چودھری تھے۔

پیام مشرق چاٹگام مدیر ظفر تبریزی، نگراں سید مبین تاریخ اجراء ؟

(شمارہ نمبر ۲۷) جمعہ ۳۰ اپریل ۱۹۶۵ء کا شمارہ راقم کے زیر نظر ہے ان میں عالمی خبروں کے علاوہ ادبی نگارشات بھی شامل ہیں۔ جوش ملیح آبادی، سرور بارہ بنکوی، سید ضمیر جعفری وغیرہ کا قلمی تعاون اس کے معیار کی ضامن ہے۔

"سرفراز" ڈھاکا ایڈیٹر عابدی فیض آبادی تاریخ اجراء

اس کے مالک یوسف نقوی امروہوی تھے۔ ہفتہ وار سرفراز کا شمارہ شہادت نمبر محرم سنہ ۱۳۷۲ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۵۲ء دستیاب ہے مدیر نے اداریہ میں رسالے کے رجحان کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے۔

"... سرفراز کی پالیسی تمام ہمسایہ اقوام کے دوش بدوش

Dhaka University Institutional Repository

حفاظت ملک و وطن، اسلامی کلچر اور تہذیب کا تحفظ۔ صلح آشتی
شیعی نقطۂ نظر کی وضاحت اور تحفظ حقوق شیعہ ہے۔

"المہاجر"	چاٹگام	مدیر ظفر تبریزی، رازی	اکتوبر ۱۹۶۴ء
"منشور"	ڈھاکا	مدیر وحید قیصر ندوی، قمر احمد عثمانی	۱۹۶۹ء
"ساحل"	کھلنا	؟	؟
"بصارت"	ڈھاکا	مدیر حلیم قیس نیموی	۱۹۶۸ء
"حقیقت"	ڈھاکا	مدیر یوسف رضوی	۱۹۶۸ء
"المشرق"	چاٹگام		اگست ۱۹۶۵ء
"شرارت"	ڈھاکا	مدیر ساحل رومانی	۱۹۶۹ء

پندرہ روزہ

"امین"	ڈھاکا	مدیر شمیم پھلواری، خالد عرفانی رامپوری	مئی ۱۹۴۹ء

ماہنامے

مصور ماہنامہ "دلربا"	ڈھاکا	مدیر ابوالخیرات محمد عبدالقادر	تاریخ اجراء اگست ۱۹۵۲ء

دلربا' کا بنگلہ انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا۔ دلربا' کے کل سات شمارے شائع ہوئے۔ آخری شمارہ مئی۔ جون ۱۹۵۳ء ہے۔ دلربا' اپنے عام ادبی و علمی رجحان کے علاوہ خاص طور پر سابق مشرقی پاکستان کی ادبی تاریخی و تمدنی زندگی کا ایک حد تک ترجمان ہے۔ بنگلا و اردو زبان و ادب میں باہمی الحاد و اشتراک اور مشرقی بنگال (بنگلادیش) کی زندگی کے ہر پہلو کی نمائندگی اس کا مقصد تھا۔ اس کے تمام نمبروں کا ایک نسخہ راقمہ

نوٹ: شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنی کتاب "اردو ادب اور بنگالی کلچر" میں "دلربا" کا سن اشاعت ۱۹۵۴ء لکھا ہے۔ جو غلط ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ وحشت کلکتوی، احسن احمد اشک، سلیم اللہ فہمی، شوکت سبزواری، آفتاب احمد صدیقی، اقبال عظیم وغیرہ اس کے قلمی معاونین تھے۔ یہ سابق مشرقی پاکستان کا مقبول علمی و ادبی رسالہ تھا۔

ماہنامہ "خاور" ڈھاکا مدیر عندلیب شادمانی "تاریخ اجراء اپریل ۱۹۵۲ء

"خاور" کے بارہ شمارے شائع ہوئے۔ اس ماہنامے کو سابق مشرقی پاکستان کے اہل قلم کے علاوہ باہر کے متعدد اہل قلم کا تعاون حاصل رہا۔ جس میں حامد حسین قادری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں اردو کے علاوہ بنگلا کے بھی مشہور اہل قلم مثلاً ابوالکلام شمس الدین، قاضی نذرالاسلام کے قلمی نگارشات کے تراجم شائع ہوتے تھے تاکہ بنگلا و اردو دونوں ادب میں باہمی اتحاد و اشتراک قائم رہے۔ اس طرح یہ پرچہ اپنے مخصوص آب و تاب سے تقاضائے وقت کو پورا کرتا ہوا شائع ہوا۔

" "ندیم" ڈھاکا ایڈیٹر ارشد کاکوی جون ۱۹۶۰ء

ندیم، ایک سال تک مسلسل شائع ہوتا رہا۔ اس کے جملہ معاونین قلم سابق مشرقی پاکستان کے باشندے تھے۔ ندیم کا نذرالاسلام نمبر ایک شاہکار شمارہ ہے آج تک بنگلادیش سے قاضی نذرالاسلام کے شعری و ادبی کارناموں سے منسلک اس معیار کا کوئی اردو رسالہ شائع نہیں ہوا۔ اس رسالے کی اشاعت سے سابق مشرقی پاکستان کے اہل قلم کو اپنی تخلیقات کی اشاعت میں بڑی تقویت حاصل رہی۔ یہ اپنے وقت کا ایک معیاری رسالہ تھا۔ اس کے کل شمارے ڈھاکا یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

Dhaka University Institutional Repository

ماہنامہ "کرنافلی"	چاٹگام	مدیر عمر کاوش	تاریخ اجراء ؟
" "روشن"	چاٹگام	مدیر عمر کاوش	تاریخ اجراء ؟
" "شعاع"	ڈھاکا	مدیر ایاز عصمی، عشرت کلکتوی	
" "عزم نو"	پارپتی پور	سرپرست عبدالودود مرحوم	
" "فن کار"	ڈھاکا	ایڈیٹر اختر لکھنوی	نومبر ۱۹۶۰ء
" "العالم"	پارپتی پور	نگراں وصی عالم	مئی ۱۹۴۸ء
" "شہاب"	چاٹگام	ایڈیٹر نسیم بہاری	اپریل ۱۹۵۰ء
" "مفکر"	ڈھاکا	ایڈیٹر عندلیب شادانی	اگست ۱۹۴۸ء
" "معمار"	ڈھاکا	؟	؟
" قومی ڈائجسٹ	ڈھاکا	مدیر اعجاز فاطمی	؟
" "کارواں"	ڈھاکا	مدیر ایاز عصمی	؟

دو ماہی، سہ ماہی و ششماہی رسالے

شش ماہی قلم کار	ڈھاکا	ایڈیٹر سرور بارہ بنکوی	جنوری ۱۹۶۱ء

نگراں احسن احمد اشک، ادارۂ تحریر عطاء الرحمن جمیل، صلاح الدین محمد ام عمارہ، بانو شہود اختر، انور فرہاد کے نام قابل ذکر ہیں۔

یہ رسالہ رائٹر گلڈ اردو سب ریجن مشرقی پاکستان کی سرپرستی میں شائع ہوا پاکستان کے دونوں حصوں کی ادبی و تہذیبی نمائندگی اس پرچے کا واحد مقصد تھا۔

سہ ماہی بادبان		نگراں پروفیسر ایس۔ ایم رب	اگست ۱۹۶۹ء

پروفیسر صباح الدین احمد

مدیران۔ شبیر حسن بیتقوی

Dhaka University Institutional Repository

سہیل احمد خان۔

اس کا پہلا شمارہ جون ۱۹۶۹ء تا اگست ۱۹۶۹ء میں دوسرا شمارہ اکتوبر ۱۹۶۹ء تا دسمبر ۱۹۶۹ء میں اور تیسرا شمارہ اگست ۱۹۷۰ء تا تا اکتوبر ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئے۔ "بادبان" ڈھاکا میڈیکل کالج کی بزم ادب کا سہ ماہی مجلہ ہے۔ اس پرچے کو ڈاکٹر عندلیب شادانی، اقبال عظیم، ارشد کاکوی، وحید قیصر ندوی افسر ماہ پوری وغیرہ کے قلمی تخلیقات نے معیاری درجہ کا مستحق بنایا۔

"سہ ماہی آب و گل"	ڈھاکا	مدیر سرور بارہ بنکوی	سن اجراء ۱۹۶۰ء

یہ ترقی پسند رجحان کے حامیوں کا پرچہ تھا۔ اس میں احمد الیاس، انور فرہاد، شہزاد اختر، عطاء الرحمن جمیل وغیرہ کی نگارشات شائع ہوتی رہیں۔

"جوئبار" (سالنامہ)	ڈھاکا	نگران۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ معاون: محمد منیر عالم، احمد زین الدین، عبدالجبار شبہ اردو فارسی ڈھاکا یونیورسٹی	
"سہ ماہی خرام"	چاٹگام	مدیر اصغر راہی	اکتوبر ۱۹۶۴ء

اس کے کل چار شمارے نکلے۔ یہ اپنے وقت کا کامیاب اور معیاری ادبی جریدہ تھا۔ اس میں نظمیں، غزلیں، افسانے، مقالے، فکاہیہ سب ہی اپنی نوعیت کے کامیاب تخلیقات کہے جا سکتے ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں رئیس امروہوی، احمد ندیم قاسمی، جمیل مظہری، ادیب سہیل، شہزاد منظر، مبارک مونگیری، غلام محمد اصغر راہی وغیرہ کے نام تحریر کے مستحق ہیں۔

"سہ ماہی دائرہ"	ڈھاکا	شاہد کامرانی	

اپریل ۱۹۷۰ء

اس کا کوئی دوسرا شمارہ نہیں نکلا

Dhaka University Institutional Repository

سنہ ۱۹۷۰ء میں یہ مسلسل شائع ہوتا رہا۔

قلمی معاونین وزیر آغا، نظر صدیقی، شہزا منظر، ادیب سہیل، جوگندر پال، احمد سعدی، جمیل مظہری، اقبال عظیم وغیرہ تھے۔

افادی حیثیت سے "دائرہ" ایک معیاری رسالہ تھا۔

"کہکشاں"	چاٹگام	مدیر احمد حسین	سنہ ۱۹۶۶ء

یہ بزم احباب، چاٹگام کالج کا جریدہ ہے۔ یہ رسالہ کالج کے پرنسپل اے۔ایف۔ایم مظفر احمد کی سرپرستی میں شائع ہوا۔

صدر، سعد منیر الدین (صدر شعبہ اردو چاٹگام کالج) تھے۔

نگراں محمد آصف الحق (لکچرر شعبہ اردو چاٹگام کالج) اور بذل وہاب (لکچرر شعبہ اردو چاٹگا کالج)

قلمی معاون میں عندلیب شادانی، آفتاب احمد صدیقی، اقبال عظیم، افسر ماہ پوری، نظیر صدیقی وغیرہ شامل تھے۔

"قندیل"	چاٹگام	مدیر عزیز احمد، محمد کلیم اللہ صدیقی	اجراء سنہ ۱۹۶۶ء

یہ رسالہ سٹی کالج چاٹگام سے شائع ہوا۔

"عقاب"	میرپور ڈھاکا	مدیرہ آنسہ اقبال سعید ایم۔اے	ستمبر سنہ ۱۹۷۱ء

مدیران معاون آنسہ شمس فاطمہ ایم۔اے

آنسہ نجمہ تصدق ایم اے

آنسہ عقیلہ رحمٰن انجرنگ

"عقاب" سابق مشرقی پاکستان کا آخری اُردو رسالہ جو انجمن فلاح مسلم خواتین میرپور ڈھاکہ کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ یہ دراصل ۶ ستمبر سنہ ۶۵ء میں لڑی جانے والی پاک بھارت جنگ کی یادگار ہے۔ "عقاب" کا انتساب بھی ان

Dhaka University Institutional Repository

مسلم مجاہدین کے نام کیا گیا ہے جنہوں نے وطن کی حفاظت کے لئے جانیں قربان کیں۔ اس میں شامل تمام تر مضامین و اشعار قومی جذبات سے بھرپور ہیں اس کے معیار کا اندازہ اس کے لکھنے والوں کے چند ناموں سے کر لیجئے۔

حنیف فوق، شبیر علوی، اختر پیامی، نوشاد نوری، اختر لکھنوی افسر ماہ پوری، خورشید احمد وغیرہ۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد یہاں رہ جانے والے اردو فنکاروں کے پاس قلمی تخلیق کی اشاعت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ نہ اخبار تھا نہ رسالہ اور نہ پریس تھا۔ اس افراتفری کے عالم میں انہوں نے دیوار گیر (وال پیپر) اور قلمی رسالے شائع کئے۔ ان قلمی رسالوں میں نظموں، غزلوں اور افسانوں کے علاوہ اردو فن کاروں سے متعلق اہم خبریں بھی رہتی تھیں۔ اب ان رسالوں کی فہرست ملاحظہ فرمائیے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ بنگلہ دیش میں اردو زبان کی بقا اور ارتقا کی خاطر شعبۂ صحافت میں حامیانِ اردو نے کیا کیا خدمات انجام دیں۔

"گھن چکر" دیوار گیر (وال پیپر) ایسٹرڈی ریلوے جنکشن۔ مدیر احمد بدر (مرحوم) تاریخ اجراء ۱۹۷۴ء

کاتب: بدرالدین

"پرواز" (قلمی)	خالص پور کھلنا	مدیر شمیم زمانوی	تاریخ اجراء ؟
"مشعل" (قلمی)	ڈھاکا	مدیر ڈاکٹر یوسف حسن	" " ؟
"تماشہ" (قلمی)	ڈھاکا	مدیر حقیر نوری	تاریخ اجراء ۱۹۷۵ء

کاتب: قاسم انیس

"نئی روشنی" (قلمی)	سید پور	مدیر عابد حسین
"کرن" (قلمی)	میرپور ڈھاکا	
"فکر و فن" (قلمی)	ڈھاکا	مدیر حافظ دہلوی

Dhaka University Institutional Repository

جب بنگلا دیش میں اردو بولنے والوں کی حالت اعتدال پر آئی تو باقاعدہ اردو رسائل بھی شائع ہونے لگے۔ ان ادبی رسالوں اور جریدوں کی اشاعت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

"رفتار" ڈھاکہ نگراں اصغر راہی مئی ۱۹۷۷ء

مرتب ایوب جوہر صرف سولہ صفحات

"سنگِ میل" کھلنا مدیر خلیل الرحمٰن زخمی تاریخ اجرا ۱۹۷۷ء

اداریہ نے اسے "سال نو ۱۹۷۷ء کا تحفہ" لکھا ہے

"انجمن" مدیر احمد الیاس

معاون مدیر س۔م ساجد جنوری ۱۹۷۸ء

ادبی مضامین میں (۱) بنگالی نژاد شعرائے اردو (کلیم سہسرامی)

(۲) ادب کے ارتقائی عناصر (نوشاد نوری) (۳) ادب اور زمین کا رشتہ

(احمد الیاس) تینوں مضامین اہم ہیں۔ یہ ڈائجسٹ نما رسالہ ۱۶۰ صفحات

پر مشتمل ہے

"صدائے زنداں" سید پور نگراں جلیل عشرت رسم اجرا ۱۵ فروری ۱۹۸۰ء

۲۴ صفحات پر مشتمل یہ چھوٹا سا رسالہ ادارۂ منزل ادب کی پہلی اور

کامیاب کوشش تھی۔

"صدائے جرس" سید پور مدیر حبیب سحر مئی ۱۹۸۰ء

نگراں جلیل عشرت تاریخ اجراء ۱۹۸۰ء

"محاذ" ڈھاکا مدیر ایوب جوہر

"محاذ" ۶۰ صفحات پر مشتمل اپنے وقت کا معیاری رسالہ ہے اس میں

بنگلہ دیشی فلم کاروں کے علاوہ باہر کے معتبر شاعر جوش ملیح آبادی اور

رئیس امروہوی کی نگارشات بھی شامل ہیں یہ محاذ پبلیکیشن کے زیر اہتمام شائع ہوا

Dhaka University Institutional Repository

"شاہکار" ڈھاکا مدیر س۔م ساجد جنوری ۱۹۸۱ء

یہ رسالہ تقاضائے وقت کو پورا کرتا ہے۔ صفحات ۸۸ ہیں۔

"ماحول" چاٹگام مدیر اعلیٰ اصغر راہی اجراء ستمبر ۱۹۸۱ء

مدیر یوسف راہی

حلقہ اہل قلم چاٹگام کے زیر اہتمام یہ مجلہ شائع ہوا۔ صفحات ۸۹ ہیں اس مجلے میں نوشاد نوری کا مضمون "ادب اور قومی ورثہ" احمد الیاس کا مضمون "منزل ہے کہاں تیری؟" ادبی حیثیت سے اچھے مضامین ہیں۔

"وجود" ڈھاکہ مرتب حافظ دہلوی جون ۱۹۸۴ء

یہ ڈائجسٹ نما مجلہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

نوشاد نوری کا مضمون "ادب اور سرپرستی" پروفیسر محمد عبداللہ کا مضمون "عبیداللہ عبیدی" پروفیسر ام سلمیٰ کا مضمون "خالد بنگالی" ابو سعید نورالدین کا مضمون "اقبال کا پیغام حیات" مفید ادبی مضامین ہیں۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے یہ مجلہ معیاری کہا جاسکتا ہے

"سہ ماہی انکشاف" ڈھاکہ مدیر ایوب جوہر تاریخ اجرا ۱۹۸۵ء

معاون کلیم احمد

اس کے متعدد شمارے شائع ہوئے اس میں بنگلہ دیشی اہل قلم کے علاوہ باہر کے اہل قلم وزیر آغا، قمر زیدی، ع۔س مسلم وغیرہ کے بھی تخلیقات شائع ہوتے تھے۔ آخری شمارہ جنوری ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ کہ ایوب جوہر گزر گئے۔

"اخبار البنگلادیش" ڈھاکہ مدیر ایوب جوہر (مرحوم) ۱۹۸۶ء

"انتخاب" سیدپور مدیر ذاکر عزیزی، معاون ایم۔ نعیم ۱۹۸۴ء

Dhaka University Institutional Repository

اس کے پانچ شمارے شائع ہوئے۔ چوتھا شمارہ خصوصی اشاعت ہے جو ۱۹۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ انتخاب کے پانچوں شمارے معیاری ہیں اردو ادب کے قارئین و محقق کے لئے انتخاب مفید جریدہ ہے۔

"الاخبار" ڈھاکا مدیر زین العابدین اگست ۱۹۹۰ء

۳۲ صفحات پر مشتمل اس رسالے میں اردو قارئین کے لئے مفید معلومات ہیں۔ الاخبار کا صرف ایک ہی رسالہ شائع ہوا۔

"قلم کار" سید پور مجلس ادارت: معراج الحق عارفی تاریخ اجرا اگست ۱۹۸۷ء

شمیم کاشفی، اشرف الحق بابو

قلم کار ۱۲۸ صفحات پر مشتمل معیاری مجلہ ہے۔ اختر حسین رائے پوری کا مضمون "مولوی عبدالحق کی شخصیت کے بعض پہلو" اور مجلہ کے سرورق پر مولوی عبدالحق کی تصویر اس کے ادبی رجحان پر روشنی ڈالتی ہے۔

"مجلس" ڈھاکہ مدیر جمال مشرقی جنوری ۱۹۸۸ء

دو سو صفحات پر مشتمل یہ مجلہ بنگلادیش میں اردو زبان و ادب اور ثقافت کا ضامن ہے۔ ڈاکٹر کلیم سہسرامی کا مضمون "بہادر شاہ ظفر کالمیہ" ڈاکٹر ابو سعید نورالدین کا مضمون "ڈاکٹر شہیداللہ" ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کا مضمون "مثنوی جہاں شاہ و جہاں بانو" شعیب کا مضمون "سالق مشرقی پاکستان کا آخری رسالہ عقاب" ایوب جوہر کا بنگلادیش میں ادبی انجمنوں کا سفر" وغیرہ اچھے تحقیقی مضامین ہیں۔

"دین و دانش" ڈھاکہ مدیر اعلیٰ محمد افسر ۱۴۰۳/۱۹۸۲ء

مدیر اختر آلوی... دینی و علمی جریدہ۔ اس کے تمام مضامین و اشعار

Dhaka University Institutional Repository

تعلیم دین و مداح خدا و رسول ﷺ سے منسلک ہیں۔ زیر اہتمام بنگلہ دیش علمی لائبریری اس کے تین شمارے شائع ہوئے۔

علم و دانش ڈھاکا مدیر: اختر آنولوی تاریخ اجرا درج نہیں ہے

زیر اہتمام بنگلہ دیش علمی لائبریری، ایک شمارہ شائع ہوا۔ یہ ڈائجسٹ نما دینی و علمی رسالہ ہے۔

"روشنی" ڈھاکا مرتبہ محمد افسر

معاون حصیر لوزی ۱۴۰۰ھ / ۱۹۷۹ء

دینی، اخلاقی و اصلاحی مضامین پر مشتمل ۸۰ صفحات کا ڈائجسٹ نما رسالہ ہے۔

"دستک" ڈھاکا مدیر س۔م ساجد جنوری ۱۹۹۲ء

۸۰ صفحات پر مشتمل ادارہ شاہکار پبلی کیشن کا مفید تحفہ ہے۔

عطاء الرحمٰن جمیل کا مضمون "علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ" (شہزاد منظر)

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کا مضمون "چھوٹا خدا" (ڈاکٹر مغنی لیب شادانی)

شعیب عظیم کا مضمون "دبستان مشرق" اہم مضامین ہیں۔ "دستک" کا صرف ایک ہی شمارہ شائع ہوا۔

سہ ماہی ادب" ڈھاکا مدیر اعلیٰ جلال عظیم آبادی۔ مدیر صابر علی صابر اکتوبر ۱۹۹۹ء

اس کے تین شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ ادبی رسالہ ہے۔ اس کی اشاعت کا اول مقصد بنگلادیش میں اردو زبان و ادب کی بقا اور فروغ ہے۔

چوتھا شمارہ زیر ترتیب ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

باب پنجم

بنگلادیش کے اُردو ادب پر تبصرہ

ادب سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات اور تغیرات کا عکس ہوتا ہے۔ اردو کے تین گزرے ہوئے اہم دبستان دکن، دہلی اور لکھنؤ کی بنیاد ان رجحانات و تغیرات کے تحت پڑی تھیں۔ بنگلادیش کا دبستان اردو بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ مذکورہ بالا مرکزوں سے دور رہ کر بنگلادیش کا دبستان اردو اپنی امتیازی خصوصیات کے ساتھ پنپتا رہا ہے۔ بنگلادیش کے اردو شعر و ادب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ جوں جوں زمانہ بدلا ہے زندگی نے کروٹ لی ہے اور احساسات و تجربات میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ بنگلادیش کے اردو فنکاروں نے بھی اپنی تخلیقات میں ان کی ترجمانی کی ہے۔ یہاں کے اردو اہل قلم بھی بنگلا زبان و ادب کے فنکاروں سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے اپنے ادب کا رشتہ یہاں کی زمین سے جوڑنے کی کوشش کی۔ پچھلے ابواب میں اردو زبان و ادب سے لے کر زمانۂ حال تک تقریباً پچاس سال (۱۹۴۷ء - ۱۹۹۰ء) کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس سے بنگلادیشی فنکاروں کا مختلف النوع شعری و ادبی کارناموں کی تفصیلات کا ایک بڑا ذخیرہ سامنے آگیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں بنگلادیش کی اردو نگارشات کی نہج اور رفتار کیا تھی اور ادبی نقطۂ نظر سے برصغیر میں یہاں کی اردو زبان و ادب کو کیا درجہ حاصل ہے۔ بنگلادیش کے اردو شعر و ادب پر یہاں کے ماحول اور مقامی رنگ کا کہاں تک اثر پڑا ہے۔ آئندہ صفحات میں اسے اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

شاعری :-

طپشؔ دہلوی سے لے کر نساخؔ تک کے زمانے میں بنگلادیش کی اردو شاعری دہلی کی روایتی شاعری کی پابند رہی جس میں تصوف، خلوص اور قنوطیت کے علاوہ دہلی کی رنگِ داخلیت کی ہوبہو ترجمانی ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

مت کہیے قیس سا نہیں ہونے کا دوسرا
اب بھی وہی زمیں ہے وہی آسمان ہے (طپشؔ)

Dhaka University Institutional Repository

ساقی شفق کو دیکھ کے کہتا ہے ناز سے
صہبائے سُرخ شیشۂ چرخِ کہن میں ہے

ضیغم

نہ دیا دل اسے جو ظلم پہ مائل نہ ہوا
اس کو چاہا نہ کبھی مجھ سے جو غافل نہ ہوا

(ناسخ)

نائب ناظمان کے زوال کے بعد جب کشمیری خواجوں کو ڈھاکے کی نوابی ملی تو ان کی سرپرستی میں یہاں اردو شعر و ادب کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ انگریز حکومت کی پشت پناہی اور ان کی دولت کی فراوانی نے انہیں عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا۔ اس لئے ان کا ذہنی رجحان رفتہ رفتہ لکھنؤ کی طرف مبذول ہو گیا۔ ناسخ کے بعد سے لے کر شرف الحسینی تک یہاں کے تمام شعراء میں کم و بیش دبستانِ لکھنؤ کے خارجی اثرات نمایاں ہیں۔ اس دور میں غزلگوئی کے پہلو بہ پہلو دوسرے اصنافِ سخن کا بھی اضافہ ہوا۔ خواجہ احسان اللہ شاہین کے گیت، شرف الحسینی کے قصیدے اس نوع کی یادگار ہیں۔ داغ دہلوی کے شاگرد اور غالب کے مقلد ہوتے ہوئے شرف الحسینی لکھنؤ کی خارجیت سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ اس رنگ سے متاثر کئی شعراء کے اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں:

رکھتی ہے لگا منہ ترے رخسار سے ہر دم
رشک آئے مجھے کیوں نہ ترے زلفِ دوتا پر

شاہین

مسّی مالیدہ لب اور پان کا لاکھا اس پر
لالہ دکھلانے لگا نیلوفرستاں اس پر

خواجہ افضل

جو ناگن اس کی قامت ہے تو کالے سانپ گیسو ہیں
مگر ہے مار شامت کی طبیعت اس پہ مائل ہے

(شرف الحسینی)

Dhaka University Institutional Repository

بہر حال طبیش سے شرف تک کے زمانے میں بنگلادیش کی دبستان دہلی اور لکھنؤ کی پابند رہی۔ بنگلادیش کی شاعری میں مقامی خصوصیات کی عکاسی کا آغاز ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا۔ تقسیم ہندوستان کے بعد شعراء و ادباء کثیر تعداد میں بنگلادیش میں داخل ہوئے۔ تو ان میں ایک حصہ ایسے شاعروں کا بھی تھا جو سجاد ظہیر اور ان کے ہم خیال ادباء کے ترقی پسند خیالات کے حامی تھے۔ جنہوں نے سابق مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلادیش) کی زندگی کو اپنے ادب کا موضوع بنایا۔ اور یہاں کی عوامی تحریکوں کو سمجھنے اور انہیں اپنی نثری و شعری تخلیقات میں پرونے کی کوششیں کیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ڈھاکے کے پرانے شعراء میں شرف الحسینی، مرزا فقیر محمد، خواجہ محمد اسمٰعیل ذبیح، خواجہ محمد عادل اور ظہور المبارکی وغیرہ روایتی طرز کے معتبر شاعر تھے۔ غیر بنگالی شعراء و ادباء میں عندلیب شادانی، ساحر بنگالے، رضا علی وحشت حکیم ناطق لکھنوی، آصف بنارسی، تمنا عمادی، واصف بنارسی، کیفی چڑیا کوٹی اور سلیم اللہ فہمی کو ماہر فن شعر و ادب شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں سے شاد آدانی اور حکیم ناطق کو چھوڑ کر دیگر تمام شعراء کلاسیکی شاعری کے پابند تھے۔ عندلیب شادانی نے رومانی اور رسمی شاعری سے الگ رہ کر کچھ جدت پیدا کی۔ وہ عشق مجازی کے پرستار تھے۔ ان کی شاعری کو سراپا رنگین افسانہ کہا جا سکتا ہے جس کی بنیاد حقیقت پسندی پر ہے۔ اس زمانہ میں یہاں حکیم ناطق، وحشت کلکتوی اور آصف بنارسی کے تلامذہ کی ایک بساط بچھی ہوئی تھی۔ ان کے دم سے سابق مشرقی پاکستان میں اردو کی صحت مند شعری روایت کارفرما رہی۔ حکیم ناطق لکھنوی نے لکھنوی غیر مہذبانہ اثرات سے اپنی شاعری کا دامن بچایا اور غزل کی بنیاد صداقت و پاکیزگی پر رکھی۔

مثال کے طور پر ان استاد شعراء کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

ہے مجھے میری محبت کا جواب
تارے نظر آتے ہیں

(عندلیب شادانی)

زمانے کا
اعبث

(وحشت)

Dhaka University Institutional Repository

وہ نہ سمجھیں گے ترے غم کی حقیقت آصفؔ
وقت جبتک نہ حقیقت کو فسانہ کردے

آصفؔ بنارسی

مذکورہ بالا استاد شعراء کے علاوہ غزل گوئی کے میدان میں جنہوں نے روایت سے رشتہ جوڑ کر تفکر میں جدت سے کام سے لیا ہے ان میں تمنّا عمادی، حسین زہرا، امیر الاسلام شرقی، شمس شیدائی، رحمت اللہ شہاب، قمر صدیقی، فضلی احمد فضلی، ماہر فریدی، دلیل ناطق، کرشمہ ناز شیرینی، رمز کشمیری، گلنار آفریں، افسر ماہ پوری، اقبال عظیم، سرور بارہ بنکوی ارشد کاکوی، نظیر صدیقی، حافظ دہلوی، فطرت واسطی، اخترؔ لکھنوی خوشتر نگرولی کامل کلکوٹی وغیرہ رواں دواں رہے۔ ان شعراء میں فطرت واسطی کو چھوڑ کر بیشتر شعراء نے سابق مشرقی پاکستان میں شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات کو کم و بیش اپنانے کی کوشش کی لیکن فطرت واسطی نے غزل کو غم جاناں تک ہی محدود رکھا۔ ان کا انداز بیان نرا رومانی تھا۔ جن کا تعلق نسوانی حسن سے ہے۔ شیاما ان کے محبوب کا فرضی نام تھا۔ البتہ نظم گوئی میں فطرت جدید طرز پر مائل رہے۔

بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

مجھ سے قریب ہو کر پھر بھی دور شیاما
میرا غرور شیاما، دل کا سرور شیاما

(فطرت واسطی)

زندگی کا زندگانی پر نہ رنگ آیا تو کیا
اتنے جینے پر بھی جینے کا نہ ڈھنگ آیا تو کیا

تمنّا عمادی

کھاتے تھے قسم جن کے کردار و عمل کے ہم
شامل صفِ اعدا میں وہ ہم نفساں بھی ہیں

اخترؔ لکھنوی

نہ کہئے تند مزاج اس کو بلکہ یوں کہئے
نیاز مند قمرؔ اس کا ناز اٹھا نہ سکا

قمر صدیقی

Dhaka University Institutional Repository

وہ جانتے نہیں شاید روش زمانے کی
چمن میں فکر جو کرتے ہیں آشیانے کی
بدل رہے ہیں وہ بیگانگی جو اپنے سے
بدل گئی ہے بہت اب ہوا زمانے کی

امیر الاسلام شرقی

عہد حاضر کی ہر اک بات ہمیں دل سے قبول
صرف توہین روایت نہیں ہوگی ہم سے
جھوٹ بھی بولیں، صداقت کے پیمبر بھی بنیں
ہم کو بخشو! یہ سیاست نہیں ہوگی ہم سے

اقبال عظیم

ترے کرم کے فسانے بہت سُنے یارب
ہماری کوئی دُعا تو نے بھی سُنی ہوتی
اہلِ کمال کو نظیرؔ، اہلِ جہاں نے کیا دیا
اہلِ جہاں کو کیا نہیں، اہل کمال دے گئے

(نظیر صدیقی)

فکر و نظر کی منزلیں جن سے نہ طے ہوئیں کبھی
دیر و حرم میں جا کے وہ ہو گئے صاحبِ مقام

(ذکی آذر)

آدمی اپنے میں پیدا کوئی جوہر کر لے
پھر تو وہ سارے زمانے کو مسخّر کر لے

(رمز کشمیری)

Dhaka University Institutional Repository

برہم نگاہِ گردشِ دوراں ہے آج کل
ہر چشمِ مست دیدۂ گریاں ہے آج کل

(حسن زہرا)

مظلوم کی آہوں کا اثر ہو کے رہے گا
یہ نظمِ جہاں زیر و زبر ہو کے رہے گا
اسباب وہی پھر ہوں تو اسلام کا غلبہ
اک بار ہوا ، بار دگر ہو کے رہے گا

(فضلی)

صاف گوئی تلخ گوئی ہے زمانے میں دلیل
حق پرستوں کے لئے دار و رسن انعام ہے

دلیل ناطقی

کھینچ لائیں پھر انہیں گزرے ہوئے لمحات میں
آؤ کر لیں منضبط بھولا ہوا افسانہ ہم

سرونازِ شیریں

کون سہہ سکتا حیاتِ جاوداں کی سختیاں
زندگی پر موت کا کتنا بڑا احسان ہے

ظہور المبارکی

اہلِ ہنر کو دہر میں کامل ملا نہ کچھ
دادِ ہنر ملی ، نہ خراجِ ہنر ملا

کامل کلکتوی

Dhaka University Institutional Repository

بیزار نہ ہو کیوں شیدائی اس طرزِ وفائے دنیا سے
ہر دل میں یہاں ہے رشک و حسد کیا دوست ہیں اور کیا دشمن ہیں
(شمس شیدائی)

وہ مکاں چاہیئے جس کو اپنا کہیں، فرض اپنا سمجھ کر حفاظت کریں
جس کے مالک ہو تم اور ہم ہوں مکیں، اس مکاں میں سکونت نہیں چاہیئے (حافظ دہلوی)

آتشیں مادّوں کو آیا تاؤ — خفتہ شعلوں کا جاگ اٹھا ہے الاؤ
ناخدا ہو شیار طوفاں سے — پھنس رہی ہے بھنور میں تیری ناؤ
(خوشتر منگرولی)

بنگلادیش کے اردو ادب میں خالص بنگلادیشی خصوصیات کی عکاسی کی تائید میں ڈاکٹر حنیف فوق کا مضمون "مشرقی پاکستان میں اردو ادب اور اردو ادیبوں کے مسائل" سے اقتباس ذیل نقل کرتی ہوں:

"مشرقی پاکستان میں اردو ادیبوں کو سب سے پہلے جس مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا وہ ماحول کی اجنبیت تھی۔ ادب ہمیشہ زمین ہی سے نشو و نما کرتا رہا ہے لیکن یہاں سبزہ کی وہ فراوانی تھی کہ زمین نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اردو کے ادیبوں کے ذہن میں سوندھی مٹی کی جو خوشبو رچی بسی ہوئی تھی وہ یہاں نایاب تھی پنگھٹ اور جوپال کی داستانوں کی بجائے یہاں ماجھیوں کے گیت اور ماہی گیروں کی کہانیاں تھیں۔ لُو کے تھپیڑوں کی جگہ بھیگی ہوائیں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ انسانی اقدار کا احترام تو ہر جگہ یکساں رہا ہے۔ لیکن ان کی حرمت و پاکیزگی کے مظاہر بدلتے رہتے ہیں۔ یہ فرق تہذیب و تمدن کے مختلف گوشوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس بدلے ہوئے ماحول کو سازگار بنانے اور اس کے لئے خود خوشگوار بننے کی ذمہ داری اردو ادیبوں کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی ذہنی جڑیں اس سرزمین میں پیوست نہیں تھیں۔ اس لئے ایک زمانے تک وہ خلاؤں میں بھٹکتے رہے۔ یہ راہ گم کردہ اپنے آپ کو اس بھری محفل میں تنہا محسوس کرتے رہے۔ لیکن اردو کے ادیبوں کا ایک باشعور حصہ ضرور ایسا تھا جنہوں نے ابتدا ہی سے حالات کے تقاضوں کو سمجھا تھا۔ مشرقی پاکستان کی ہواؤں میں جو نغمے بسے ہوئے تھے ان ادیبوں نے انہیں اپنے شعور کا جزو بنانے کی

Dhaka University Institutional Repository

کوشش کی۔ اس طلسماتی سرزمین کے جلال و جمال کو انہوں نے اپنی فکر کے ذریعہ اسیر کرنا چاہا۔"

فوق اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں۔

"مشرقی پاکستان کے اردو ادب کے سرسری مطالعہ سے بہرحال یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شعر و نغمہ کی اس سرزمین میں اردو ادب کا موجودہ دور ایک نئے ادبی مستقبل کی بشارت دے رہا ہے۔ اردو کے لکھنے والوں میں یہ ہماہمی، یہ سرگرمی اور تازہ کاری ایک جہانِ تازہ تخلیق کر رہی ہے یہاں کا اردو ادب یوں تو پورے اردو ادب کی تہذیبی روایات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ لیکن مشرقی پاکستان کی لہراتی ہوئی ندیوں، سدا بہار ہریالوں، دھان کی لہلہائی ہوئی کھیتیوں اور دریاؤں کو چیرتی ہوئی کشتیوں کی مقامی خصوصیات بھی اپنے اندر جذب کر رہا ہے۔ اس کا واسطہ صرف فطرت کی رنگینی ہی سے نہیں بلکہ یہاں کے باشندوں کی جدوجہد سے بھی ہے اس لئے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جمہوری رجحانات مشرقی پاکستان کے اردو ادب میں زیادہ نمایاں و ممتاز حیثیت رکھتے ہیں[1]۔"

بہرحال یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مہاجر شعراء و ادباء میں باشعور و حساس فنکار یہاں کے ملکی مسائل اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنے میں کامیاب ہو گئے۔ بنگلادیش کے دریاؤں کا ترنم، بھٹیالی گانے ہوئے ملاّح دریاؤں اور تالابوں کے گھاٹ پر پانی بھرنے والی سانولی دوشیزاؤں کا جمگھٹ، سرسبز لہلہاتے ہوئے دھان اور پاٹ کے کھیت، ناریل، سُپاری اور کیلوں کے درختوں سے ڈھکی ہوئی جھونپڑیاں، سیلاب اور طوفان سے جرأت مندانہ مقابلہ کرتے ہوئے مفلوک الحال کسان اور ان کی پُرخلوص محبت نے ان کے دل کو متاثر کیا تو ان فنکاروں کے لئے سابق مشرقی پاکستان (بنگلادیش) کی دکھ سکھ کی کہانیاں ان کی اپنی کہانی محسوس ہونے لگیں اور وہ ان غم و مسرت کی باتوں کو اپنے الفاظ میں پرونے لگے اس طرح یہ مشاہیر ادب بنگلادیش کے پوٹی کوبی (دیہی شاعر) جسیم الدین اور افسانہ نگار شوکت عثمان کے ہمخیال ہو گئے۔ تفکر اور موضوعات کے لحاظ سے بنگلا و اردو کی نگارشات میں ہم آہنگی پیدا ہونے لگی۔ یہ مماثلت و ہم آہنگی اردو و بنگلا دونوں ادب میں فائدہ مند ثابت ہوئی اور سابق مشرقی پاکستان (بنگلادیش) کا قومی ورثہ کہلانے کی مستحق ٹھہری۔

---

[1] سنبت قدریں ص ۱۰۷ ۔ بھٹیالی ماخوذ ہے 'بھاٹ' سے جس کے معنی اتار کے ہیں چونکہ ماجھی اس گانے کو اسی وقت گاتا ہے جب کشتی اپنے آپ بہاؤ کے رخ پر رواں ہوتی ہے۔ اسی لئے اس گانے کا نام بھٹیالی پڑ گیا۔

Dhaka University Institutional Repository

بنگلادیش کے اردو شعروادب کی خصوصیات میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان فنکاروں نے سابق مشرقی پاکستان کی زندگی کے مسائل و مقامی رنگ کی عکاسی کرتے ہوئے موضوعات کے ساتھ تشبیہات، استعارات و بیشتر بنگلا الفاظ بھی بنگلا ادب سے اردو میں براہ راست اخذ کئے۔ اردو شعروادب میں مستعمل چند بنگلا الفاظ بطور نمونہ ملاحظہ ہوں :

نوکا (کشتی) شیتل پاٹی (بنگال کی بنی ہوئی اعلیٰ قسم کی چٹائی) کچری پنا (آبی پھول کا پودا جو بنگال میں ہوتا ہے) ڈاب (کچا ناریل) سپاری (چھالیہ) پاٹ (پٹ سن) پاٹ کھوڑی (پٹ سن کا سوکھا ہوا تنا جس سے ریشہ نکالا جا چکا ہو) بھات (پکا ہوا چاول) موڑی (مکئی کی طرح ریت میں بھُنا ہوا چاول) ماجھی (ملاّح) بھاٹیالی (ملاحوں کے گیت) اس کے علاوہ بنگلادیش کے مخصوص پھولوں کے بنگلا نام بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ مثلاً رجنی گندھا، کرشنا چوڑا، شاپلہ، گندھاراج وغیرہ۔ چڑیوں کے بنگلا نام بُوٹ کتھا کو، گھُوگھُو، دئیل وغیرہ بھی بنگلادیشی اردو ادب میں ملتے ہیں :

بحیثیت مجموعی جن اردو مشاہیر ادب نے مذکورہ خصوصیات کو نثری و شعری جامہ پہنانے کی کوشش کی ان شعراء میں احسن احمد اشک، ڈاکٹر حنیف فوق، نوشاد نوری، افسر ماہ پوری، صلاح الدین محمد، ادیب سہیل، عطاء الرحمٰن جمیل، انور فرہاد، اختر بیابانی، اختر لکھنوی، احمد الیاس، خورشید احمد وغیرہ اور افسانہ نگاروں میں اُم عمارہ، بانو اختر شہود، غلام محمد، زین العابدین، شہزاد منظر، احمد زین الدین، احمد سعدی، مسعود شہریار، شہزاد اختر کے علاوہ ایوب جوہر، قیام بنگلادیش کے بعد ذاکر عزیزی، قاضی محی الدین، شام بارک پوری، س۔م۔ ساجد کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا گروہ کے بیشتر شعراء نے اپنے خیالات کی عکاسی کے لئے غزل کے بجائے نظم گوئی کو ترجیح دی اور اس فن میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ بنگلادیش کی ترقی پسند اور صحت مند شعروادب کی بنیاد انہی اکابر شعروادب کے ہاتھوں پڑی۔ ان میں سے بیشتر افراد ۱۹۷۱ء کے بعد یہاں کے نامساعد حالات سے مجبور ہو کر پاکستان ہجرت کر گئے۔ وہاں بھی ان کی تخلیقی تخلیقات بنگلادیش کی ثقافت، مسائل و قدرتی مناظر کی غمازی سے یکسر خالی نہیں۔ ان کی نگارشات میں ۱۹۴۷ء کے بعد پہلی ہجرت اور ۱۹۷۱ء کے بعد دوسری ہجرت کے المیہ کی عکاسی اور سابق مشرقی پاکستان میں گزاری جانے والی بھرپور زندگی کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ ان شعراء و ادباء کی تخلیقات میں بوڑھی گنگا، پدما و جمنا کی لہریں

Dhaka University Institutional Repository

اب بھی موجزن ہیں اور وہ اسے بڑے لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ گویا ان کے ادب پاروں کی جڑیں ابتک بنگلادیش کی نمناک مٹی میں پیوستہ رہ گئی ہیں۔ ان میں سے جن شعراء و ادباء نے بنگلادیش کی سرزمین میں سکونت اختیار کی ان میں احسن احمد اشکؔ، نوشاد نوری، عطاء الرحمن جمیلؔ، احمد الیاس، احمد سعدی، زین العابدین، ذاکر عزیزی، ایوب جوہر، شام بارک پوری کے نام نمایاں ہیں۔ ان اہل قلم میں بیشتر فنکار نے شعر و ادب کا رشتہ اپنی ذات اور ماحول سے جوڑنے کے ساتھ آس پاس کے ملکوں سے بھی استوار رکھا ہے۔

اب میں چند ماہر فن شعراء کی شاعرانہ خصوصیات کا تنقیدی جائزہ لینا مناسب سمجھتی ہوں۔ نوشاد نوری ن۔م۔ راشد اور میراں جی سے متاثر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ہندی الفاظ فنکارانہ صلاحیت استعمال کئے ہیں۔ ان کی نظموں میں غنائیت ہے۔ نوشاد کے یہاں فکر، احساس اور جذبہ، یہ تینوں عنصر کارفرما ہیں۔ ہندی، اردو، فارسی الفاظ کو سلیقے سے شعر کی لہروں میں پرونا نوشاد کی غیر معمولی کاریگری ہے۔ انسانی زندگی کی تنقید کرنے میں شاعرانہ شعور اور ادبی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ترقی پسند خیالات اور جدید نظم نگاری کی آمیزش نے نوشاد کو ایک انفرادی درجہ عطا کیا اور اسی ہنر سے وہ اردو شعر و ادب میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔

احسن احمد اشکؔ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ کسی شاعر سے متاثر نہیں[1] لیکن تحقیق کی رو سے یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ وہ بالواسطہ قاضی نذرالاسلام کی نظموں سے متاثر تھے۔ اشکؔ کی نظموں میں قاضی نذرالاسلام کا طنزیہ و باغیانہ رنگ نمایاں ہیں۔

شاعرانہ تفکر میں بنگلادیش کی سرزمین کا حوالہ اور مقامی رنگ کو اگر اوّل درجہ دیا جائے تو احسن احمد اشکؔ اور نوشاد نوری پہلی صف میں آتے ہیں لیکن شاعری بحیثیت نثر ڈاکٹر حنیف فوق کا انداز بیان فنکارانہ ہے۔ انہوں نے یہاں کی عوامی قدروں کی حمایت کی ہے۔ اسلوب بیان میں سنجیدگی کے ساتھ روانی، حنیف فوق، عطاء الرحمن جمیلؔ اور اخترؔ پیامی کے اشعار میں نمایاں ہیں۔ عطاء الرحمن جمیلؔ نے انسانی قدروں کے پہلو بہ پہلو بنگلادیش کے قدرتی مناظر کی بھی عکاسی کی ہے۔ اخترؔ پیامی روایت اور ترقی پسندی کے سنگم پر کھڑے ہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھی شعری جامہ پہنایا اور شاعری کا رشتہ تاریخ سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس سلسلے میں ان کی معرکۃ الآرا ڈرامائی

---

[1] کنیز بتول، "احسن احمد اشکؔ سے ایک گفتگو"

Dhaka University Institutional Repository

نظم "تاریخ" قابلِ داد ہے۔

انور فرہاد اور احمد الیاس فیض سے متاثر ہیں۔ احمد الیاس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ درد میں شدت نہیں لذت محسوس کرتے ہیں۔ یہ ان کا صحت مند رجائی پہلو کہا جا سکتا ہے۔

صلاح الدین محمد، ادیب سہیل، اظہر قادری وغیرہ کی شاعری پر میراں جی اور فیض کا عکس نمایاں ہے۔ ان شعراء نے

انسانی زندگی کے مختلف النوع مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ اس ضمن میں صلاح الدین محمد کی نظم سہرا بنگال" ایک مفید نظم کہی جا سکتی ہے۔ جس میں انہوں نے سابق مشرقی پاکستان کی اقتصادی بدحالی کی عمّازی کی ہے۔ ادیب سہیل نے نظم و غزل دونوں صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن نظم میں ان کے جوہر کو کھل کے عیاں ہونے کا موقع ملا۔ ان کی شاعری قیام بنگلادیش سے قبل اور بعد یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک رونما ہونے والے واقعات و سانحات کے گرد رواں دواں ہیں۔ ان کی طویل نظم "سمندر اور قطرے" کا زمانہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک ہے۔ یہ نظم سیاسی اور تاریخی حیثیت سے ایک کامیاب نظم کہی جا سکتی ہے۔ ان کی نظمیں آزاد شاعری کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔

دبستان بنگلہ دیش کی شاعری میں قدرتی مناظر اور مقامی رنگ و آہنگ کے لحاظ سے حنیف فوق کی نظم "دھانوں کی ولی میں" عطاء الرحمٰن جمیل کی نظم "کاکس بازار سے چاٹگام تک" احسن احمد اشک کی "جاگتے جزیرے" نوشاد نوری کی نظم "باہر بھیگے پانی" اختر یاسمی کی نظم "گنگ و جمن" اختر فرہاد کی نظم "مانجھی" وغیرہ بنگلادیش کا قومی ورثہ ہے۔

سابق مشرقی پاکستان کے دور میں یہاں بود و باش کرنے والے مہاجر شعراء میں جمیل عظیم آبادی کا کسی گروہ سے تعلق نہیں۔ ان کا رنگ انوکھا ہے۔ وہ روایت اور جدیدیت کے سنگم پر کھڑے ہیں نظموں میں اقبال جوش، نظیر اکبرآبادی سے متاثر ہیں اور دوہے اور گیت کے طرز تحریر میں قدیم ہندی سے اکتساب کیا ہے۔ لیکن نفیس شاعری کو انہوں نے حمد، نعت، اخلاقی، فکری، رومانی تا صحافتی مضامین سے وابستہ رکھا۔ جمیل عظیم آبادی کی شاعری ان کی تجربات و مشاہدات کی ترجمان ہیں ـــ انہوں نے قومی جذبات پر مبنی نظمیں بھی لکھی ہیں اور سامراجی جارحیت و بین الاقوامی صورتحال کی مذمت بھی کی ہے۔ ان کی نظم "بیروت جل رہا ہے" اس ضمن کی مفید کڑی ہے۔ غزل، نظم، دوہوں اور گیتوں پر مشتمل ان کے پانچ مجموعے شائع ہوئے جن میں "گیان درپن" ان کے دوہے اور گیت کا مجموعہ ہے۔ اردو شعری ادب کے موجودہ دور میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے۔ بہ قول جمیل عظیم آبادی

Dhaka University Institutional Repository

دوہے کے ہندی الفاظ انہوں نے ہندی دوست احباب سے سیکھنے کے علاوہ قیام مشرقی پاکستان (بنگلادیش کے دوران انہوں نے بہت سارے سنسکرت الفاظ اپنے بنگالی دوستوں سے سیکھے جو بنگلا میں مستعمل ہیں[1]۔ جمیل کے دوہوں اور گیتوں کا مجموعہ "گیان درپن" اردو شعروادب کے ذخیرہ میں قیمتی اضافہ ہے۔

جمیل عظیم آبادی کے دوہے اور نظم بہ طور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں :

تھوڑا تھوڑا پڑھتے رہنا اللہ کا فرمان
جیون بھید چھپے ہیں جس میں اس کو کہیں قرآن
سب سے بڑے ہیں پاک محمدؐ نبیوں میں ور دان
ان کی اُمت سب سے اُتّم، اللہ کا فرمان

یہ اپنی نوعیت کی اچھی کتاب کہی جائے گی۔ گیان درپن میں دوہوں اور گیتوں کی زبان ہندی ہے۔ "آب وسراب" میں ان کی نظم "آدمی" نظیر اکبر آبادی کے "آدمی نامہ" کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ "مزدور" میں جوش ملیح آبادی کی چھاپ ہے۔

مثال : خونخوار آدمی، کہیں غم خوار آدمی
دیندار آدمی کہ گنہ گار آدمی
آدم کے دونوں بیٹوں کی صورت جہان میں
ہے آدمی سے برسرِ پیکار آدمی

(جمیل عظیم آبادی)

دوہے :

تھوڑا تھوڑا پڑھتے رہنا اللہ کا فرمان
جیون بھید چھپے ہیں جس میں اس کو کہیں قرآن
سب سے بڑے ہیں پاک محمدؐ نبیوں میں ور دان
ان کی اُمت سب سے اُتّم، اللہ کا فرمان

(جمیل عظیم آبادی)

۱۔ جمیل عظیم آبادی "عرض حال" گیان درپن (گیت، دوہے) ایجوکیشن پریس، کراچی۔ ۱۹۸۵ء

Dhaka University Institutional Repository

چند مثالیں دیگر شعراء کے کلام سے ملاحظہ فرمائیں۔ جن میں بنگلا دیش کے مقامی رنگ نمایاں ہیں۔

صف بہ صف ہرے پودے
لہلہاتے دھانوں کے
سر اٹھائے پانی میں
حوصلے کسانوں کے
آسرے تلاطم میں
ڈولتے مچانوں کے

(احسن احمد اشک)

چترکلا سے جس کے دل تک پہنچی بنگلا رانی
لوک کتھا سے جس نے جانی اس کی رام کہانی
جس نے لانچ کے چھت سے دیکھا ندی نو کے گھاٹ
چھپتے دن کی دھندلاہٹ میں ڈوبا سپاری پاٹ۔

(نوشاد نوری)

گو موجوں کا ہے ریلا
اور کشتی ایک اکیلی
پر مانجھی ہے البیلا
ہر دکھ کو ہنس کر سہنا
مانجھی کی شان یہی ہے
موجوں سے لڑتے رہنا

(انور فرہاد)

Dhaka University Institutional Repository

نوکا، چاند، ندی کی لہریں اور بھٹیالی راگ
اگنی بان چلاتی ہے یہ شیتل شیتل آگ

پدما تیرے کنارے دیکھا میگھ کا اصلی روپ
تیرے ہی آغوش میں جانا کیا ہے ملار کی آگ[1]

(ادیب سہیل)

یادِ جاں کے نقش سارے دھو گئی
کرشن چوڑا کی دہکتی آگ ٹھنڈی ہو گئی

(احمد الیاس)

اب چند اشعار ایسے نقل کئے جاتے ہیں جن میں بنگلادیش کی جمہوری تقاضوں اور سیاسی حالات کی غمّازی کی گئی ہے۔

نا امیدی کے تھپیڑے پے بہ پے کھائے ہوئے
دونوں ننگے دونوں بھوکے دونوں گھبرائے ہوئے

اتفاقاً ایک چھوٹا سا جزیرہ مل گیا
سانس لینے کو ہمیں تھوڑا سا وقفہ مل گیا

یاس اور امید کے کُل بندھنوں کو توڑ کر
آؤ سو جائیں پرندوں کی طرح سر جوڑ کر

(احسن احمد اشک)

نسل و تاریخ و تمدّن کے سپہ سالارو
حفظِ اجزا کی جنوں خیز گھڑی آ پہنچی

---

[1] برسات کی ایک راگنی

Dhaka University Institutional Repository

یہی مٹی جو مرا پاؤں دھرے بیٹھی ہے
اس پہ سجدے کی دل آویز گھڑی آ بیٹھی

(نوشاد نوری)

یہ کائناتِ خیر و شر، کوئی بھی معتبر نہیں
میں بے زمین و بے وطن، کہیں بھی میرا گھر نہیں

(احمد الیاس)

یہ ہوئی مری کرامت کہ بدل گیا زمانہ
ترا ذکر اب لبوں پر ہے فسانہ ہی فسانہ
مرا کام ہے مٹانا اور اس کو پھر بنانا
مرا نام ہے تغیّر، میں ہوں باغیٔ زمانہ
وہی انقلاب دل میں ہے محرّک آج اظہر
وہی انقلاب جس سے کہ بدل گیا زمانہ

(اظہر قادری)

ارضِ بنگلادیش کی تو قیمتی ایجاد ہے
مسجدوں کے شہر ڈھاکا میں تری بنیاد ہے
تیری ہر تجویز پر چھوٹے بڑے کا صاد ہے
کل اسیرِ جبر سب تھے آج ہیں سب شاد شاد
اے جنوبی ایشیا کے ہفت ملکی اتحاد[1]

حافظ دہلوی

---

[1] سارک - ہندوستان، پاکستان، بنگلادیش، بھوٹان، مالدیپ، نیپال کا اتحادی گروپ -

Dhaka University Institutional Repository

دو ہجرتوں کے دھوپ نے بے چہرہ کر دیا
اب کیا کسی کا سایۂ دیوار دیکھنا

خورشید احمد

احسن احمد اشک اور افسر ماہ پوری کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں جو قاضی نذر الاسلام کے باغیانہ رنگ سے مماثل ہیں۔

گیت گاتا ہوں میں جمہور کی بیداری کا
مرثیہ لکھتا ہوں میں افلاس کی ناداری
یوں اللہ نے سب کچھ ہی دیا ہے مجھ کو
مضمحل پھر بھی اڑاتا ہوں میں زرداری کا
میں بھی شاعر ہوں خدارا مجھے تسلیم کرو

(احسن احمد اشک)

ابھی تو جواں، تیری ہمت جواں ہے
ترے خون میں برق و آتش نہاں ہے
تری ایک ٹھوکر میں سارا جہاں ہے
جوانی کا جوہر دکھانا پڑے گا
تجھے اور بھی دور جانا پڑے گا

(افسر ماہ پوری)

قیام بنگلہ دیش کے بعد جن فنکاروں نے اردو کے نامساعد حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی فنی نگارشات سے یہاں کے دبستان اردو کو آباد رکھا ان میں سے کلاسیکی غزل گو کی حیثیت سے آصف بنارسی، حافظ دہلوی، ظہور المبارکی، ماہر فریدی، شمس سید آئی وغیرہ نمایاں ہیں۔ دیگر روایتی شعراء میں اختر آنولوی، حسنین بھاگلپوری، شاکرہ طرزی، نیر آحمری، نعیم احمد نعیم کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

Dhaka University Institutional Repository

بنگلہ دیش کی ترقی پسند شاعری کے علاوہ فکری شاعری کی روایت کو جن بزرگ شعراء نے برقرار رکھا اور یہاں اس کی جڑیں مضبوط کیں ان میں احسن احمد اشک (فکری شاعر) نوشاد نوری، احمد سعدی، عطاء الرحمٰن جمیل، احمد الیاس، یاور امان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء کا کلام دور سابق مشرقی پاکستان اور دورِ بنگلہ دیش کا احاطہ کرتا ہے۔ ان پر تبصرے پچھلے اوراق میں ہو چکے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد اُبھرتے ہوئے نوجوان شعراء میں جمال مشرقی، شمیم زمانوی، جلال عظیم آبادی، صابر علی صابر، قاسم انیس، حیدر علی حیدر کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ ان شعراء کے یہاں جدیدیت اور روایت کا امتزاج ہے۔ خاص طور پر جمال مشرقی اور جلال عظیم آبادی کی شاعری میں فکری رجحانات غالب ہیں۔ ان نوجوان فن کاروں میں شمیم زمانوی کا رجحان مکمل طور پر ترقی پسند ہے شمیم کی شاعری تجزیئے اور مشاہدات کی ترجمان ہے۔ شمیم زمانوی سماج کی ناانصافیوں کا شکوہ بڑے جراءت مندانہ لہجے میں کرتے ہیں اور اس رنگ میں انہیں انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ جلال اور جمال نے روایت سے رشتہ جوڑ کر حال سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان شعراء کے یہاں عصری شاعری کا رنگ اجاگر ہوگیا ہے۔ جو ان کے شاعرانہ شعور اور صلاحیت کی پہچان ہے۔ اس گروپ میں شمیم زمانوی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز سے متاثر ہیں۔ قاسم انیس نے اپنی روزانہ زندگی میں آنے والے مصائب اور مشاہدات کی غمازی کی ہے۔ صابر علی صابر کی شاعری میں جذبات کی عکاسی اور الفاظ کی بندش معیاری درجہ رکھتی ہے۔ شعر کہنے کی صلاحیت اچھی ہے۔ راقمہ کو فن عروض پر دسترس نہیں۔ لہٰذا ان شعرا نے فن عروض کے اصولوں کو کہاں تک نبھایا ہے اس پر رائے دینا محال ہے۔ کلام کی نفاست اور طرز نگارش کے اعتبار سے یہ شعراء بلاشبہ پاک و ہند کے معیاری شعراء کی صف میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ ذیل میں بنگلہ دیش کے نوعمر شعراء کے اشعار بطور مثال ملاحظہ فرمائیں:

ہر ایک شے مری لے لو زبان مت چھینو
مری زباں، مری تہذیب کی امانت ہے
مری زباں، مرے اجداد کی وراثت ہے
مری زبان، مری قومیت کی ہے پہچان

(شمیم زمانوی)

تری ہشیاریوں کے ہم بھی آخر ہو گئے قائل
مسیحائی خنجر تو نے دل کے درمیاں رکھ دی

(جلال عظیم آبادی)

Dhaka University Institutional Repository

میں ترے شہر کا اک شاعر ہوں
میرؔ کے رنگ میں کہتا ہوں غزل
جوشؔ کی طرح مری نظمیں ہیں
میں ترے شہر کا اک شاعر ہوں

(جمالؔ مشرقی مرحوم)

جو کام تھا دشوار وہ آسان بہت تھا
ہمت و جواں مردی کا فقدان بہت تھا
اک منفرد آواز تھا اس دور میں صابرؔ
اس کی غزل میں دانش و وجدان بہت تھا

(صابر علی صابرؔ)

کوئی جیتا ہے جہاں میں جیسے کھانے کے لئے
اور کوئی اس قدر کھائے کہ بس زندہ رہے
کتنے کرب انگیز ہیں وہ زیست کے لمحے انیسؔ
حوصلہ مر جائے لیکن آدمی زندہ رہے

(قاسم انیسؔ)

مرے خوابوں کے بہتے آبشارو!
خبر ہے ابھی تک میں ہوں پیاسا
مری دنیا میں تاریکی ہے ہر سو
بھٹکتا ہوں ابھی تک میں اکیلا

(س۔ن۔ فہمیؔ)

آواز دی قرار نے اے بے قرارِ عشق
ضبطِ الم ہے شرط برائے وقارِ عشق

Dhaka University Institutional Repository

چڑھ جائے ایک بار تو اترے نہ پھر کبھی
اللہ رے یہ نشہ و کیف و خمارِ عشق

(نعیم احمد نعیم)

بنگلادیش کے شعراء نے نہ صرف اچھی اور معیاری شاعری کا نمونہ پیش کیا بلکہ تنقید و ادب میں اضافے بھی کئے ہیں جو ناخوشگوار نہیں کہے جا سکتے۔

نثر:

بنگلادیش کے نثر نگاروں کو صنف کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک نقاد و محقق دوسرے افسانہ نگار۔ تقسیم ہندوستان سے قبل مشرقی بنگال (بنگلادیش) کے اردو نثری ذخیرے میں تنقید و تحقیق اور افسانہ نگار کا فقدان تھا۔ اس دور کے قابل ذکر تصنیفات تذکرے، تاریخ اور جغرافیہ و صحافت پر مشتمل ہیں۔ تذکروں میں عبدالغفور نساخ کا "تذکرۃ المعاصرین" اور "سخن شعراء" حکیم حبیب الرحمٰن کا "حیات سقراط" "آسودگان ڈھاکا" تاریخ و جغرافیہ میں منشی رحمٰن علی کا "تواریخ ڈھاکا" حکیم حبیب الرحمن کا ڈھاکا پچاس برس پہلے" صحافت میں ماہنامہ "المشرق" ڈھاکا (زیر ادارت حکیم حبیب الرحمٰن) ماہنامہ "جادو" ڈھاکا (زیر ادارت خواجہ عادل، حکیم حبیب الرحمٰن) ماہنامہ "اختر" میمن سنگھ (زیر ادارت خالد بنگالی) اہم ادبی کارنامے ہیں۔ دیگر نثری کارناموں میں نواب محمد آزاد کا ڈرامہ "نوابی دربار" احمد حسین وافر کا ڈرامہ "بیمار بلبل" قابل ذکر ادبی تصنیفات ہیں۔

بنگلادیش میں تنقید و تحقیق کا آغاز غالباً ۱۹۳۵ء کے بعد ڈاکٹر عندلیب شادمانی کے تنقیدی مضامین اور افسانہ نگاری کی ابتدا ایریم پجاری کے فرضی نام سے ان کی حقیقی کہانیوں سے ہوئی۔ ان کے تحقیقی مضامین اور افسانے اس وقت متعدد ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ شادانی کے مضامین مجموعوں کی شکل میں قیام پاکستان کے بعد "تحقیقات" "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" "تحقیق کی روشنی میں" کے عنوان سے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے اور ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سچی کہانیاں" کے نام سے ۱۹۴۷ء سے قبل شائع ہوا۔ اور "نوش و نیش" کی اشاعت دور پاکستان میں ہوئی۔

تنقید:

قیام پاکستان کے بعد جب یہاں کی ادبی فضا رفتہ رفتہ خوشگوار ہونے لگی تو دیگر اصناف سخن کی طرح تنقید کے میدان میں بھی اتنی وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی کہ یہاں ایک دبستانِ نقد و نظر قائم ہو گیا۔ اس دور کے اکابر نقد و نظر میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، پروفیسر نظیر صدیقی، پروفیسر طاہر فاروقی، پروفیسر معز الدین،

Dhaka University Institutional Repository

پروفیسر صدر الحق، پروفیسر ہارون الرشید، پروفیسر فروغ احمد، ارشد کا کوی اور پروفیسر اظہر قادری وغیرہ رواں دواں رہے۔

ان نقادوں کا راست براہ راست اردو فن اور فنکار سے رہا۔ دیگر نقاد جنھوں نے سابق مشرقی پاکستان کے بدلتے ہوئے حالات سے مفاہمت کرتے ہوئے یہاں کے نئے رجحانات کو قبول کیا اور اپنی تنقید کا رشتہ یہاں کی سرزمین سے جوڑ کر اس کی بقا و ترقی میں کوشاں رہے۔ ان میں ڈاکٹر حنیف فوق، اظہر قادری، اقبال عظیم، وقار راشدی، عبدالجلیل بسمل، ڈاکٹر یوسف حسن، پروفیسر کلیم سہسرامی، پروفیسر محمد عبداللہ، (بنگالی نژاد) ڈاکٹر نورالدین (بنگالی نژاد) عابد دانا پوری، حسین احمد وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان نقادوں میں ڈاکٹر حنیف فوق، اظہر قادری اور ڈاکٹر یوسف حسن ترقی پسند ادب کے حامیوں میں ہیں۔ احسن احمد اشک، نوشاد نوری، احمد الیاس، سلیم اللہ فہمی، ادیب سہیل وغیرہ کا بنیادی میدان شاعری ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً ان کے شائع ہونے والے مضامین و مقالوں کا مرکزی خیال مذکورہ بالا نقادوں کے فکری نقطۂ نظر سے مماثل ہے۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد تحقیق و تنقید کے میدان میں نئے لکھنے والوں میں پروفیسر کلثوم ابوالبشر، پروفیسر اُم سلمیٰ، شعیب عظیم، غلام محمد (مرحوم) ایوب جوہر (مرحوم) وغیرہ رواں دواں ہیں۔ پرانے نقادوں میں ڈاکٹر کلیم سہسرامی کی رفتار تیز ہے۔ پروفیسر عبداللہ کا رجحان اردو ادب کے بجائے تاریخ کی طرف مائل ہے۔ اور اس سلسلے میں انہوں نے متعدد کتابیں بنگلہ زبان میں لکھی ہیں۔ یہاں کے نقادانِ ادب کے فنی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

عندلیب شادانی کی تنقید حقیقت بیانی پر مبنی ہے۔ فنکار چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ اس کی خامیوں کو معاف کرنے کے قائل نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حسرت، فانی، جگر جیسے ماہر فن شخصیتوں کے معائب کو معاف نہ کر سکے۔ دوسری خاصیت جو انہیں تخریبی تنقید کے سرحد تک لے جاتی ہے وہ ان کی نفسیاتی کمزوری ہے۔ انہوں نے فنکار کے محاسن کی بہ نسبت معائب کو زیادہ اجاگر کیا۔ تاہم ان کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیت اور علمیت انہیں ذی فہم نقاد کا درجہ عطا کرتی ہے۔ یہاں کے دیگر نقادوں کے مقابلے میں ان کا ادبی مطالعہ بڑا گہرا اور وسیع تھا۔

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ناقد سے زیادہ محقق ہیں۔ "گلہائے داغ" "مہبائے مینائی" "شبلی ایک دبستان" ان کے مفید تحقیقی کارنامے ہیں۔

شوکت سبزہ واری کی تحقیق و تفتیش میں بڑی گہرائی ہے۔ انہوں نے اپنی رائے بڑی چھان بین کے

Dhaka University Institutional Repository

بعد پیش کی ہے۔ ان کا استدلال اور توضیح مستحکم کہا جا سکتا ہے۔ پر پیچ ادبی مسائل کو واضح کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً ان کا اسلوب بیان واعظانہ ہو گیا ہے جس پر ان کی مولویت اور علمیت کی گہری چھاپ ہے۔ ان کا مطمع نظر اردو لسان و ادب کی ارتقا رہا۔ "اردو زبان کی ارتقا" ان کی پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ جو اشاعت پذیر ہے۔ طاہر فاروقی کی ناقدانہ تحریر بڑی مہذب نہ ہے۔ اسلوب بیان مدلل ہے۔ ان کی کتاب "سیرت اقبال" گرچہ سوانح نگاری کے ضمرے میں آتی ہے۔ لیکن تحقیق کے ماتحت ہے۔ طاہر فاروقی کی ناقدانہ فنکاری ان کی تنقیدی مضامین میں اجاگر ہوئی جو اسوقت متعدد ادبی جرائد میں شائع ہوئیں۔ سابق مشرقی پاکستان میں ۶۰ء کے دہائی کے قریب نظیر صدیقی اور ارشد کاکوی سرگرم ابھرتے ہوئے نوعمر نقاد تھے۔ نظیر صدیقی کی تنقیدی مضامین کا مجموعہ "شہرت کی خاطر" (۱۹۶۸ء) تعصبات و تاثرات (۱۹۶۲ء) کو اس زمانے میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ وہ اپنے ناقدانہ اسلوب میں رشید احمد صدیقی سے متاثر تھے۔ نظیر ایک بے باک اور ذمہ دار نقاد تھے۔ ارشد کاکوی اپنی ادبی سرگرمیوں سے اچھے نقاد اور ادیب کی ذمہ داری نباہ رہے تھے لیکن ان کی جواں سالہ موت نے انہیں آگے بڑھنے نہ دیا۔

تحقیق و تنقید سے منسلک ڈاکٹر عبدالحق کا تحقیقی مقالہ "فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر"[1] ڈاکٹر معیز الدین کا مقالہ "قائم چاند پوری۔ حیات اور کارنامے"[2] ڈاکٹر محمد صدر الحق کا تحقیقی مقالہ "نساخ۔ حیات اور کارنامے"[3] اس دور کے تحقیقی و تنقیدی خدمات کے قیمتی سرمائے ہیں۔ مذکورہ نقاد کو اپنے تحقیقی مقالہ پر شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکا یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں ملیں۔ ان نقادوں نے تحقیق و تنقید کے اصولوں کو حتی الامکان اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر معیز الدین اور صدر الحق کا ناقدانہ اسلوب بیان سلیس اور کلاسیکی ہے۔ انہوں نے استدلال کے ساتھ اپنی رائے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سابق مشرقی پاکستان کے اردو نقادوں میں ڈاکٹر حنیف فوق کا نام سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔ وہ تنقید کے جدید اصولوں سے واقف ہیں۔ انہوں نے یہاں کے بدلتے ہوئے مختلف رجحانات کو بغور دیکھا، محسوس کیا اور اسے ناقدانہ اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے تحقیقی مضامین "اردو کے بنگالی تراجم" "مشرقی پاکستان میں اردو ادب اور ادب کے مسائل" "اردو ادب میں بنگالی ثقافت" (ناول نگاری میں) اس ضمن کے مفید کارنامے ہیں "مثبت قدریں" اور "متوازی لقوش" ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں

---

[1] [2] [3] یہ تمام تحقیقی مقالے ڈھاکا یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

Dhaka University Institutional Repository

حنیف فوق کی تنقید سائنٹفک تنقید ہے۔ انکی تنقید عمرانی تقاضے کو پورا کرتی ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق تنقید کرتے ہوئے بے باک، بیدار مغز مصنف کی طرح رائے پیش کرتے ہیں ان کی تنقید بڑی صحت مند اور جاندار ہے۔ فوق کی تنقید برائے ادب بھی ہے اور برائے زندگی بھی۔ ناقدانہ صلاحیت میں یہاں کے دیگر نقاد فوق سے پیچھے رہ گئے ہیں موضوع کے لحاظ سے وفا راشدی، اقبال عظیم ڈاکٹر یوسف حسن کا نقطۂ نظر ایک ہے لیکن ان کا اسلوب کلاسیکی ہے اقبال عظیم نے "مشرقی بنگال میں اردو" وفا راشدی نے "بنگال میں اردو" اور ڈاکٹر یوسف حسن نے "بنگال میں اردو" لکھ کر بنگال سے اردو کے رشتے کی بہترین استدلال پیش کی ہے۔ لیکن حنیف فوق کی نگاہ سابق مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) اور اردو ادب کے مستقبل پر رہی۔ وہ بنگلہ دیش کی سرزمین میں اردو کے پنپنے کے امکانات پر ناقدانہ روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ ان کی اعلیٰ تنقیدی صلاحیت اور دور اندیشی کی پہچان ہے اس سلسلے میں مسعود شہریار کا تنقیدی نظریہ حنیف فوق کے نظریے سے مماثل ہے۔ انہوں نے اپنے تنقیدی کتاب "مشرقی بنگال میں اردو ادب کا وسیع تر جائزہ" میں سابق مشرقی پاکستان میں اردو ادب کے نئے رجحان کو اجاگر کیا ہے۔

اقبال عظیم، وفا راشدی، یوسف حسن اور مسعود شہریار کی تحقیقی و تنقیدی تصنیفات دبستان بنگلادیش کے انمول جواہر ہیں۔ ان تصنیفات میں اقبال عظیم کی تحقیق، وفا راشدی کا تحقیق و تذکرہ اور یوسف حسن کی تاریخی معلومات لائق تحسین ہیں۔ ان نقادوں کا تحقیقی و تنقیدی اسلوب بیان کلاسیکی ہے۔ اقبال عظیم کے یہاں فنی تنقید کی کمی رہ گئی ہے۔ وفا راشدی نے بھی تحقیق پر زیادہ توجہ دی ہے۔ یوسف حسن نے بنگال کی تقریباً سات سو سال پر محیط سیاسی تاریخ و اسلامی ثقافت کے ساتھ عربی و فارسی زبان کا بنگلا زبان پر اثرات، "پوتھی ادب" نیز اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقاء پر (۱۹۴۷ء تک) سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ مسعود شہریار نے مشرقی پاکستان کے اردو ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحقیق و تنقید کے دونوں پہلوؤں کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

برصغیر کے اردو ناقدین و محققین میں کلیم سہسرامی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ انہوں نے اردو ادب کی تنقید کو بنگلادیش کے حوالے سے لکھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ کلیم سہسرامی کا تنقیدی استدلال بڑا پختہ ہے وہ تنقید میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور شوکت سبزواری سے متاثر ہیں ان کی تنقید میں تحقیق و تنقید کا پلا برابر رہتا ہے۔ اسلوب بیان صاف ستھرا میانہ رو ہے۔ ان کی تنقیدی تصنیفات میں "روایت و درایت" "بنگال میں غالب شناسی" اور "ماثر بنگال" مفید تحقیقی و تنقیدی کارنامے ہیں۔ ان کے کالمین برصغیر کے معیاری جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کلیم سہسرامی نے اردو ادب اور بنگال سے متعلق ایسے ادبی گوشوں کو اجاگر کیا ہے اور اس پر تنقید کی ہے جو ان کی ادب نوازی کی پہچان ہے تحقیق و تفتیش کی اچھی صلاحیت کہی جا سکتی ہے۔

بنگلادیش کے نقادوں میں پروفیسر عبداللہ کو ایک ممتاز نقاد کا درجہ حاصل ہے۔ تحقیق و تفتیش ان کا نشہ ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

ان کی مادری زبان بنگلا ہے۔ اردو، فارسی، عربی کے علاوہ انہیں انگریزی زبان سے بھی واقفیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحقیق و تنقید کا احاطہ وسیع ہے۔ ان کی انتیس ۲۹ کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ جن میں قاضی نذر الاسلام کی زندگی اور فن پر "قاضی نذر الاسلام" کے نام سے ایک اردو تنقیدی کتاب بھی شامل ہے۔ اس کتاب کو اردو ادبی طبقے سے پذیرائی حاصل ہوئی۔ ۱۹۷۲ء سے قبل پروفیسر عبداللہ اردو ادب کی تحقیقی سرگرمیوں سے منسلک تھے۔ ان کا اسلوب بیان مولوی عبدالحق سے متاثر ہے۔ صاف ستھری یا محاورہ اردو لکھتے ہیں۔ ان کے متعدد مضامین ماہنامہ "ساقی" کراچی، ماہنامہ "نو کراچی"، "سیارہ" لاہور میں شائع ہوتے رہے۔ اب ان کا تخلیقی رجحان تاریخ و ثقافت کی طرف مائل ہے۔ اس موضوع سے متعلق ان کی تصنیفی سرگرمی بنگلا زبان میں جاری ہے۔ بہر کیف بنگالی نژاد ہونے کے باوجود ان کی اردو ادبی نگارشات کو معتبر اردو مشاہیر ادب کا معیار حاصل ہے۔

بنگلادیش کے دوسرے بنگالی نژاد اردو محقق ڈاکٹر نورالدین ہیں۔ ڈاکٹر نورالدین سرکاری ملازمت میں مصروف رہ کر ادب و تنقید جیسے دشوار گزار شعبوں کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کا اسلوب بیان سادہ، سلیس و محاورہ ہے ان کی تنقید میں نرمی ہے تلخی نہیں۔ قوت استدلال اچھی ہے تنقید کرتے ہوئے توضیح سمجھا کر پیش کی ہے۔ انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ "اسلامی تصوف اور اقبال" سپرد قلم کر کے سندھ یونیورسٹی سے ڈکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا دوسرا تنقیدی کارنامہ تاریخ ادبیات اردو" کی تالیف و تصنیف ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ان کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیت واضح ہوتی ہے یہ کتاب تیرہویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی عیسوی یعنی زمانۂ حال تک کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں علامہ اقبال پر بنگلا زبان میں بھی ایک تحقیقی کتاب رقم کی ہے۔ مرحوم آخری دم تک اردو ادب سے متعلق مقالے، تنقیدی دیباچے وغیرہ لکھتے رہے۔ انہوں نے تنقیدی فرائض انجام دیتے ہوئے نہایت دیانتداری سے سلیقہ مندی سے کام کیا۔ تنقید و تحقیق کے اس دشوار گزار میدان میں پروفیسر کلثوم ابوالبشر اور پروفیسر اے ایم سلیمی کے نام بھی قابل ستائش ہیں۔

ڈاکٹر کلثوم کے تحقیقی مقالے اور انشائیہ متعدد ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی زبان بڑی دلکش اور با محاورہ ہے۔ نفس مضمون خواہ کچھ بھی ہو زبان کی دلکشی قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ کلثوم نے ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے) کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالے کا ایک حصہ "ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ حیات اور کارنامے" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی تنقید میں رواداری ہے تلخی نہیں۔ شادانی کے محاسن کو انہوں نے جس انداز سے اجاگر

Dhaka University Institutional Repository

کیا ہے۔ وہ تاثراتی تنقید کہی جا سکتی ہے۔ اس مقالے میں تحقیق کی بہ نسبت تنقید کا درجہ ثانی ہے۔ تحقیق میں ان کی دلچسپی قابلِ تأمل ہے۔ مگر ان کے تنقیدی مضامین جو مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں ان میں تحقیق و تنقید کا رشتہ برابر ہے۔ ان مضامین میں ان کا تنقیدی شعور اجاگر ہے۔

پروفیسر اُم سلمیٰ نے "بنگلادیش کے اردو و فارسی ادب میں تاریخی ماخذ" لکھ کر ڈھاکا یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ ان کا اسلوب نگارش مؤدبانہ اور مدلّل ہے۔ اردو گرامر اور محاورہ پر گرفت ہے۔ اُم سلمیٰ کے تنقیدی مضامین اور انشائیہ برصغیر کے ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اُم سلمیٰ ایک باشعور محقق کہی جا سکتی ہیں۔

شعیب عظیم، نوشاد نوری، غلام محمد، احمد الیاس وغیرہ نے بھی شعری و افسانہ نگاری کے پہلو بہ پہلو وقتاً فوقتاً تنقیدی مضامین اور ناقدانہ دیباچے لکھ کر ادب کے اس خشک گوشے پر طبع آزمائی کی ہیں۔ اس گروہ میں نوشاد کے علاوہ احمد الیاس اور شعیب عظیم کی تحقیق میں بڑی وسعت ہے۔ اردو ادب سے متعلق شعیب عظیم کا مطالعہ بہت اچھا ہے۔ ان کا میدان تحقیق و تفتیش ہے۔ بنگلادیش کے اردو دبستان میں شعیب عظیم کی پہچان ایک بے لوث محقق کی حیثیت سے ہے۔

تحقیق و تنقید کے میدان میں بنگلادیش کے محققین کی یہ دلچسپی اس بات کی ضامن ہے کہ مستقبل میں تحقیقی کاموں کی اچھی روایت قائم رہ سکے گی۔

اس باب میں ابتک اُن شعراء و ادباء کے کارناموں پر تبصرہ کرتی رہی ہوں جن کا تعلق شاعری اور تنقید نگاری سے ہے۔ اب ان فنکاروں پر تبصرہ لازمی سمجھتی ہوں۔ جنہوں نے یہاں افسانہ نویسی کی روایت کو برقرار رکھا۔

سابق مشرقی پاکستان) میں دورِ اول کے افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، احمد سعدی، راحت آرا بیگم، زینب تسنیم کے نام روشن ہیں

ان میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، راحت آرا بیگم اور احمد سعدی قیامِ پاکستان کے قبل کے افسانہ نگار ہیں۔ عندلیب شادانی کی کہانیاں "سچی کہانیاں" کے نام سے شہرت پا چکی ہیں۔ جس کا تذکرہ پچھلے اوراق میں کیا گیا ہے سچی کہانیاں دراصل حقیقت بیانی پر مبنی ہیں۔ جس کے مؤجد اور خاتم شادانی ہیں۔ اس نہج پر ان کے بعد کسی فنکار نے چلنے کی کوشش نہیں کی۔ سچی کہانیوں میں متمول گھرانے کی خانگی اور دفتری زندگی کی حقیقی عکاسی کی گئی ہے۔ انداز بیان میں ایسی سحر انگیزی ہے کہ قاری کہانی کو ختم کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ کے تکنیک سے بے نیاز ہونے کے باوجود یہ کہانیاں قارئین میں

Dhaka University Institutional Repository

پسند کی گئیں۔

راحت آرا کی افسانہ نگاری کی صلاحیت اچھی ہے۔ انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ ان کے نفسیاتی شعور نے افسانوں کو کامیاب بنایا ہے۔ ان خوبیوں کے علاوہ راحت آرا کے افسانوں میں دو خامیاں ایسی ہیں جو ذہن میں کھٹکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے افسانوں میں بے جا طوالت سے جس سے واقعات کے بیان میں وقتاً فوقتاً داستانوں کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ انہوں نے پلاٹ، ماحول و کردار دور دیس سے کئے ہیں۔ مثلاً "بدو کی بیٹی"، "دلنواز"، "جو ئف بریملو" میں کردار اور پلاٹ غیر مقامی ہیں۔ ان کے افسانوں میں بنگال کی عکاسی نہیں۔

تکنیک کے لحاظ سے اس دور میں احمد سعدی اور زینب تسنیم کے افسانے زیادہ صحت مند کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن ۱۹۷۱ء سے پہلے احمد سعدی کے بیشتر افسانے بنگلا سے اردو میں منتقل کئے ہوئے ہیں۔ احمد سعدی کا اصل میدان تراجم نگاری ہے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً شوقیہ افسانے لکھے۔ قیام بنگلا دیش کے بعد وہ مستقل افسانہ لکھنے والوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ "مٹی کی خوشبو" (۱۹۸۷ء) اور "دو دیا چراغ محفل" (احمد سعدی اور س۔ م ساجد کا مشترکہ مجموعہ) ڈھاکے سے شائع ہوا۔ "پیاسی دھرتی"، "تہذیب"، "مٹی کی خوشبو"، "زخمی پرندوں کا سفر"، ان کی اچھی کہانیاں ہیں۔ احمد سعدی ترقی پسند تحریک کے حامیوں میں تھے۔ انہوں نے ایک نئے ملک (بنگلا دیش) کے سیاسی و سماجی پس منظر میں پیش آنے والے واقعات اور حالاتِ زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا "بے زبان" اور "درد کا رشتہ" میں انہوں نے بنگلا دیش کی جنگ آزادی کی زد میں تباہ ہو جانے والے بنگالی اور غیر بنگالی افراد کے مصائب و سماجی و اقتصادی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے احمد سعدی معیاری افسانہ نگاروں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن میرا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ تکنیک کے لحاظ سے پختگی ان کے افسانوں میں ۱۹۷۱ء کے بعد آئی ہے۔

۵۰ء کی دہائی میں طبع زاد افسانہ نگاروں میں افسر ماہ پوری کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے اچھے ہیں۔ ان کے افسانوں کا موضوع مشرقی پاکستان کے سماجی مسائل، اقتصادی بدحالی، ہجرت کا کرب، مہاجرین کی رہائش اور ملازمت کا مسئلہ رشوت خوری وغیرہ ہیں۔ سوکھی پتیاں، ان کے افسانوں کا مجموعہ کراچی سے شائع ہوا۔ عورت، جھوٹ، فریب ان کی معاشرتی کہانیاں ہیں۔ ان کا انداز بیان بیانیہ ہے۔

ایاز عصمی اور نواب محی الدین بھی ۵۰ء کے دہائی کے مقبول افسانہ نگار ہیں۔ تقریباً ۶۰ء کے قریب نو عمر ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں کا گروپ افسانہ نگاری کے میدان میں آیا۔ یہ فنکار حقیقت نگاری کی روایت میں افسانہ لکھتے رہے۔ یہ افسانہ نگار سابق مشرقی پاکستان کے نئے ادبی رجحانات کو اپنانے کے قائل رہے۔ انہوں نے سابق مشرقی پاکستان کی شہری زندگی

Dhaka University Institutional Repository

زندگی کا قریب سے جائزہ لیا اور اس کی صحیح ترجمانی کی۔ ان فنکاروں نے بنگلادیش کی مقامی ثقافت اور فطری مناظر کی بھرپور عکاسی کی ہے اور سفاک سیاست دانوں کی بداعمالیوں کے نتائج میں واقع ہونے والے حالات کی غمازی کرتے ہوئے سماج میں پرورش پانے والی بداخلاقی، رشوت خوری، جنسی بے راہ روی پر طنز کے کوڑے بھی لگائے۔ اس گروہ میں اُم عمارہ غلام محمد، بانو اختر شہود، احمد زین الدین، واحد نظامی، جاوید منہاس، مسعود شہریار، زین العابدین وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

۱۹۶۵ء کے بعد جن افسانہ نگاروں نے شہرت پائی ان میں شہزاد اختر، شہزاد منظر، علی حیدر ملک، یونس احمر، ایوب جوہر مقبول ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے ہجرت کا کرب، مشرقی پاکستان کی عوامی زندگی کے مسائل، معاشی بدحالی، افسران کی ان کے ماتحت ملازمین کے ساتھ ناانصافیاں اور رشوت خوری وغیرہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ مذکورہ افسانہ نگاروں کے افسانے سابق مشرقی پاکستان کی شہری و دیہی زندگی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں بنگلادیش کے قدرتی مناظر کی عکاسی ملتی ہے۔

شہزاد منظر اپنے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"سرزمین بنگال نے مجھے ذہنی طور پر کتنا متاثر کیا ہے، اس کا ثبوت میرے وہ افسانے ہیں جو حال ہی میں "ندیا کہاں ہے تیرا دیس" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل بیشتر افسانے سرزمین بنگال اور اس کے عوام (بنگالی اور غیر بنگالی) کی زندگی سے تعلق ہے۔"[1]

۱۹۷۱ء کے بعد بنگلادیش میں رہ جانے والے افسانہ نگار باقاعدگی سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان میں احمد سعدی، غلام محمد، زین العابدین، ذاکر عزیزی، ایوب جوہر، حیدر صفی، شام بارک پوری، ایم۔ نعیم، س۔ م۔ ساجد، قاضی محی الدین، خلیل الرحمٰن زخمی، قاسم انیس، کلیم احمد، ارمان شمسی وغیرہ شامل ہیں۔ شہزاد منظر نے اپنی کتاب "پاکستان اردو افسانے کے پچاس سال" میں بنگلادیش کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں ڈاکٹر کلثوم اور اُم سلمیٰ کا نام شامل کرلیا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ ڈاکٹر کلثوم اور اُم سلمیٰ کا میدان انشائیہ نگاری تحقیق اور تنقید ہے۔ کلثوم نے چند شوقیہ افسانے لکھے ہیں۔ جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں خواتین کے قلم ابتک مضمون نگاری میں رواں دواں ہیں۔ افسانہ نگاروں کے اس گروپ میں احمد سعدی (مرحوم) غلام محمد (مرحوم) زین العابدین، حیدر صفی، بنگلادیش کے قیام سے قبل سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ ان کے بعد کے تمام افسانہ نگار ۱۹۷۱ء کے بعد منظر عام پر آئے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد افسانوی میدان میں معتبر افسانہ نگاروں میں ام عمارہ، بانو اختر شہود، گلنار آفریں، غلام محمد، زین العابدین، علی حیدر ملک، اختر شہزاد، شہزاد منظر شامل ہیں۔ ان فنکاروں نے سابق مشرقی پاکستان کے سیاسی، سماجی و مقامی تناظر میں افسانے لکھے افسانوں میں ام عمارہ کا "کروٹ" زین العابدین کا "زرد موسم کا صلیب"

---

[1] میرے سوالنامے کے جواب میں شہزاد منظر نے یہ معلومات بہم پہنچائیں۔

Dhaka University Institutional Repository

شہزاد منظر کا "تدیا کہاں ہے ترا دیس"، شہزاد اختر کا "دیوانے کا خواب"، غلام محمد کا "لہو قطرہ قطرہ" زین العابدین کا "راکھال" علی حیدر ملک کا "بے زمیں بے آسماں" عمدہ افسانے ہیں۔ ان افسانوں کا طرز تحریر بیانیہ ہے، فنی لوازم بدرجہ اتم موجود ہے۔ گلنار آفریں کے افسانے مشرقی تہذیب کے گرد رواں دواں ہیں۔ گلنار آفری کا کلیدی کردار "عورت" ہے۔ جو موجودہ دور کی جدید تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ مشرقی تہذیب کی گرویدہ ہے۔ گلنار آفریں کے افسانوں میں ہجرت کا کرب وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن ان کا بنیادی میدان "مشرقیت" ہے۔ "پلک پلک سمٹی رات" گلنار کی اچھی کہانی ہے۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد افسانہ نویسی کے میدان میں احمد سعدی کہنہ مشق افسانہ نویس تھے۔ غلام محمد اور زین العابدین کے نام ممتاز افسانہ نگاروں میں لئے جاسکتے ہیں۔ ایوب جوہر، شام بارک پوری، ایم۔ نعیم، س۔م۔ ساجد، قاضی محی الدین معیاری افسانہ نگار ہیں۔ غلام محمد کے افسانوں کی جڑیں بنگلادیش کی سرزمین میں پیوست ہیں۔ زین العابدین نے کہانیاں کم لکھیں لیکن معتبر لکھیں۔ غلام محمد اور زین العابدین کے بیشتر افسانوں کا موازنہ بنیادی تخیل کے لحاظ سے شوکت عثمانی کے بنگلا افسانوں سے ہو سکتا ہے افسانہ نویسی میں غلام محمد اور زین العابدین، احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین کے ضمرے میں آتے ہیں۔ شام بارک پوری بسیار نویس افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ شام بارک پوری کے افسانوں کا مجموعہ "پدما کی موجیں" بنگلادیش سے شائع ہونے والا پہلا مجموعہ ہے۔ فنی لحاظ سے شام کے افسانے غلام محمد اور زین العابدین کے افسانوں سے کمتر ہیں۔ لیکن موضوعات کے لحاظ سے ان کے افسانے قابل داد ہیں۔ اس میں انہوں نے انسانیت کے بہت سے مسائل پر بھی روشنی ڈالی اور بنگلادیش کی سیاسی و سماجی حالات کی بھی عکاسی کی۔ بنگلہ دیش کے کیمپوں میں بہاریوں کے کرب و مصائب کی بھی غمازی کی۔ ان کے افسانوں میں "توپ" "بے زبانوں کی زبان" "سانپ اور انسان" وغیرہ اچھی کہانیاں ہیں۔ ذاکر عزیزی کی کہانیوں میں بھی بنگلادیش کے ماحول اور معاشرتی مسائل کی عکاسی ہے۔ ایوب جوہر کے افسانوں میں بنگلہ دیش کی غلط سیاست کے کرب ناک نتائج، عوام میں پوشیدہ طور پر پرورش پانے والی اخلاقی کمزوریاں، جنسی بے راہ روی کی غمازی ہے۔ ان کے افسانوں میں "ہجرت" اور "سادہ کاغذ" اچھے افسانے ہیں۔ "ہجرت" میں تقسیم ہندوستان کے بعد مہاجرین کی پریشانی اور اس وقت سابق مشرقی پاکستان کے مقامی لوگوں کا مہاجرین کے ساتھ والہانہ ہمدردی، پھر ۱۹۷۱ء کے بعد اس اخوت و محبت میں تناؤ اور معاشی مسائل کی عکاسی ہے۔ قاضی محی الدین کا افسانہ "کال بیساکھی" میں یہاں کے کسانوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں دیہی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔

قاضی محی الدین کرشن چندر سے متاثر ہیں۔ فنی لحاظ سے ان کے افسانے عمدہ ہیں۔ ان کے افسانے ادبی جریدوں

لہ بنگلا زبان کے مشہور افسانہ نگار

Dhaka University Institutional Repository

میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بنگالی نژاد ہونے کے باوجود انہیں اردو زبان و محاورہ پر عبور حاصل ہے۔ س۔م ساجد اور ایم۔ نعیم بنگلا دیش کے نوعمر افسانہ نگار ہیں۔ ان کی قلمی نگارشات بنگلہ دیش کے ماحول میں پروان چڑھیں ۔ س۔م۔ ساجد کا قوت مشاہدہ بڑا تیز ہے۔ ان کی کہانیاں "سوندھی مٹی" "صلیب کے سائے" وغیرہ مقصدیت کے تحت اچھی کہانیاں ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے بعد بنگلہ دیش میں پیدا ہونے والے مسائل، جنیوا کیمپ، ریڈ کراس کی امداد ان کی کہانیوں کے موضوعات ہیں۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد ناول نگاری پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ سابق مشرقی پاکستان کے زمانے میں فضل احمد کریم فضلی اس صنف میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ ناول لکھنے اور پڑھنے کے لئے جس سکون اور وقت کی ضرورت ہے وہ زمانہ کے ستم ظریفی کے بھینٹ چڑھ چکی ہے اس کے علاوہ اس برقی دور میں ہر زبان میں مختصر افسانہ مقبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنگلا دیش کے اردو فنکار بھی افسانہ نگاری پر توجہ دیتے آرہے ہیں۔ بہرحال دور پاکستان میں فضلی نے دو ایسے ناول لکھے جو اردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان میں ایک کا نام "خون جگر ہونے تک" دوسرے کا نام "سحر ہونے تک" ہے یہ ناولیں سابق مشرقی پاکستان کی تاریخی پس منظر میں لکھی گئیں۔ فضلی کی یہ ناولیں موجودہ اردو ناول میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ ایسے ناول جس میں ملک اور سماج کے مسائل کو رومان کی چاشنی کے بغیر اتنے دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہو، اردو میں نہیں ملتے۔

ناول کے دوسرے مصنف اختر حامد خاں ہیں جو فلاحی کام کے سلسلے میں کومیلا میں رہتے تھے۔ جنہوں نے گنگا جمنی میدان کے عنوان سے ایک نیم سوانحی ناول لکھا جو ماہنامہ "ساقی" کراچی میں شائع ہوا۔ بعد میں کراچی سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔

تیسرے ناول نگار حیدر صفی ہیں۔ "مادام" ان کا مقبول ناول ہے۔ اس ناول میں انہوں نے بنگالی کلچر کی اچھی نمائندگی کی ہے۔ اس ناول پر ۱۹۷۱ء میں مصنف کو آدم جی انعام ملا تھا۔ حیدر صفی کے اس ناول کو مکتبہ ستون، ڈھاکا نے جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔

اظہر قادری کا ناول "ایک کتے کی آپ بیتی" طنزیہ ناول ہے۔ جو ایشیا کتاب گھر، ڈھاکا سے شائع ہوا۔ اس ناول کا مرکزی کردار "[illegible]" کا ہے۔ اس لئے کلکتے کے شہری حالات، راستے وغیرہ کا ذکر پایا جاتا ہے مصنف کا اسلوب ترقی پسندانہ ہے۔

شہزاد منظر، پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال۔ کراچی ۱۹۹۷ء ص ۲۰۰

Dhaka University Institutional Repository

ان ناولوں سے یہ ظاہر ہے کہ بنگلادیش میں ناول نگاری کی رفتار سست رہی اور افسانوں کی تخلیق سے

صاف عیاں ہے کہ قیام بنگلادیش کے بعد اس صنف کا یہاں غیر معمولی رفتار جاری ہے۔

ہر عہد کا ادب اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے، ایک شناخت رکھتا ہے۔ بنگلادیش کا ادب بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ بنگلادیش کا اردو ادب اپنی مخصوص مزاج اور شناخت کے ساتھ رواں دواں ہے۔

Dhaka University Institutional Repository

منابع اور ماخذ

کتابیات

مصنف / مولف / مرتب	کتاب کا نام	مطبع	ایڈیشن / سن اشاعت
	(الف)		
احسن احمد اشک	جاگتے جزیرے	انجمن پریس کراچی	بار اوّل جولائی ۱۹۶۲ء
〃 〃	برق و باراں	ربانی پریس کلکتہ	بار اوّل جون ۱۹۴۹ء
〃 〃	آہنگِ انقلاب	ڈھاکا	بار اوّل ۱۹۶۰ء
افسر ماہ پوری	جامِ کوثر	بنگلا اکاڈمی	بار اول ۱۹۶۳ء
〃 〃	طور سے حرا تک (حمد و نعت)	پرنٹوگراف پریس، ناظم آباد کراچی	بار اوّل ۱۹۹۶ء
〃 〃	سوکھی پتیاں (افسانے)	افسر ماہ پوری میموریل اکاڈمی کراچی	بار اوّل ۱۹۹۹ء
〃 〃	غبارِ ماہ	ایجوکیشنل پریس کراچی	بار اوّل ۱۹۵۷ء
اُمِ عمارہ	آگہی کے ویرانے (افسانے)	معراج پریس لاہور	بار اوّل ۱۹۹۸ء
احمد الیاس	آئینہ ریزے (شعری مجموعہ)	جنتا پرنٹنگ اینڈ بیکیجز لمیٹڈ ڈھاکا	بار اوّل ۱۹۸۵ء
الطاف حسین حالی	مقدمۂ شعر و شاعری	کشمیری کتاب گھر اردو بازار لاہور	طبع جدید ۱۹۶۶ء
〃 〃	حیاتِ جاوید	اشرف پریس آئینہ ادب لاہور	
احمد حسین دافر	بیمار بلبل	مکتبۂ محمدی	۱۹۶۸ء
احمد حسین	تنقیدی جائزے	بساط ادب پاکستان	بار اوّل ۲۰۰۰ء
آفتاب احمد صدیقی ڈاکٹر	شبلی ایک دبستان	ایجوکیشنل پریس	بار اوّل ۱۹۵۷ء
〃 〃	صہبائے مینائی	ڈھاکا	بار اوّل ۱۹۵۸ء
اعجاز حسین ڈاکٹر	مختصر تاریخ ادب اردو	اردو اکاڈمی سندھ کراچی	تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۱ء
اظہر قادری پروفیسر	فکر و فن کے محرکات	حلقۂ آہنگ نو کراچی	بار اوّل ۲۰۰۱ء
اسد الحق شیدائی پروفیسر	نئی اور پرانی شمع (تنقید و تحقیق)	دی پرنٹ لائین پٹنہ (انڈیا)	سال اشاعت ۱۹۹۶ء

Dhaka University Institutional Repository

مصنف/ مولف/ مرتب	کتاب کا نام	مطبع	ایڈیشن/ سن اشاعت
اقبال عظیم	مشرقی بنگال میں اردو	مشرق کوآپریٹو پبلی کیشنز ڈھاکا	بار اوّل ۱۹۵۷ء
〃	ما حصل (شعری مجموعہ مع سوانح)	بزم خدام الادب نئی دہلی	ندارد
〃	مضراب	———	۱۹۷۵ء
〃	چراغ آخر شب	ایجوکیشنل پریس کراچی	بار اوّل دسمبر ۱۹۹۳ء
〃	سات ستارے	نواب پور روڈ، ڈھاکا	ندارد
ایس. این. ایچ رضوی (مرتب)	بنگلادیش ڈسٹرکٹ گزیٹرز	بنگلادیش گورنمنٹ پریس ڈھاکا	
احمد زین الدین	دریچے میں سجی چراغ	منظر پبلی کیشنز	بار اوّل ۱۹۹۷ء
احمد سعدی	مٹی کی خوشبو (افسانے)	شاہکار پبلی کیشنز ڈھاکا	بار اوّل ۱۹۸۹ء
احمد سعدی/ س.م ساجد	دودِ چراغ محفل (افسانے)	〃 〃 〃	〃 ۱۹۸۳ء
امیر الاسلام شرقی	خوابِ رفتہ (انتخاب کلام)	قدوس پرنٹرز لاہور	۱۹۸۳
ابو سعید نور الدین ڈاکٹر	تاریخ ادبیات اردو (حصہ اول نثر)	مغربی پاکستان اردو اکاڈمی لاہور	۱۹۹۷ء
〃 〃	(حصہ دوم نظم)		
〃 〃	اسلامی تصوف اور اقبال	اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور	۱۹۵۹ء
〃 〃	بھاکوی اقبال	علامہ اقبال شنگشد بنگلادیش	۱۹۹۶
ایوب جوہر	سادہ کاغذ	محاذ پبلی کیشنز ڈھاکا	۱۹۸۶ء
	(ج)		
جمیل عظیم آبادی	آب و سراب (نظمیں)	شہاب آرٹ پرنٹرز کراچی	بار اوّل ۱۹۹۳ء
〃 〃	گیان درپن (دوہے)	ایجوکیشنل پریس کراچی	۱۹۸۵ء
جمیل جالبی ڈاکٹر	تاریخ ادب (جلد اوّل)	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی	۱۹۷۷ء
جمال مشرقی	شہرِ آئینہ (نظمیں)	مجلس پبلی کیشنز ڈھاکا	بار اوّل ۱۹۹۵
جاوید نہال ڈاکٹر	بنگال کا اردو ادب (۱۹ویں صدی میں)	عثمانیہ بک ڈپو کلکتہ	طبع ثانی ۱۹۸۴ء

Dhaka University Institutional Repository

مصنف / مولف / مرتب	کتاب کا نام	مطبع	ایڈیشن / سن اشاعت
جیلانی ایس۔ بی	پندرہ گورنر پندرہ کہانیاں (مشرقی پاکستان کی ان کہی داستان)	فرنٹیر بوسٹ پبلی کیشنز لاہور	بار اوّل ۱۹۹۳ء
	(ح)		
حکیم حبیب الرحمٰن	آسودگانِ ڈھاکا	منظر پریس جہاوت ٹولی	بار اوّل ۱۹۴۶ء
〃 〃	ڈھاکا پچاس برس پہلے	کتاب منزل لاہور	بار اول ۱۹۴۹ء
〃 〃	ثلاثۂ غسالہ	مغربی پاکستان اردو اکاڈمی	بار اول ۱۹۹۵ء
حسنین بھاگلپوری	اشک غم	مجلس پبلی کیشنز ڈھاکا	بار اول ۱۹۵۴ء
حافظ دہلوی	آندھیوں میں چراغ (مجموعہ شعری)	حلقۂ فکر و دانش کراچی	ندارد
حامد حسن قادری	داستان تاریخ اردو	لکشمی نرائن آگرہ	طبع اول ۱۹۶۰ء
حنیف فوق ڈاکٹر	چراغ شناسائی	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	۱۹۸۷ء
〃 〃	مثبت قدریں	پاسبان فوٹو آفسٹ پریس ڈھاکا	بار اوّل ۱۹۶۸ء
〃 〃	متوازی نقوش	نفیس اکاڈمی اردو بازار کراچی	اگست ۱۹۸۹ء
	(خ)		
خجستہ اختر سہروردی	کوکب دری	کلکتہ	۱۹۳۵ء
خوشتر منگرولی	حسنِ خیال (شعری مجموعہ)	حلقہ فکر و دانش ڈھاکا	دسمبر ۱۹۸۵ء
	(ذ)		
ذکی آذر	حاصلِ سفر	ایجوکیشنل پریس کراچی	۱۹۹۴ء
	(ر)		
راحت آرا بیگم	بانسری کی آواز	تاج کمپنی لاہور	
رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو	سہ رام کمار پریس لکھنؤ	۱۹۵۲ء
رفیع احمد فدائی	جھکالتا (تراجم)	بنگلا اکاڈمی (سابق مشرقی پاکستان)	(۱۹۶۱ء تاریخ دیباچہ)
〃 〃	جوع الاجل	اقبال نذرل اکاڈمی ڈھاکا	ندارد

Dhaka University Institutional Repository

مصنف/مولف/مرتب	کتاب کا نام	طبع	ایڈیشن/سن اشاعت
	(س)		
سلیم اللہ فہمی	ذوق سلیم (شعری مجموعہ)	اوکھائی پرنٹنگ پریس کراچی	مئی ۱۹۹۰ء
〃 〃	مشرق	مشرق کوآپریٹو پبلی کیشنز لمیٹڈ ڈھاکا	ندارد
سالک لکھنوی	بنگال میں اردو کی تاریخ (آغاز تا حال)	مغربی بنگال اردو اکاڈمی	بار اوّل ۱۹۹۰ء
	(ش)		
شرف الحسینی	گلستانِ شرف	ستارہ ہند لمیٹڈ کلکتہ	بار اوّل ۱۹۳۷ء
〃 〃	دبستانِ شرف		غیر مطبوعہ
شاہین غازی پوری	رگِ ساز	ستارہ پاکستان پریس ڈھاکا	
شفیق احمد شفیق	ادراک (تنقید)	ایجوکیشنل پریس کراچی	بار اوّل ۱۹۹۳ء
〃 〃	پسِ لفظ آئینہ (شعری مجموعہ)	حلقۂ آہنگ نو کراچی	۱۹۹۸ء
شام بارک پوری	پدما کی موجیں (افسانے)	لیتھو آرٹ پریس ڈھاکا	ستمبر ۱۹۷۹ء
〃 〃	رنگ و بو کی سرزمین (سفرنامہ)	کلچرل اکاڈمی ڈھاکا	۱۹۹۱ء
〃 〃	رجنی گندھا (افسانے)	برقی آرٹ پریس زندہ بہار لین ڈھاکا	بار اول نومبر ۱۹۹۰ء
〃 〃	سورج مکھی	کلچرل اکاڈمی ڈھاکا (کھنا شاخ)	بار اوّل نومبر ۱۹۸۶ء
〃 〃	کرشنا چوڑا کے سائے میں	لیتھو آرٹ پریس ڈھاکا	بار اول ۱۹۸۱ء
〃 〃	میگھنا کی لہریں	کلچرل اکاڈمی ڈھاکا	۱۹۸۰ء
〃 〃	آتشی چنار	〃 〃 〃	نومبر ۱۹۹۱ء
شہزاد منظر	علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ	منظر پبلی کیشنز کراچی	بار اول ۱۹۹۵ء
〃 〃	پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال	مالس پرنٹنگ پریس کراچی	۱۹۹۷ء
〃 〃	ندیا کہاں ہے تیرا دیس (افسانے)	منظر پبلی کیشنز کراچی	اشاعت اول ۱۹۷۱ء
〃 〃	ردِ عمل	〃 〃	بار اوّل ۱۹۸۵ء
〃 〃	اندھیری رات کا تنہا مسافر (ناول)		

Dhaka University Institutional Repository

مصنف / مولف / مرتب	کتاب کا نام	مطبع	ایڈیشن / سن اشاعت
شہید اللہ و دیگر	بنگلا ادب کی تاریخ	ڈھاکا یونیورسٹی ڈھاکا	جون ۱۹۵۷ء
شوکت سبزواری	اردو زبان کا ارتقاء	ڈھاکا	جولائی ۱۹۵۶ء
	(ط)		
طاہر فاروقی پروفیسر	سیرت اقبال	قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور	بار اوّل جنوری ۱۹۳۹ء
طاہر مسعود	بہ صورت گر کچھ خوابوں کے	عظیمی پرنٹرز کراچی	بار دوم ۱۹۸۵ء
	(ظ)		
ظہور المبارکی	غزالانِ حرم	دی ڈھاکا پرنٹنگ پریس ڈھاکا	بار اول ۱۹۷۳ء
	(غ)		
عبد الغفور نساخ	تذکرۃ المعاصرین	کلکتہ	۱۸۸۹
" "	تذکرۂ سخن شعراء	نول کشور لکھنو	۱۸۷۴ء / ۱۲۹۱ھ
عبد الحق پروفیسر	فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر	(غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ)	
عبادت بریلوی	جدید شاعری	ایجوکیشنل ہاؤس علیگڑھ	۱۹۸۳
عبد الجلیل بسمل	سلیٹ میں اردو	انجمن ترقی اردو کراچی	بار اوّل ۱۹۸۰/۸۱ء
عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقا	ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ	۱۹۹۵ء
علی حیدر ملک (مرتب)	دبستان مشرق	مجلس فکر نو کھلنا	بار اول ۱۹۷۰ء
عندلیب شادانی	تحقیق کی روشنی میں	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	بار اول ۱۹۶۳ء
" "	چھوٹا خدا	علمی پرنٹنگ پریس لاہور	۳۱ر فروری ۱۹۵۱ء
" "	دور حاضر اور اردو غزل گوئی	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	۱۹۵۱ء
" "	نوش و نیش	" " "	(1951) تاریخ دیباچہ
" "	نشاط رفتہ		(۲۳ر اکتوبر ۱۹۵۰ء تاریخ دیباچہ

Dhaka University Institutional Repository

مصنف / مولف / مرتب	کتاب کا نام	مطبع	ایڈیشن / سن اشاعت
	(ک)		
کریم ارتضیٰ	آٹھویں دہائی میں بہار کا اردو ادب	دہلی	سنہ ۱۹۸۱ء
کلثوم ابوالبشر ڈاکٹر	ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ (حیات اور کارنامے)	برقی آرٹ پریس ڈھاکا	اکتوبر سنہ ۱۹۹۲ء
کنیز بتول	اردو بھاشائے نذرل چرچا	نذرل انسٹی ٹیوٹ ڈھاکا	بار اول سنہ ۲۰۰۱ء
کلیم سہسرامی ڈاکٹر	بنگال میں غالب شناسی	برقی آرٹ پریس بٹوا ٹولی ڈھاکا	بار اوّل سنہ ۱۹۹۰ء
〃 〃	مآثر بنگال (تنقید و تحقیق)	دارالادب ماردن نگر کالونی پٹنہ	بار اوّل سنہ ۱۹۹۳ء
〃 〃	روایت و درایت (تنقید و تحقیق)	نقاد پبلیشرز عالم گنج گھرا پٹنہ	بار اوّل سنہ ۱۹۹۱ء
〃 〃	خدمت گزاران فارسی در بنگلہ دیش	رایزنی فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ڈھاکا	سنہ ۱۹۹۹ء
	(گ)		
گلنار آفریں	پلک پلک سمٹی رات (افسانے)	اکیڈمک آفسیٹ پریس کراچی	جنوری سنہ ۱۹۹۰ء
〃 〃	تشنۂ غم (شعری مجموعہ)	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	بار اوّل اگست سنہ ۱۹۹۵ء
	(م)		
معزالدین پروفیسر	رہنمائے سخن	قرآن منزل ڈھاکا	تاریخ دیباچہ سنہ ۱۹۶۰ء
〃 〃	قائم چاندپوری حیات اور کارنامے	غیر مطبوعہ	
محی الدین قادری زور	ہندوستانی لسانیات	شاہی پریس لکھنو	مارچ سنہ ۱۹۶۰ء
مسعود شہریار	مشرقی پاکستان میں اردو ادب وسیع تر جائزہ	مکتبہ عالیہ پریس لاہور	مارچ سنہ ۱۹۶۰ء
محمد عبداللہ	بانگلا دیشے فارسی ساہیتو	اسلامک فاؤنڈ ڈھاکا	سنہ ۱۹۸۳ء
〃 〃	نذرالاسلام	پاکستان اکاڈمی ڈھاکا	اشاعت اوّل سنہ ۱۹۶۱ء
〃 〃	ڈھاکا رکوئیک جون مسلم شودھی	اسلامک فاونڈیشن ڈھاکا	سنہ ۱۹۹۱ء
محمد اکرام	آبِ کوثر	فیروز سنز لیمیٹڈ لاہور	سنہ ۱۹۶۶ء

Dhaka University Institutional Repository

مصنف / مولف / مرتب	کتاب کا نام		ایڈیشن / سن اشاعت
مولوی تمیز الدین خان	مولوی تمیز الدین خان بنام وفاق پاکستان	فرنٹیر بوسٹ پبلی کیشنز پاکستان	بار اول ۱۹۹۳ء
مشتاق احمد	بنگال میں اردو ڈراما	مغربی بنگال اردو اکادمی	بار اوّل ۱۹۹۰ء
	(ن)		
نصیر الدین ہاشمی ڈاکٹر	دکن میں اردو	انشا پریس لاہور	بار پنجم ۱۹۶۰ء
نظیر صدیقی	حسرت اظہار (شعری مجموعہ)	حرم پریس کراچی	تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء
〃 〃	میرے خیال میں	پاسبان فرنڈ آفسیٹ پریس ڈھاکا	بار اول ۱۹۶۸ء
〃 〃	علم عروض علم بلاغت	ڈھاکا	
〃 〃	تاثرات و تعجبات	شعبہ تحقیق و اشاعت مدرسہ عالیہ ڈھاکا	بار اول ۱۹۶۲ء
〃 〃	سو یہ ہے اپنی زندگی	سرحد اردو اکیڈمی ایبٹ آباد	بار اول ۱۹۹۰ء
نواب محمد آزاد	خیالاتِ آزاد	مکتبہ خیابان ادب لاہور	۱۹۶۹ء
نوشاد نوری	رہ رسم آشنائی	کلکتہ	بار اوّل ۲۰۰۰ء
نور حسین ہاشمی	دلی کا دبستان شاعری	اردو اکادمی سندھ کراچی	دسمبر ۱۹۶۶ء
	(و)		
وفا راشدی ڈاکٹر	بنگال میں اردو	اردو پریس حیدر آباد	بار اول ۱۹۵۴ء
〃 〃	حیات وحشت	ایجوکیشنل پریس کراچی	نومبر ۱۹۸۲ء
〃 〃	میرے بزرگ میرے ہم عصر	ایجوکیشنل پریس کراچی	۱۹۹۵ء
وقار عظیم	داستان سے افسانہ تک	اردو اکاڈمی سندھ کراچی	
وکیل احمد پروفیسر	انیس شتوکے بنگالی مسلمانیر جیتا جیتو نار دھارا۔ حصہ اول و دوم	بنگلا اکاڈمی ڈھاکا	۱۹۸۵ء
	(ہ)		
ہارون الرشید پروفیسر	اردو ادب اور اسلام (جلد اول جلد دوم)	اسلامک پبلی کیشنز لاہور	بار اول ۱۹۷۵ء
	(ی)		
یوسف حسن ڈاکٹر	بنگال میں اردو	ایمی پرنٹرس ڈھاکا	بار اول ۱۹۹۹ء
یونس احمد	ماضی کے تعاقب میں	فضلی سنز پرائیویٹ اردو بازار کراچی	بار اول ۱۹۹۱ء

Dhaka University Institutional Repository

Grahame-Baily -	:	A History of Undu Literature
Campbell, AC -	:	Glimpses of Bengal Calcutta, 1907.
Edited by Sharif Uddin Ahmed	:	Dhaka past present future, The Asiatic society of Bangladesh.
Sufia Ahmed	:	Muslim community in Bengal (1884-1912) Dacca Sufia Ahmed, Asiatic Press 1974
Muhammad Taifoor,	:	Glimpses of old Dhaka-- Lulu Bilqis Banu & others 1985
Azimusshan, Haider (ED)	:	A city and its civic-- Body. Dacca Municipality-1966

Bangladesh District Gazetteers Dacca 1969

Bangladesh District Gazetteers Chittagong 1975

Dhaka University Institutional Repository

جریدے، رسائل و اخبارات کے نام	مدیران	مقام و تاریخ اجراء
	(الف)	
۱		
المشرق ماہنامہ	حبیب الرحمٰن حکیم	ڈھاکا اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء
اختر ماہنامہ	خالد بنگالی	بولائی - میمن سنگھ
الفاظ ماہنامہ	اختر جمیل	کراچی اکتوبر سنہ ۱۹۸۶ء
آب و گل سہ ماہی	سرور بارہ بنکوی	ڈھاکا - دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء
ادب لطیف ماہنامہ	صدیقہ بیگم	لاہور جنوری سنہ ۱۹۹۰ء
انجمن	احمد الیاس	ڈھاکا جنوری سنہ ۱۹۷۸ء
آئندہ ماہنامہ	واجد محمود	کراچی
ادب سہ ماہی	جلال عظیم آبادی	ڈھاکا مئی سنہ ۲۰۰۲ء
〃 〃	〃	〃 اکتوبر سنہ ۲۰۰۰ء
〃 〃	〃	〃 اپریل سنہ ۲۰۰۱ء
انتخاب —	ذاکر عزیزی	سید پور سنہ ۱۹۸۴ تا سنہ ۱۹۸۸ء (کل پانچ شمارے)
انکشاف سہ ماہی	ایوب جوہر	ڈھاکا جون - جولائی - اگست سنہ ۱۹۹۹ء
〃 〃	〃	〃 مارچ سنہ ۱۹۸۵ء
〃 〃	〃	〃 جنوری سنہ ۲۰۰۱ء
افکار ماہنامہ	صہبا لکھنوی	کراچی اپریل سنہ ۱۹۶۴ء
〃 〃	〃	〃 فیض نمبر
بنات ماہنامہ	رازق الخیری	دہلی سنہ ۱۹۴۶ء
بادبان سہ ماہی	ایس۔ ایم۔ رب پروفیسر (نگراں)	ڈھاکا جون تا اگست سنہ ۱۹۶۹ء
پیام مشرق ہفت روزہ	ظفر تبریزی	چاٹگام جمعہ ۳۰ اپریل سنہ ۱۹۶۵ء

Dhaka University Institutional Repository

پاسبان روزنامہ		ڈھاکا اگست سنہ ۱۹ء دسویں شمارے
〃 〃		〃 ۳، ستمبر سنہ ۱۹۶۷ء
〃 〃		〃 ۱۰، ستمبر سنہ ۱۹۶۷ء
جادو ماہنامہ	خواجہ عادل اور حبیب الرحمٰن حکیم	ڈھاکا نومبر سنہ ۱۹۲۳ء
خاور 〃	عندلیب شادانی ڈاکٹر	ڈھاکا اگست سنہ ۱۹۵۲ء
دلربا 〃	عبدالقادر ابوالحسنات	〃 اگست سنہ ۱۹۵۲ء تا مئی، جون سنہ ۱۹۵۳ء
دائرے 〃	حسنین کاظمی	کراچی جون سنہ ۱۹۹۰ء
دستک —	س۔م ساجد	سنہ ۱۹۹۲ء
روحِ ادب سہ ماہی	سالک لکھنوی (چیرمین) عاقمہ شبلی (وائس چیرمین)	مغربی بنگال اردو اکاڈمی (۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۱ء)
ساقی ماہنامہ	شاہد احمد دہلوی	مشرقی پاکستان نمبر سنہ ۱۹۶۳ء کراچی
〃 〃	〃	ستمبر سنہ ۱۹۶۵ء کراچی
سیارہ 〃	نعیم صدیقی	سالنامہ سنہ ۱۹۹۱ء لاہور
〃 〃	〃	اشاعت خاص (فروغ احمد نمبر) سنہ ۱۹۹۵ء لاہور
منگ میل —	خلیل الرحمٰن زاخمی	سنہ ۱۹۷۷ء کھلنا
سرفراز ہفت وار	عابدی فیض آبادی	ڈھاکا سنہ ۱۹۵۲ء (شمارہ نمبر ۱۲)
سیپ ماہنامہ		شمارہ نمبر ۴ کراچی
شاہکار —		ڈھاکا
صدائے جرس ماہنامہ	حبیب سحر	سیدپور سنہ ۱۹۸۰ء
صریر ماہنامہ	فہیم اعظمی	کراچی اگست سنہ ۱۹۹۰ء

Dhaka University Institutional Repository

عصمت	ماہنامہ	رازق الخیری	کراچی سالگرہ نمبر جولائی سنہ ۱۹۶۰ء
〃	〃	〃	〃 الماسی جوبلی نمبر اگست سنہ ۱۹۶۸ء
فنون	سہ ماہی	احمد ندیم قاسمی	لاہور جنوری-اپریل سنہ ۱۹۹۱ء
〃	〃	〃	〃 اپریل-جولائی سنہ ۱۹۹۲ء
〃	〃	〃	〃 جنوری-اپریل سنہ ۱۹۹۴ء
〃	〃	〃	〃 طنز و مزاح نمبر
قلم کار	شش ماہی	سرور بارہ بنکوی	ڈھاکا جنوری سنہ ۱۹۶۱ء
قومی زبان	ماہنامہ	جمیل الدین عالی	کراچی جنوری سنہ ۱۹۸۵ء
قلم کار	—	معراج الحق عارفی	سیدپور اگست سنہ ۱۹۸۵ء
قلم کار	شش ماہی	سرور بارہ بنکوی	ڈھاکا جنوری سنہ ۱۹۶۱ء
قوم	ہفت روزہ		کھلنا اپریل سنہ ۱۹۷۰ء - ۱۴ مئی سنہ ۱۹۷۰ء
کہکشاں	—	سعد منیر	چاٹگام سنہ ۱۹۶۶ء شمارہ ۱
ماہ نو	ماہنامہ	ظفر قریشی	کراچی مئی سنہ ۱۹۶۲
ماہ نو	ماہنامہ	کشور ناہید	لاہور اگست سنہ ۱۹۸۶ء
〃	〃	ظفر قریشی	کراچی اشاعت خاص بتقریب انقلاب اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء
〃	〃	〃	〃 اشاعت خاص اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء
〃	〃	〃	〃 فروری سنہ ۱۹۶۳ء
〃	〃	〃	〃 جنوری سنہ ۱۹۷۱ء
〃	〃	〃	〃 فروری سنہ ۱۹۶۳ء
مہر نیم روز	ماہنامہ	سید حسن مثنیٰ ندوی	کراچی اگست سنہ ۱۹۶۰ء
〃	〃	〃	〃 جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

Dhaka University Institutional Repository

مجلس	—	جمال مشرقی	ڈھاکا — خاص نمبر جنوری ۱۹۸۸ء
محاذ	—	ایوب جوہر	ڈھاکا — ۱۹۸۰ء
ماحول	—	اصغر راہی	چاٹگام — ستمبر ۱۹۸۱ء
نقاد	ماہنامہ	ظفر نیازی	کراچی — اکتوبر ۱۹۵۵ء
نقاش	ہفت وار		کلکتہ — ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء
ندیم	ماہنامہ	ارشد کاکوی	ڈھاکا — مارچ ۱۹۶۰ء تا اپریل ۱۹۶۱ء
نقوش	ماہنامہ	محمد طفیل	لاہور — آپ بیتی نمبر جلد دوم
نگار	〃	نیاز فتحپوری	کراچی — دسمبر ۱۹۵۱ء
ہم قلم	〃	ادارہ مصنفین پاکستان رائٹرز گلڈ	کراچی — اکتوبر - نومبر ۱۹۶۳ء
وجود		حلقہ فکر و دانش ڈھاکا	جون ۱۹۸۴ء

لغات و ڈکشنری

بنگلا بشو کوش — ۱۹۷۶ء بنگلا اکاڈمی ڈھاکا

NEW
POPULAR OXFORD
ENGLISH DICTIONARY

PART – 1
ENGLISH TO ENGLISH AND URDU

PART – 2
URDU TO URDU AND ENGLISH

لغات سعید (طبع جدید)

فیروز اللغات اردو

فرہنگ کوچک - فارسی - انگلش حمیم

لغات کشوری - سید تصدق حسین ۱۹۰۷ء

Dhaka University Institutional Repository

BANGLADESH MEIN URDU ADAB (1947-1990 AD)

A THESIS
SUBMITTED FOR THE DEGREE OF
DOCTOR OF PHILOSOPHY (PH.D)
IN URDU
FACULTY OF ARTS, UNIVERSITY OF DHAKA

Dhaka University Library
400590

BY
MRS. KANIZ-E-BUTOOL
ASSOCIATE PROFESSOR, DEPARTMENT OF
URDU AND PERSIAN, UNIVERSITY OF DHAKA,
DHAKA-1000, BANGLADESH.

UNDER THE SUPERVISION OF
DR. MD. ABU BAKER SIDDIQUE (PH.D. ALIGARH)
PROFESSOR, DEPARTMENT OF ARABIC,
UNIVERSITY OF DHAKA, BANGLADESH

AUGUST, 2002 AD.